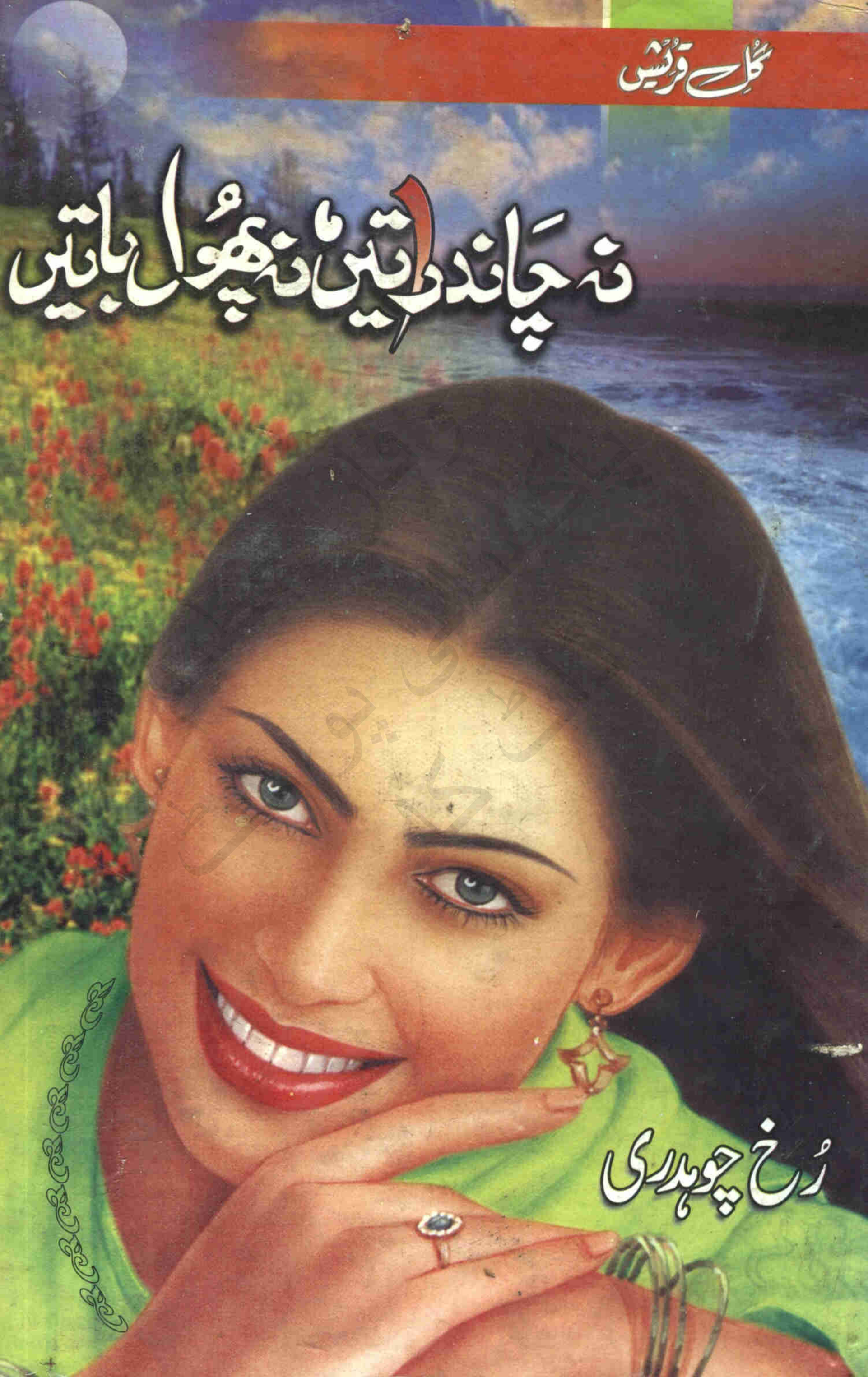
گلِ قریش
نہ چاند راتیں نہ پھول باتیں
رُخ چوہدری

انتساب

اپنے بے حد پیارے والدین کے نام

جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی مدد اور حکم سے ساری اولاد کو دینی اور اخلاقی اقدار کی تعلیم و تربیت دے کر معاشرے میں باعزت مقام دیا۔

کاش آج میری ماں میرے ساتھ ہوتی
میرے سر پہ اس کی دعاؤں کی ردا ہوتی
میری کامیابیوں کی ہر ٹرانی آج
اس کے ہاتھ ہوتی
کاش آج میری ماں میرے
ساتھ ہوتی۔
کاش۔ کاش! اے کاش۔

رُخ چودھری

پیش لفظ

الحمد اللہ رب العالمین کل جہانوں کی بندگی اور تعریف وتوصیف اس ذات واحد کے لیے وقف ہے جو کل جہانوں کا رب ہے خالق و مالک ہے اور بے حد و بے شمار شکر کہ اس کی ذاتِ واحد نے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے مجھ ناچیز کو اتنی عزت دی جس کے میں لائق نہیں قلم کو میری سوچ کے اظہار کا وسیلہ بنا کر میرے اللہ نے مجھے جو عزت دی میں اس کا شکرانہ ادا نہیں کر سکتی۔

اور پھر اسی قلم کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب خواہاں سے صاحب کتاب کر دیا تو اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد میں ان لوگوں کی ممنون ہوں جن کی محبت توجہ اور حوصلہ افزائی نے طلب سے حصول کے اس سفر کو میرے لیے آسان کر دیا میرے اس قلمی سفر میں (ماں جواب میری زندگی کی حسرت بن گئی ہیں) کی دُعائیں اور ابو کی دُعائیں حوصلہ افزائی بہن بھائیوں کی حوصلہ افزائی اور محبت نے ہر قدم پر میری ہمت بندھائی میرے ابو چوہدری نصیر احمد نے کبھی میری کوئی تحریر پڑھی نہیں مگر وہ ہر پرچہ دیکھتے ہیں فہرست میں میرا نام دیکھ کر خوش ہوتے ہیں نہ ہو تو کہتے ہیں وہ "اس میں تمہارا نام کیوں نہیں تیں ہر رسالے میں تمہارا نام ہر ماہ دیکھنا چاہتا ہوں" اور اب میرے ناول کو کتابی صورت دیکھنے کا جتنی بے چینی سے وہ انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ میں خواتین ڈائجسٹ کی ایڈیٹر امتل الصبور کا شکریہ ادا کروں گی جن کی تعریف اور تعمیری تنقید نے میری صلاحیت کو نکھارا۔ پاکیزہ کی ایڈیٹر انجم انصار میری بہترین دوست ہیں میں ان کی بہت ممنون ہوں جن کی محبت اور توجہ نے مجھے واپس بلایا ورنہ امی کے بعد تو لگتا تھا سب کچھ ختم ہو گیا اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی پر میں انجم انصار کا خاص شکریہ ادا کروں گی اس کے علاوہ سیماں باجی (سیماں کمال صوفی) اقبال بانو، غزالہ رشید۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قلمی سفر میں میرا ہاتھ تھاما ہے۔

اب ذرا اس ناول کے بارے میں بات کی جائے تو یہ ناول "نہ چاندراتیں نہ پھول باتیں" کرن ڈائجسٹ میں قسط وار چھپا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے مجھے بہت عزت شہرت بخشی انسانی رویوں کی خوبصورتی جس طرح زندگی کو بہت حسین اور رنگین بنا دیتی ہے اسی طرح رویوں کی بدصورتی زندگی کو بدنما اور عذاب بنا دیتی ہے اس ناول کے کینوس پر آپ کو زندگی کو خوبصورت اور بدصورت بنانے والے انسانی رویوں کے رنگ ملیں گے انسان محبت کے لیے پیدا کیا گیا ہے مگر جب انسان نفرت کا لبادہ اوڑھ لیتا تو زندگی نہ صرف دوسروں کے لیے خود اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے خدا نہ کرے یہ کہانی ہر گھر کی ہو لیکن یہ کہانی ان بدنصیب گھروں کی ہے جہاں ماں بہت پہلے وقت سے بہت پہلے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر خدا کو پیاری ہو جاتی ہے بعد میں بچوں کا کیا حال ہوتا ہے یہ ایسے ہی ایک گھر کی کہانی ہے پڑھیے اور رائے ضرور دیجئے آخر میں بھائی مبین صاحب کی بہت شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے انتہائی عزت اور احترام کے ساتھ یہ ناول مجھ سے لیا اور کتابی صورت میں ڈھال کر میری عزت افزائی کی بہت سی دُعائیں مبین بھائی کے لیے۔

دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

رُخ چودھری

''آپا۔ جلدی سے کوئی فیصلہ کریں میرے گھر میں جوان بیٹی ہے۔ اب میں رضا کی رضامندی کا تمام عمر تو انتظار کرنے سے رہا۔'' شبیر صاحب نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

''اور پھر میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی کہ اوّل تو رضا سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چلو زمانے کو دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا جائے تو آخر کمی کیا ہے میری عفت میں۔ وہ تو میں نے کہہ رکھا ہے کہ اس کی پھپھو اس کو بہو بنانا چاہتی ہیں۔ ورنہ تو کوئی رشتوں کی کمی ہے۔ میری بیٹی شہزادی ہے۔ جس جگہ بیٹھ جائے وہ جگہ بھی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ بس حد ہو چکی آپا' جو جواب بھی دینا ہے جلدی دے دو۔ ورنہ صاف کہہ دو۔'' ذکیہ بیگم ناک بھوں چڑھا کر بولیں۔ اور ان کو ویسے ہی اپنی حسین بیٹی کی یہ انسلٹ محسوس ہو رہی تھی کہ جس کے آگے پیچھے رشتوں کی لائن ہے' اس کی پھپھو پس و پیش کر رہی ہیں۔

''خدا نہ کرے بھابی۔ میرے چاند سی عفت میں کوئی کمی کیوں ہونے لگی مگر رضا بھی ابھی بچہ ہے نا۔ اور زمانہ بھی آپ جانیں کس طرف جا رہا ہے۔ پوچھنا تو۔''

''ناں کہیں وہ لڑکا یونیورسٹی میں ہی تو کسی لڑکی کو پسند نہیں کرنے لگا۔'' شبیر صاحب نے دائیں بھوں چڑھا کر اپنے شک کا اظہار کیا۔

''جی۔ جی نہیں تو ماموں جان ایسی کوئی بات نہیں بس ذرا ضد میں آ گیا ہے کہ۔'' صدیقہ نے فوراً بات کو سنبھالا دیا۔

''نہیں ماموں جان لڑکی کا تو کوئی چکر نہیں بس اسے یہ دھن ہے کہ امریکہ جا کر مستقبل بناؤں گا۔'' ضیاء۔ بھی فوراً بھائی کی طرفداری میں بولے۔

''نا تو یہاں پر مستقبل بنانے پر پابندی عائد ہو گئی جو وہ مستقبل بنانے امریکہ جانا چاہتا ہے۔'' شبیر صاحب کھڑے ہو گئے دو تین قدم آگے بڑھے پھر واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

"آخر اسے امریکہ جانے کی سُوجھی کیا؟" ذکیہ بیگم نے پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میری اکلوتی بیٹی ہے بھائی صاحب اور اللہ تعالیٰ نے بے حساب دے رکھا ہے وہ سب کس کا ہے عفت ہی کا ہے ناں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ گھر کی بیٹی اور گھر کا مال گھر ہی میں رہے مگر صاحب زادے کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" شبیر صاحب نے شجاعت صاحب کی طرف دیکھا جو اس تمام گفتگو میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وہ بیٹے کو بھی جانتے تھے اور گھر والوں کو بھی مگر خود ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بولیں جبکہ غلط رضا بھی نہیں تھا۔

"میں اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہوں' یہ ہی مشورہ دوں گا کہ کوئی کام بھی جلد بازی کی نذر نہ کیا جائے۔ بلکہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے۔" شجاعت احمد عصر کی نماز کے لیے اٹھ گئے۔

"بھائی صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا ابھی بھی جلدی ہے۔ اسی انتظار میں عفت نے بی اے بھی کر لیا ہے اور ابھی بھی جلدی ہے۔ بہر حال آپا مجھے اس ہفتے میں جواب دے دیا جائے تاکہ میں۔"

"آپ قطعی تردّد نہ کریں ماموں جان' انشاء اللہ آپ کو اس ہفتے میں' میں خوشخبری سناؤں گی۔" صدیقہ پختہ ارادے کے ساتھ بولیں۔

"آپ فکر ہی نہ کریں بھابھی' انشاء اللہ میں بہت جلد ہی عفت کو اپنی بہو بنا کر لاؤں گی۔"

صدیقہ اور بشریٰ بیگم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب بہت جلد ہی کوئی فیصلہ کر دیں گی۔ خواہ رضا مانیں یا نہ مانیں۔ شبیر صاحب اور بیگم شبیر صاحب جا چکے تھے۔ رضا یونیورسٹی سے آ کر سیدھے اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔ ان کو پتہ چل گیا تھا کہ آج پھر شبیر ماموں آئے تھے اور جو وہ کہنے آئے تھے وہ ان کے بس میں تھا نہ اختیار میں۔ وہ خاموشی سے لیٹے رہنا چاہتے تھے کہ اتا نے آ کر دروازہ پیٹا۔

"رضا بیٹے کھانا کھاؤ تو گرم کر دوں؟"

"نہیں اتا' بالکل بھوک نہیں۔" وہ یوں ہی لیٹے لیٹے بولے مگر رضا نے سُنا' صدیقہ آپی اتا کو کھانا گرم کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"رضا۔ دروازہ کھولو' یہ میں ہوں۔"

"آیئے آپی۔" رضا نے دروازہ کھول کر ان کو راستہ دیا۔

"رضا۔ اچھا خیر کھانا کھا لو پھر باتیں کریں گے۔" آپی پہلے تو بولنے لگیں پھر خود ہی بولیں کہ بعد میں بات کر لیں گے۔

"آپ کو جو بات کرنی ہے کریں آپی' مجھے واقعی بھوک نہیں' رضا نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔

"رضا دیکھو چاند' آج ماموں جان پھر آئے تھے۔"

"جانتا ہوں آپی۔" رضا کی نگاہیں وسیع آسمان پر اڑتے پرندوں پر تھیں۔

"تو پھر؟" آپی نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی پشت کو دیکھا۔

"آپی۔ کیا ضروری ہے کہ ایک بات کو بار بار دہرا کر بے آبرو کر دیا جائے۔" رضا آپی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"ضد چھوڑو رضا۔ اور دل سے نہیں عقل سے فیصلہ کرو۔ عفت نہ صرف ہماری کزن ہے بلکہ بے حد خوبصورت ہے۔ پھر ماموں جان کا اتنا پھیلا ہوا بزنس ہے' دولت ہے جائیداد ہے جو وہ تمہارے نام کرنا چاہتے ہیں تمہارا مسلسل انکار انہیں مشتعل کر رہا ہے اور پھر یہ کفرانِ نعمت بھی ہے کہ آج کل تو نوجوان ترستے ہیں ایسے موقعوں کو کہ زندگی بنانے کا موقع ملے۔"

"خدا کے لیے آپی' مت کریں اتنی چھوٹی باتیں۔ مجھے نہ عفت سے دلچسپی ہے' نہ ماموں کی بے شمار دولت سے' میں بڑی خوشی سے اس دولت کو اور زندگی بنانے کے لیے اس موقع کو چھوڑتا ہوں۔" آپی کی بات پر رضا کو طیش آ گیا۔

"رضا' مجھے بتاؤ آخر کیا کمی ہے عفت میں۔ اس قدر خوبصورت لڑکی تو نصیب والوں کو ملتی ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ اس میں کوئی کمی ہے۔ آپی صاف بات یہ ہے کہ میں شیریں کو چاہتا ہوں اور اسی سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں۔" رضا نے دوبارہ باہر دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"کیا۔ کیا وہ شیریں' سیاہ رات وہ۔ وہ عفت کا مقابلہ کرے گی۔ کہاں ذرہ کہاں آفتاب' شیریں کا نام سنتے ہی آپی کو جیسے پتنگے لگ گئے۔

"آپا پلیز۔" رضا سے شیریں کی انسلٹ برداشت نہ ہو سکی۔

"رضا۔ رضا میری جان' جذباتی نہیں ہوتے چاند' زندگی کے اتنے بڑے فیصلے جذبات کی رو میں بہہ کر کیے جائیں تو کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے بھائی سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔" صدیقہ جانتی تھیں کہ اب حالات اس موڑ پر ہیں اور بالکل منہ زور گھوڑے کی مانند ہو رہے ہیں کہ ذرا بھی غصہ دکھایا گیا یا چابک دکھائی گئی تو وقت کا گھوڑا ہاتھوں سے نکل جائے گا اور وہ لوگ دھول ہی دیکھتے رہ جائیں گے اس لیے وہ بہت نرم لہجے میں ان کو کرسی پر بٹھا کر خود ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی بولیں۔

"شیریں کی محبت میری رگوں میں لہو کی جگہ دوڑ رہی ہے آپی یہ میرا جلد بازی کا۔ جذباتی فیصلہ نہیں ہے۔ ہم دونوں نے اسکول سے یونیورسٹی تک ساتھ پڑھا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اوّل تو وہ صورت میں بھی کسی سے کم نہیں لیکن اگر آپ لوگوں کی نظر میں وہ بے حد

حسین نہیں تو یہ باتیں میرے لیے اہمیت نہیں رکھتیں۔ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ جذبات کے اندھے سمندر میں ڈوب کر نہیں۔'' رضا اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ صدیقہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''آپی۔ آخری بھی اور قطعی بھی۔'' رضا سخت لہجے میں بولے۔

''پھر بھی سوچ لو رضا' اپنی پسند کا فیصلہ کرنے کا اختیار وقت ایک بار ہی دیتا ہے۔'' صدیقہ بھی پختہ لہجے میں بول رہی تھیں۔

''اسی لیے تو میں نے اپنی پسند کا فیصلہ کرلیا ہے آپی۔'' رضا نے مضبوط لہجے میں کہا تو صدیقہ ان کو تیکھی نگاہوں سے گھورتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

''کیا کہہ رہا ہے؟'' صدیقہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئیں بشریٰ بیگم بے چینی سے بولیں۔

''نہیں امی جان' مجھے تو یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلتا دکھائی نہیں دیتا۔'' وہ تخت پر ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''کیا کرے گا یہ لڑکا آخر۔ شبیر میرا اکلوتا بھائی اور اس کی ایک ہی بیٹی ہے' اکلوتی دولت جائیداد آخر دولت تو ایک طرف مجھے اپنا بھائی سب سے زیادہ عزیز ہے۔''

''امی۔ وہ تو شیریں کے علاوہ کسی اور کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ بھائی جان آپ ہی سمجھائیں اس کو کہ شرافت سے مان جائے ورنہ۔'' صدیقہ نے ضیاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنے والد کی طرح اس معاملے میں زیادہ تر چپ ہی رہتے۔

''دیکھو صدیقہ' میری بات شاید تمہیں اور امی جان کو پسند نہ آئے مگر انصاف یہ ہی ہے کہ رضا کی خوشی پوری کردی جائے کیونکہ آخر زندگی اسی نے گزارنی ہے بلاشبہ عفت میں بھی کوئی کمی نہیں ہے لیکن جب انسان کا دل ہی نہ ملے تو ایک دوسرے کے ساتھ تو زندگی کا اتنا طویل سفر ایک ساتھ کاٹنا دشوار ہوجاتا ہے وہ اگر شیریں کو ہم سفر بنانا چاہتا ہے تو اسے خوشی سے اجازت دے دی جائے۔ عفت میں کسی چیز کی کمی نہیں نہ تو دولت حُسن کی اور نہ مادی دولت کی۔ اسے رشتوں کی کوئی کمی نہیں۔ یہ عمر بھر کی بات ہے کوئی پل دو پل کا کھیل نہیں کہ جیسے تیسے گزار لیا جائے۔''

''آپ نے دیکھا امی۔ تو یہ ارادے ہیں بھائی صاحب کے تو پھر کیوں ان کا دماغ خراب نہ ہو۔'' صدیقہ کو ضیاء کی بات سن کر غصہ آگیا۔

''شاباش بچے بجائے اپنے گھر کی عزت رکھنے کے اپنے خاندان کی بیٹی کی عزت رکھنے کے پرائی لڑکی کی طرف داری کررہے ہو' میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم تینوں باپ بیٹے چاہتے

کیا ہو۔ میری ہیروں سی بھتیجی کے مقابلے میں تم اس گھسیارن کو لا رہے ہو' نہ شکل نہ صورت نہ خاندان۔'' بشریٰ بیگم نخوت بھرے لہجے میں بولتے ہوئے تیزی سے پان چبا رہی تھیں۔

''خدا کے لیے امی جان' مت کریں ایسی باتیں۔ شیریں بے حد اچھے اور شریف خاندان کی بیٹی ہے' کیا ہوا جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' تو یہ کوئی عیب یا جرم نہیں' رہا صورت کا سوال تو صورت بھی کم نہیں' مزید یہ کہ شرافت اور سادگی نے اسے مزید خوبصورت بنا رکھا ہے۔''

''لیجئے امی جان' چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں' بڑے میاں سبحان اللہ یہاں تو دونوں بھائی ہی اس کے دیوانے ہوا چاہتے ہیں۔''

''صدیقہ۔ زبان کو سنبھال کر استعمال کیا کرو۔ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں سمجھیں۔'' صدیقہ کی بات پر ضیاء کو شدید تاؤ آگیا۔

''اچھا تو آپ اور ابا جان اسے سمجھائیں ہم عفت سے ہرگز دستبردار نہیں ہوں گے۔''

''میں رضا کو نہیں سمجھا سکتا اور نہ ہی میں یہ پسند کرتا ہوں کہ دو محبت بھرے دل توڑ دیئے جائیں' ضیاء نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''اچھا تو برائے کرم' اسے غلط قسم کی شہ بھی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں اور امی خود ہی کرلیں گے سب کچھ۔''

صدیقہ کی اس بات پر خصوصاً غلط شہ والی بات پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ بہنوں سے الجھنا یا بلند آواز میں بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اسی لیے خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔

♥♥♥

شجاعت احمد کا تعلق ۔متوسط طبقے۔ سے تھا۔ ان کے والد شفاعت احمد کا اپنا بزنس تھا جو اتنا کامیاب نہیں تھا مگر پھر بھی وہ گھر اور بیوی اور دو بچوں کے ساتھ اچھی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی حمیدہ کی شادی بہت جلد ہی اپنے ایک دور کے رشتے دار کے ہاں کر دی۔ حمیدہ کیا والدین کے گھر سے گئیں۔ والد کا بزنس بالکل ہی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

شجاعت احمد جو ابھی پڑھ رہے تھے گھر کے نامساعد حالات کے باعث ان کو بھی تعلیم چھوڑ کر والد کے ساتھ ملنا پڑا۔ لیکن ستارہ ایسا گردش میں آیا تھا کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بیوی کی بیماری' کاروبار میں مسلسل ناکامی اور بیٹے کی ادھوری تعلیم جس کو وہ پڑھا کر کوئی قابل آدمی بنانا چاہتے تھے۔ انہیں۔ چاروں طرف سے مسلسل ناکامیوں نے بہت مایوس کر دیا تھا وہ سونے کو بھی ہاتھ ڈالتے تو وہ راکھ ہو جاتا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔

ان ہی حالات نے ان کو ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ شجاعت احمد کو چاروں طرف طوفان ہی نظر آتا تھا کنارہ تو کہیں بھی نہیں تھا شاید۔ ان ہی حالات سے تنگ آ کر انہوں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔

''شجاعت بیٹے' تمہارا کہنا بھی درست ہے کہ اب باہر جانا ناگریز ہو گیا ہے مگر بیٹے ایک تو باہر جانے پر اتنے اخراجات اٹھتے ہیں' دوسرے تمہاری ماں بہت بیمار ہے۔ پتا نہیں کیا لکھا ہے قسمت میں۔ شفاعت احمد متفکرانہ انداز میں بیٹے کو دیکھ کر بولے۔

''وہ تو ٹھیک ہے ابا جی مگر آخر کب تک ہم یوں ہی حالات کی چکی میں پستے رہیں۔ قرض خواہ تقاضا کرتے ہیں۔ اماں جان کی دوائیں ہیں۔ گھر کا خرچ' یہ سب کیسے ہو گا؟

''خدا پر بھروسا رکھو بیٹے' میں نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا تو ہے دیکھو وہ کیا جواب دیتا ہے اس پر اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ بڑا کامیاب بزنس مین ہے۔ اس کا شمار ملک کے بڑے

بزنس مینوں میں ہوتا ہے۔ انتظار کر لیتے ہیں اس کے جواب کا۔'' شفاعت صاحب کو ایک موہوم سی امید تھی اپنے دوست ظہیر بیگ سے۔

''بدحالی میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے' وہ تو پھر اتنے بڑے بزنس مین ہیں وہ تو شاید آپ کے خط کا جواب دینا تو درکنار دیکھنا بھی گوارا نہ کریں۔''

شجاعت کا اعتبار اٹھ گیا تھا ہر دوستی پر سے' ہر رشتے پر سے کیونکہ جب ان پر برا وقت آیا تو دوست احباب رشتہ دار سب انجان بن گئے۔

''قسمت آزمانے میں کیا ہرج ہے بیٹے' کیا خبر اللہ تعالیٰ مہربان ہو جائے اور ہمارے حالات بھی سدھر جائیں۔''

اور واقعی جب انسان پر گردش آتی ہے' آزمائش کا وقت ہوتا ہے تو اپنا سایہ بھی غیر ہو جاتا ہے اور یہ گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں۔ اصل میں یہ انسانی صبر کا امتحان ہوتا ہے جب تک انسان ایسے حالات کو برداشت کرتا ہے اور آزمائش بھی اس وقت تک رہتی ہے لیکن جب انسان کا صبر جواب دے جاتا ہے تو آزمائش بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت جب جوش میں آتی ہے تو یہ الجھی ہوئی گتھی سلجھتی چلی جاتی ہے اور شفاعت احمد کی آزمائش کی گھڑیاں بھی شاید ختم ہو گئی تھیں۔ اس لیے تو ظہیر بیگ خط کے جواب میں خود آ گئے تھے' یہ ہی تو وقت تھا حق دوستی ادا کرنے کا۔

''شفاعت۔ میرے دوست' اتنی دیر میں کیوں پکارا' کیا دوستی پہ اعتبار نہیں تھا؟'' ظہیر بیگ نے شکوہ کیا۔

''اعتبار نہ ہوتا تو دوست کو شریکِ غم ہی کیوں کرتا؟''

''بہر حال جو ہوا سو ہوا' تم لوگ تیاری کرو' کراچی چلنے کی انشاء اللہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اور پھر جب قسمت بدلنے پر آئی تو پتا بھی نہ چلا ظہیر بیگ نے شجاعت احمد کے تمام قرضے وغیرہ ادا کر دیئے اور ان کو ساتھ لے کر کراچی آ گئے۔ ان کو ایک گھر لے کر دیا۔ ان کا بزنس سیٹ کیا۔ پیسہ خود لگایا اور مالک شجاعت احمد کو بنایا۔ ایسے دن پھرے کہ شجاعت کی والدہ جو بے حد بیمار تھیں۔ اب آپ ہی آپ تندرست ہوتی چلی گئیں اور اس عنایت پر خدا کے حضور شکرانے ادا کرتی رہتیں شفاعت احمد کا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ دوست نے ایسی دوستی نبھائی تھی کہ خود دوستی کا جذبہ بھی ان پر ناز کرنے لگا تھا۔

''یار ظہیر' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہارے اتنے ڈھیروں احسانات کا کیونکر جواب دے سکوں گا۔'' شفاعت صاحب ممنون لہجے میں بولے۔

''یار میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا مگر تم نے مجھے شرمندہ ہی کرنا شروع کر دیا تو میں چلتا

ہوں''، ظہیر بیگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بھائی صاحب، ناراض کیوں ہوتے ہیں'' یہ تو ایسے ہی آپ کے بہت احسان مند ہیں۔ مجھ سے بھی کہتے رہتے ہیں اور ویسے بھائی صاحب یہ ہے بھی حقیقت کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی ہے اور آپ نے ہمارا ساتھ دیا ہے ورنہ۔''

''بس بھابھی، جب نام اللہ کا آجاتا ہے تو بات وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نظر ہو جاتی ہے تو ہر بگڑی سنور جاتی ہے۔ بس اللہ وسیلہ بنا دیتا ہے کسی نہ کسی کو اور یہ الگ بات کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ لوگوں کا وسیلہ بنا دیا ہے تو اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ مجھے شرمندہ ہی کرتے رہیں۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔'' ظہیر بیگ دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولے تو وہ دونوں میاں بیوی بھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ کیونکہ ان کی کچھ اور کے پیچھے گہری بات تھی۔

''ظہیر...... ہم منتظر ہیں۔ تم کیا کہنا چاہ رہے تھے اور کیا سوچ رکھا ہے تم نے؟''

''سوچنا کیا ہے میں نے، میں تو دوستی کو رشتہ داری میں بدلنا چاہ رہا تھا۔'' ظہیر بیگ اپنی بات کی تمہید باندھتے ہوئے بولے۔

''آپ کا مطلب ہے بھائی صاحب کہ ہم بشریٰ بیٹی کو۔''

''جی بھابھی جو بات آپ لوگوں کو خود کرنی چاہیے تھی مگر مجھے خود ہی چھیڑنی پڑ گئی کہ میں شجاعت کو اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔'' ظہیر بیگ نے بالآخر اپنا عندیہ بیان کر ہی دیا۔

''بھائی صاحب۔'' مارے خوشی کے ذکیہ بیگم سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''یار ظہیر۔ تم۔ تم۔'' شفاعت احمد بے ساختہ ظہیر بیگ کے گلے لگ گئے۔ احساسِ ممنونیت سے وہ مزید بات نہ کر سکے۔

''تو میں سمجھ لوں کہ۔''

''جی۔ جی بھائی صاحب، سو بسم اللہ، حکم کریں تو ابھی اپنی بیٹی لے آؤں، مجھے تو بشریٰ بیٹی بہت پسند تھی مگر ڈرتی تھی۔'' ذکیہ بیگم بے حد خوش تھیں۔

''یار ظہیر، مجھے ناز ہے تم پر اور تمہاری دوستی پر۔''

''اور مجھے بھی تم جیسا دوست بہت عزیز ہے اس لیے تو دوستی کو رشتے داری میں بدلنا چاہتا ہوں۔''

''ظہیر۔ شجاعت آج بھی تمہارا ہے، کل بھی تمہارا۔ میری تو یہ دلی خواہش تھی کہ مگر بات کرنے میں ایک جھجک سی مانع تھی، بہر حال تمہاری عزت افزائی سر آنکھوں پر۔ یہ بتاؤ، ہم کب آئیں بشریٰ بیٹی کو انگوٹھی پہنانے؟''

''یہ سب صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب شجاعت بیٹے سے رائے لے لی

جائے وہ پسند کرے تو درست ورنہ نہیں اور نہ ہی تم میرے احسانات کی فہرست اس کے سامنے رکھ کر اس کی رائے لینا۔ جو اس کے دل کا فیصلہ ہے وہی تمہارا فیصلہ ہوگا۔''

''آپ کمال کرتے ہیں بھائی صاحب، اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' ذکیہ بیگم تو بس جلدی سے بشریٰ کو بہو بنا کر لے آنا چاہتی تھیں۔

''اعتراض ہو بھی سکتا ہے۔ بہر حال اس سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔ اجازت دیں خدا حافظ۔'' ظہیر بیگ اپنی چھڑی پر دباؤ ڈال کر اٹھتے ہوئے بولے۔

شجاعت سے جب اس سلسلے میں رائے لی گئی تو وہ چپ سے ہو گئے۔ کیونکہ بشریٰ بیگم ان کو پسند تھیں۔ مگر ان کی تنک مزاجی سے بھی واقف تھے۔ وہ اور ان کے چھوٹے بھائی شبیر بہت تیز مزاج اور خود سر واقع ہوئے تھے۔ ظہیر بیگ کی چار اولادیں تھیں۔ دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ جبکہ بشریٰ اور شبیر بیگ ابھی باقی تھے۔

شبیر بیگ کی تو بات طے ہو چکی تھی مگر بشریٰ کے لیے ان کو شجاعت ہی پسند آئے تھے اور شجاعت بشریٰ کو پسند ضرور کرتے تھے مگر ان کی تیز، تنک مزاجی سے خائف بھی تھے لیکن اب جبکہ ان کی قسمت نے ان کو اپنی پسند اپنانے کا موقع دے دیا تھا تو وہ انکار کیونکر کرتے۔ انہوں نے ادھر ہاں کی، اُدھر شادیانے بج اٹھے۔ شبیر بیگ اور بشریٰ کی ایک ساتھ شادی ہو گئی۔

یوں تو بشریٰ بیگم ساس اور سسر کا بے حد خیال رکھتی تھیں شوہر کا احترام کرتیں مگر مزاج بھی اس قدر تیز تھا۔ کسی کی بات ماننا تو گویا اپنی توہین سمجھتیں۔ یوں تو ہاں میں ہاں ملا دیتیں مگر کرتیں وہی جو ان کو پسند ہوتا۔ ضد کی اتنی پکی کہ جس بات پر اڑ جاتیں تو شوہر، ساس، سسر تو ایک طرف وہ اپنے والدین کی بات بھی نہ مانتیں۔ اسی لیے شوہر نے تو کسی بھی معاملے میں بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کی اس ہٹ دھرمی سے جلتے کڑھتے ساس سسر اور پھر والدین بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ تو بجائے نرم پڑنے کے وہ مزید تیز ہو گئیں۔ شجاعت صاحب نے بس ایک چُپ اختیار کر رکھی تھی۔ اگر کبھی وہ بولتے تو بیگم فوراً ٹوک دیتیں۔

''آپ تو چپ رہا کریں، آپ کو کیا خبر کہ دنیا کہاں جا رہی ہے۔''

اور وہ اپنی بیگم کو میر کارواں سمجھتے ہوئے چپ ہو جاتے۔ اس لیے بشریٰ بیگم نے بڑے بیٹے کی شادی بھی اپنی پسند سے کی۔ صدیقہ کی بھی اپنی پسند سے کی۔ صدیقہ بھی چونکہ حسن خلق میں اپنی ماں پر ہی گئی تھیں۔ اس لیے سسرال میں ان کا گزارہ مشکل ہو رہا تھا۔ یہ ان کی زبان کی تیزی اور مزاج کی تنکی کا ثمر تھا کہ دوسرے ہی سال شوہر سے طلاق لے کر باپ کے گھر آ گئی تھیں۔ ان کی شادی بشریٰ بیگم نے بہت کم عمر میں کر دی تھی جسے وہ نبھا نہ سکیں اور والدین کے

گھر آ کر حکومت کرنے لگیں۔

ماں کے بعد اس کے گھر میں اب ان کی بات مانی جانے لگی۔ ہر کام ان کی منشاء اور رضا سے ہوتا جس کام میں ان کی رضا شامل نہ ہوتی وہ کام ہرگز نہ ہو پاتا۔ بیوی کے بعد بیٹی کی حکمرانی نے شجاعت احمد کو بالکل ہی بے زبان کر دیا تھا وہ کسی معاملے میں بولتے ہی نہ تھے۔ بڑے بیٹے ضیاء احمد بھی بالکل باپ پر گئے تھے۔ بہت کم گھریلو معاملات میں بولتے وہ تو اس وقت بھی چپ رہتے جب ان کی بہن صدیقہ ان کی بیوی کو اس قدر طنز کرتیں کہ وہ رو پڑتیں تو وہ بس بہن کو دیکھ کر رہ جاتے۔

آج کل تو گھر کے حالات بہت گھمبیر ہو رہے تھے گھر میں دو محاذ گرم تھے۔ ایک پر صدیقہ اور بشریٰ بیگم محاذ آرا تھیں اور دوسرے پر۔ رضا تنہا اپنے حقوق کا دفاع کر رہے تھے۔ انہیں باپ اور بھائی کی دبی دبی۔ حمایت حاصل تھی جو ناکافی تھی۔ رضا ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہو گئے تھے ایک طرف ماں اور بہن کی ضد تھی دوسری طرف ان کی اپنی بچپن کی محبت تھی جو نہ صرف ان کی محبت تھی بلکہ دوست بھی تھی۔ جس سے ان کی ذہنی، قلبی اور روحانی ہم آہنگی تھی جس کے بغیر وہ زندگی کی شاہراہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ اس سے زندگی بھر کی جدائی کا تصور ہی روح فرسا تھا مگر اپنی ماں اور بہن کو بھی منا لینا ان کے لیے پل صراط عبور کرنے سے زیادہ مشکل تھا۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ بھی شل ہونے لگا وہ ماں اور بہن کے رویے سے بدظن ہو چکے تھے کہ ماں اور بہنیں اپنے بیٹے اور بھائی کو ذرا پریشان دیکھیں تو تڑپ جاتی ہیں مگر ان کی ماں اور بہن کیسی تھیں جو چاہتی تھیں کہ۔ وہ تاعمر جلتا رہے اور برہنہ پا پرخار راستوں پر چلتا رہے۔ دن رات کی اس کشمکش نے ان کو نڈھال سا کر دیا تھا۔

''رضا۔ رضا بیٹے، سو گئے کیا؟'' وہ سوچوں میں گھرے سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ بشریٰ بیگم نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''نہیں تو امی حکم کریں۔'' وہ دُکھتی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولے۔

''حکم کیا میرے چاند، زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں کہ والدین بھی اولاد کو حکم نہیں دے سکتے۔ التجا کر سکتے ہیں اور بیٹا میں بھی تم سے التجا کر سکتی ہوں۔'' بشریٰ بیگم نرمی سے بولتی ان کے قریب بیٹھ گئیں تو رضا اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کھڑکی سے جھانکتے سیاہ آسمان پر چمکتے تاروں میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈنے لگے جو ابھر ابھر کر ڈوب رہا تھا۔

''آپ نے درست کہا امی جان، واقعی انسان کی زندگی میں بعض ایسے موڑ آ جاتے ہیں کہ وہ اس قدر بے بس ہو جاتا ہے کہ نہ تو حکم پر سر جھکا سکتا ہے اور نہ التجا ہی پر عمل کر سکتا ہے۔''

رضا ستاروں پر نظریں جمائے گہری سی آواز میں بولے۔ وہ کیا کہہ گئے تھے اور کیا کہنا چاہتے تھے یہ وہ بھی سمجھتے تھے اور بشریٰ بیگم بھی سمجھ گئی تھیں۔ مگر وہ جانتی تھیں یہ ان ہی کی اولاد

ہے۔ جس کو سختی سے نہیں نرمی سے رام کرنا پڑے گا۔

''میں سمجھتی ہوں میرے بچے، مگر میں مجبور ہوں۔ میں سب سمجھتی ہوں مگر میرے چاند عفت کو پیدا ہوتے ہی میں نے مانگ لیا تھا اور جب تم دونوں چھوٹے چھوٹے سے تھے تو میں نے تمہاری عفت کے ساتھ منگنی کر دی تھی تو۔''

''امی جان۔ اول تو میں بچپن کی ایسی فضول اور لغو باتوں کو مانتا ہی نہیں اور دوسرے منگنی ہی ہوئی تھی کوئی نکاح تو نہیں ہوا تھا اور میں تو ناسمجھی میں کیے گئے نکاح کو بھی نہیں مانتا۔''

''رضا۔ ادب لحاظ کی حد کومت پھلانگو۔ میرے فیصلوں پر آج تک تمہارے ابا کچھ نہیں بولے، نہ بدلنے کی کوشش کی تو تم۔'' بشریٰ بیگم کو ایک دم طیش آ گیا۔

''میں مانتا ہوں امی کہ ابا جان بہت صابر۔ اور اعلیٰ ظرف کے انسان ہوں گے مگر میں۔ میں ان کا بیٹا ہو کر بھی ان صفات سے محروم ہوں۔'' رضا سینے پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں بول رہے تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس چمار کی اولاد نے کیا جادو کر دیا ہے کہ اس کے علاوہ تمہاری نظر میں کوئی اور جچتا ہی نہیں۔ میری عفت کے سامنے پانی بھرتی نظر آتی ہے۔''

''امی جان۔ گستاخی معاف لیکن ہمیں زیب نہیں دیتا کہ کسی شریف انسان کو رُسوا کریں۔'' رضا نہ تو شیریں کی توہین برداشت کر سکتے تھے نہ اس کے والدین کی۔ پھر بھی وہ ماں کے سامنے بہت ادب سے بول رہے تھے۔

''ہونہہ۔ شریف۔ یہی شرافت ہے کہ لڑکی پرائے لڑکوں کو پھانستی پھرتی ہے۔''

''امی جان پلیز۔ خدا کے لیے مت کریں ایسی باتیں آپ کی اپنی بیٹیاں بھی ہیں۔'' شیریں کی توہین رضا سے برداشت کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

''خبردار رضا۔ جو میری معصوم بیٹیوں کا نام بھی اس کے ساتھ لیا ہو۔'' بشریٰ بیگم اسے کسی بھاری پتھر کی طرح اپنی جگہ پر جما دیکھ کر بولیں۔ اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

رضا نے غصے سے اپنے بال نوچ لیے۔ پھر باہر لان میں آ گئے۔ ننگے پاؤں نم نم گھاس پر چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پیروں کے راستے ٹھنڈک سلگتے دماغ تک جا رہی تھی اور قدرے سکون مل رہا تھا۔ انہوں نے سیاہ آسمان پر دیکھا۔ ان کا نصیب بھی اوماس کی ان راتوں کی طرح سیاہ لگ رہا تھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسے حالات میں جب محبت کو بھی بچانا اور ماں کی ضد بھی پوری کرنی ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

''خدا پر بھروسا رکھو بیٹے، انسان کے مسائل کبھی بھی نہ تو پریشان ہونے سے حل ہوتے ہیں اور نہ راتوں کو جاگ کر ٹہلنے سے۔'' شجاعت احمد جو اپنے وظائف سے فارغ ہو کر لیٹنے جا رہے تھے۔ پریشان حال بیٹے پر نظر پڑی تو تڑپ کر آ گئے۔

''ابا جان۔ ابا جان'' میں بہت پریشان ہوں۔ میں عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ بتائیں میں کیا کروں؟'' وہ باپ کو پاس پا کر جذباتی ہو گئے۔

''میں سب کچھ جانتا ہوں میرے بیٹے' مگر میں اس معاملے میں تو کیا' ہر معاملے میں تمہاری ہی طرح بے بس ہوں۔ اس گھر میں اب تک وہی ہوا ہے جو تمہاری ماں نے چاہا ہے اور آئندہ بھی وہی ہوگا۔ گو کہ میں عفت کے حق میں بھی ہوں اس لیے کہ تم دونوں کی بچپن ہی میں۔''

''خدا کے لیے ابا جان' آپ تو ایسی بات نہ کریں' ایک فیصلہ اگر آپ لوگوں نے بچپن میں کر لیا تھا' جب ہم ناسمجھ تھے اور اسے اب پورا کرنا چاہتے ہیں اور ایک فیصلہ تو میرے دل نے بھی بچپن سے کر رکھا ہے۔ شیریں شریف اور اچھے گھرانے سے ہے اور پھر ہمارے مذہب نے ہمیں اپنی پسند کا جیون ساتھ منتخب کرنے کی اجازت دی ہے تو۔ والدین کو کیوں اعتراض ہوتا ہے۔'' رضا کا بھی اپنے والد پر ہی بس چلتا تھا' اسی لیے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے جبکہ وہ جانتے تھے کہ ان کو دلائل دے کر قائل کرنے سے کیا ہوگا' ہوگا تو وہی جو اس کی ماں اور بہن چاہتی ہیں۔

''اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا بیٹا۔ چلو اندر ڈھلتی رات کی یہ اوس مناسب نہیں۔ چلو شاباش۔ خدا پر بھروسا رکھو اور مطمئن ہو کر سو جاؤ۔ شجاعت حسین' رضا کو ساتھ لگائے کمرے تک لے آئے تو وہ اپنے بستر پر لیٹے جانے کب تک اختر شماری کرتے کرتے سو گئے۔

ان دنوں تو وہ زیادہ سے زیادہ شیریں سے کترانے کی کوشش میں رہتے۔ مگر ایک کلاس میں پڑھتے ہوئے یہ ممکن ہی کب تھا۔ اس وقت بھی وہ کوئی کلاس لیے بغیر لائبریری جا رہے تھے کہ سامنے سے شیریں آ گئی۔ سانولی سی رنگت' تیکھے نقوش کی یہ پرکشش سی لڑکی جسے سب ہی پسند کرتے۔ رضا کی تو وہ محبت تھی۔ بچپن سے انہوں نے اس کے علاوہ کسی اور کو دیکھا بھی نہیں تھا جواب ان سے چھینی جا رہی تھی۔

''رضا۔ آخر کیا مطلب ہے ان باتوں کا؟'' شیریں دیوار سے ٹیک لگا کر ان کو دیکھ کر بولی۔

''کن باتوں کا؟'' رضا جان بوجھ کر انجان بن گئے۔

''ان ہی باتوں کا کہ دیکھتے ہی راہ بدل لینا یا کترا کر گزر جانا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں کچھ نہیں جانتی آخر کیوں تم مجھ کو اگنور کر رہے ہو؟ لڑکی جسے چاہتی ہے نا رضا' تو اس کی ان کہی باتیں بھی سمجھ لیتی ہے۔ اور۔ اور۔''

''میں بہت پریشان ہوں شیریں۔'' رضا نے آہستگی سے کہا اور ادھر ادھر کے ماحول کا جائزہ لینے لگے کہ کوئی ہماری طرف متوجہ تو نہیں مگر یونیورسٹی میں ہر کوئی اپنی ذات میں انجمن

ہوتا ہے کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش ہی کہاں ہوتا ہے۔

''وہ تو تمہاری آنکھوں سے ہی پتا چل رہا ہے۔ کتنی راتوں سے نہیں سوئے؟'' شیریں نے الجھے بالوں اور پریشان حال رضا کو دیکھا جوان کی اولین چاہت تھے۔

''اندر لائبریری چلو' مجھے باتیں کرنی ہیں تم سے۔'' شیریں' رضا کے پیچھے چلتی لائبریری آ گئی۔

''رضا۔ پلیز کوئی جان لیوا خبر نہ سنانا۔'' کسی انجانے خدشے سے شیریں کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

شیریں۔ اگر مجھے تم سے چھین لیا جائے تو کیا کرو گی؟'' رضا نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تو وہ ان کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''کروں گی تب نا' جب زندہ رہوں گی۔ سنو رضا احمد تمہارے بغیر تو میری کتاب حیات میں زندگی کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ تم کیا کرنے کی بات کر رہے ہو۔'' شیریں بے جان سے لہجے میں بول رہی تھی اور خطرے کی گھنٹیاں جوان کو جانے کہاں سنائی دے رہی تھیں' ان کے کانوں میں بج کر ان کی قوت سماعت کو مفلوج کر رہی تھیں۔ ان کی محبت ظالم لمحوں کی گرفت میں تھی۔ دونوں کی روحوں میں سناٹے گونج رہے تھے۔

اور جب رضا نے ساری بات بتا دی تو شیریں سے وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا تو وہ مردہ قدموں سے لائبریری سے باہر آ گئی۔ یہ منظر دھندلا کیوں گئے تھے۔ لان' کینٹین' اسٹوڈنٹ سب کچھ ہی تو دھندلا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ان کے اندر بیٹھنے کے بعد یونیورسٹی میں دھند کی بارش ہوئی ہے۔ ہاں جبھی تو منظر دھندلا رہے تھے ورنہ اتنی تیز دھوپ تھی۔ ہر طرف ویرانی سی کیوں ہو گئی تھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور پھر سمجھ میں کیونکر آتا گھر میں بھی دھند اور سناٹے تھے۔

''باجی۔ باجی' یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟'' بتائیں پلیز کیا ہوا ہے؟'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی جانے کیسے یونیورسٹی سے گھر پہنچی تو چھوٹی بہن زریں تڑپ کر آگے بڑھی تو شیریں اپنی دوست' اپنی غمگسار بہن سے لپٹ کر مجسم عشق بن گئی۔ اور اس کے آنسوؤں نے زیادہ اور زبان نے کم ساری داستان سنا دی تو زریں جو نہ صرف بہن کے جذبوں سے واقف تھی بلکہ رضا کی دیوانگی کو بھی اچھی طرح جانتی تھی' سن کر تڑپ کر رہ گئی۔

''چھوڑو باجی' آپ کو تو پہلے ہی اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے تھے۔ رضا بھائی کے گھر والے تو اس قدر مغرور ہیں خصوصاً ان کی ماں اور بہنیں ہم لوگ بھلا کہاں ان کے معیار کے ہو سکتے ہیں۔'' زریں اپنی بساط کے مطابق بہن کو تسلی دے رہی تھی۔ مگر شیریں کے دل پر کیا گزر رہی ہے' یہ وہی جانتی تھی اس کی عمر بھر کی ریاضت ضائع ہو گئی تھی۔ ارمانوں کی بستی اُجڑ

گئی تھی۔ زریں ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ اس کو رضا کے گھر والوں کو دیکھتے ہوئے ایسے سانحے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا مگر رضا کی محبت کے علاوہ تو وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکی تھی۔

اب تک تو رضا اکیلے ہی تڑپ رہے تھے لیکن جب شیریں کو بھی شریکِ غم کرلیا تو بوجھ بجائے کم ہونے کے بڑھ گیا تھا۔ شیریں کے پُر بہار چہرے پر اترتی خزاں کا منظر انہیں تڑپا رہا تھا۔ اور گھر کے حالات جوں کے توں تھے۔

بشریٰ بیگم اور صدیقہ ہر حال میں رضا کو رام کرنا چاہتی تھیں۔ اتنا تو رضا کو بھی یقین تھا کہ وہ اپنی محبت کو پانے میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے لیکن طوفان میں گھرا انسان آخری دم تک اس آس پر موجوں سے لڑتا ہے کہ شاید قدرت مہربان ہو جائے اور اس کو کنارہ مل ہی جائے۔

اگلے روز وہ یونیورسٹی گئے مگر شیریں نہیں آئی تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گئے اور کوئی کلاس لیے بغیر اس کے گھر آ گئے۔ اتفاق سے شیریں کے والدین گھر پر نہیں تھے چھوٹی بہن تھی۔

''شیریں۔ یوں گھبرا جایا کرتے ہیں۔ تم تو میری ہمت بھی توڑ رہی ہو' میں نے تو سوچا تھا کہ ہم مل کر کچھ سوچیں گے مگر'' رضا نے شیریں کو دیکھا جو بہت بیمار سی لگ رہی تھیں۔

''ہم کیا کرسکتے ہیں رضا۔ میں جانتی ہوں ایسے معاملات میں ماں اور بہنیں بہت طاقتور ہوتی ہیں اور جو وہ چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور جس لڑکی کی وہ مخالفت کرتی ہیں' وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرسکتیں خواہ ان کا لڑکا اس لڑکی کو کتنا ہی چاہتا ہو اس لیے۔'' بات کرتے کرتے شیریں کی آواز بھیگ گئی تو وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گئی۔

''تو تمہارا کیا مطلب ہے میں ہتھیار ڈال دوں اور اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر اس لڑکی سے شادی کرلوں جس کو میں قطعی اس لحاظ سے پسند نہیں کرتا کہ خودسری ان کا وطیرہ ہے۔ شیریں تم بھول رہی ہوں وہ صرف امی اور آپی کی پسند ہے۔''

''اسی لیے تو کہتی ہوں رضا کہ ماں اور بہنوں کے بہت ارمان ہوتے ہیں اور مائیں تو بیٹے کی پیدائش سے ہی اس کی شادی کے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہیں اور جب ان کے خواب میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا وقت آیا ہے تو۔ تو۔'' شیریں کی آواز کسی گہری کھائی سے آ رہی تھی۔

''شیریں۔ تم یہ سب دل سے کہہ رہی ہو۔ تم بھی یہی چاہتی ہوں۔'' رضا نے شیریں کو شکوہ کرتی نگاہوں سے دیکھا تو شیریں نے دُکھ سے اپنی بھیگی بھیگی پلکوں کو اوپر اٹھایا۔ کیا کیا حسرتیں مچل رہی تھیں' ارمان تڑپ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔

''ہم نے کیا چاہنا ہے رضا' ہم جیسے لوگوں کے ارمان تو حسرتوں کی لحد میں دفن ہو جانے

کے لیے ہوتے ہیں میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ کے گھر والے میرے لیے تو مانیں گے نہیں لہٰذا آپ گھر کا ماحول خراب ہونے سے بچا سکتے ہیں۔'' شیریں ہاتھوں کو آپس میں جکڑتے ہوئے بولی۔ وہ جس ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

''مجھ سے نہیں ہوگا شیریں یہ سب۔ میں' میں منافق نہیں ہوں شیریں' نہ ہی میں منافقت کا قائل ہوں کہ میرے دل میں کسی اور کی چاہت ہو اور جس سے میری ذرا بھی ذہنی ہم آہنگی نہ ہو۔ میں زندگی اس کے نام کردوں نہیں۔ نہیں۔'' رضا اٹھ کھڑے ہوئے' کچھ دیر تک چھت کو گھورتے رہے پھر جیسے کوئی خیال کوندا ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''شیریں۔ شیریں'' دیکھو اگر حق مل نہ رہا ہو تو چھین لینا چاہیے۔ اگر میرا ساتھ دو تو۔ تو۔''

''کیسا ساتھ رضا؟'' شیریں پلو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولی۔

''دیکھو مجھے معلوم ہے گھر والے مانیں گے نہیں تو۔ تو ہم بغاوت کر دیں گے۔''

''رضا۔'' شیریں تیز آواز میں بولتی کھڑی ہو گئی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی رضا کہ تم ایسی بات کرو گے' اپنے والدین کی عزت مجھے اپنی جان' اپنی محبت سے بڑھ کر عزیز ہے۔ میں تمام زندگی تمہارے نام پر تو گزار سکتی ہوں مگر کوئی ایسی حرکت نہیں کرسکتی جس سے میرے والدین کی عزت پر حرف آتا ہوں۔''

شیریں کو پہلے تو بہت غصہ آیا مگر پھر حالات کا خیال کر کے نرمی سے بولی۔ رضا جو اس قدر ڈسٹرب تھے ان کو بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے جذبات میں کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔

''سوری شیریں۔ دیکھو میں کیا کروں۔ میں۔ میں اپنے آپ کو کسی طور پر بھی خود کو عفت کے لیے تیار نہیں کرسکا۔ وہ بدمزاج لڑکی میرے مزاج کے بالکل برعکس ہے۔ ٹھیک ہے میں عفت سے شادی کرنے پر تیار ہوں مگر ایک شرط پر اگر تم مانو اور میرا ساتھ دو تو۔'' رضا تو ایک ایسے بے بس انسان کی طرح تھے جس کے ایک طرف کھائی ہے دوسری طرف کنواں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کیا کریں۔

''کیسی شرط؟'' شیریں نے تڑپ کر اس شخص کو دیکھا جو اس کی اولین محبت تھا اور اس کا اتنا شدید طلب گار مگر حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا تھا۔ ایسے موڑ پر آ گئے تھے کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

''بتاؤ نا' رضا' کیسی شرط ہے؟'' شیریں نے الجھے ہوئے رضا کو دیکھا جو اپنی بات کے لیے شاید الفاظ تلاش کر رہے تھے۔

''شیریں۔ شیریں' میں ان لوگوں کی بات مان لیتا ہوں اور وہ میری بات مان لیں۔ میں' میں یقین دلاتا ہوں۔ میں تم دونوں کو خوش رکھوں گا۔'' رضا نے شیریں کے برف ہاتھ تھام لیے۔ ان کے دل کی کیفیت ہاتھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ شیریں نے بمشکل پلکیں اٹھا کر رضا

کو دیکھا جوان کو پانے کی آرزو میں سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔

مگر وہ دل سے نہیں دماغ سے سوچنے کی عادی تھی اور یہ تو اس کی عزت اور انا کا معاملہ تھا اسے معلوم تھا رضا کے گھر والے اسے وہ عزت ہرگز نہیں دے سکتے جو عفت کو دیں گے تو وہ اس سے بہتر ہے اس راہ ہی کو چھوڑ دے جس پر اس قدر خار ہوں۔

''رضا۔ آپ جذباتی ہو رہے ہیں میں یہ ہرگز پسند نہیں کرتی کہ میں آپ کے گھر والوں پر مسلط کر دی جاؤں اور پھر عورت ہر محبت میں شیرء کر سکتی ہیں رضا مگر شوہر کی محبت میں شیئر نہیں کر سکتی.......... میں اور عفت بھی عورت ہیں اس لیے نہ وہ اس معاملے میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دے سکتی ہے اور نہ میں پارسائی کا دعویٰ کر سکتی ہوں اور تم الجھ کر رہ جاؤ گے۔ نہیں رضا' ایسا ممکن نہیں۔''

شیریں جس دل سے رضا سے دستبردار ہوئی تھی۔ یہ وہی جانتی تھی۔ وہ محبت میں نارسائی کا صدمہ تو سہہ سکتی ہے مگر ان کی محبت میں شیئر برداشت نہیں کر سکتی۔ رضا کچھ دیر اس کو زخمی نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر گہرے سانس لے کر باہر نکل گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے کمرے میں جا کر بند ہو جائیں وہ اپنی تمام تر حسرتوں کی لحد پر ماتم کرنا چاہتے تھے مگر آتے ہی صدیقہ اور بشریٰ بیگم سے سامنا ہو گیا۔

''آج تم نے کلاسز کیوں نہیں لیں؟'' صدیقہ نے چھوٹتے ہی تفتیش شروع کر دی تو رضا نے ان کو دیکھا ان کو معلوم تھا کہ صدیقہ آج کل ان کی ایک ایک بات کی خبر رکھتی تھیں۔ اس سے ان کو شدید کوفت ہوتی تھی۔ جیسے وہ ان کے مجرم ہوں مگر پھر بھی چپ رہتے۔ آج بھی ان کو یقین تھا کہ انہوں نے ان کے دوست زاہد کو فون کر کے ساری بات پوچھ لی ہو گی۔

''جی ہاں۔ وہ میرے ایک دوست کی طبیعت خراب تھی اس کی عیادت کے لیے گیا تھا۔'' رضا نے کتابیں میز پر رکھیں اور کمرے کی طرف بڑھے۔

''کسی دوست کی یا اس گھسیارن کی دل جوئی کے لیے گئے تھے جو لڑکوں کو پھانسنے کا فن خوب جانتی ہے۔''

''آپی۔'' صدیقہ کی گھٹیا سی بات پر جو انہوں نے شیریں کے لیے کہی تھی' سن کر رضا ضبط نہ کر سکے۔

''رضا۔ تم اتنے گستاخ ہو جاؤ گے کہ بڑی بہن کے سامنے اتنی بلند آواز میں بولے۔ اتنی جرأت اتنی بدتمیزی تمہیں اس لڑکی نے سکھائی ہے۔ خبردار جو آئندہ بڑی بہن کے سامنے اتنی بلند آواز میں بولے۔ اور پھر درست ہی تو کہہ رہی ہے نجانے کس قسم کی لڑکی ہے کہ گھر میں آئی نہیں مگر پھر بھی فتور ڈال رکھا ہے؟''

بشریٰ بیگم اور بھی بہت کچھ شیریں کے لیے کہہ رہی تھیں۔ ان کی برداشت جواب دینے

لگی تو وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

''امی۔ اس سے پوچھ لیں شام کو ماموں جان جواب لینے آرہے ہیں۔'' صدیقہ کی آواز پر وہ تیزی سے مڑے۔

''میرا وہی جواب ہے قطعی اور آخری' مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی۔'' بہت ضبط کر لیا مگر پھر بھی آواز بلند ہو ہی گئی۔ وہ دانت پیس کر بولے اور واپس مڑ گئے۔

''یہ لڑکا لگتا ہے میرا اکلوتا بھائی بھی چھین کر رہے گا۔'' شیریں بیگم ماتھے پر ہاتھ رکھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

''خدا نہ کرے امی جان ایسا ہو' اب تک ہم نے اس کی بات مانی ہے۔ ہمارا فرض تھا اس کی رائے لینا۔ اب ہم وہی کریں گے جو ہمارا دل چاہے گا۔''

رضا نے مڑ کر جواب دینا فضول ہی جانا۔ اس لیے بے چین دل کے ساتھ آ کر لیٹ گئے۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ نہ کوئی امید بر آتی تھی۔ ہر طرف مایوسی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں جب ہوا کا رخ بالکل ہی شیریں کے خلاف ہو وہ ان کو یہاں لانا ان کی توہین سمجھتے تھے ان کی ماں اور بہن تو بے قصور شیریں پر ایسے ایسے الزام لگا رہی تھیں ک ان کی برداشت سے باہر تھا۔

خدایا۔ میں کیا کروں؟ اگر حالات میرے حق میں نہیں ہو سکتے تو مجھے ہی ظرف اور صبر عطا فرما دے۔ حالات اور ماں بہن کے رویے نے ان کو بہت حساس بنا دیا تھا وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رو دیئے۔ جذبات اور احساسات کے طوفان میں گھرے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے وہ بغاوت کس بنیاد پر کرتے۔ شیریں ہی نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور درست ہی تو کہہ رہی تھی۔ اس قسم کی شادیوں کو ہمارا معاشرہ کہاں قبول کرتا ہے۔ تھک ہار کر انہوں نے خود کو ان طوفانی موجوں کے حوالے کر دیا۔

''ماموں جان تو لگتا ہے ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم خود نہ آئیں بلکہ خود جا کر وہیں سارے معاملات طے کر لیتے ہیں۔'' صدیقہ اپنی چوٹی پر بل ڈال کر پیچھے کرتی ہوئی بولیں۔

''ہاں سوچ میں بھی یہی رہی ہوں لیکن منزہ نے آنے کو کہا تھا۔ آجائے تو سب مل کر چلیں گے۔''

بشریٰ بیگم نے جائے نماز طے کرتے ہوئے بیٹی کا نام لیا۔ منزہ صدیقہ سے چھوٹی تھیں طبیعتاً اپنی والد پر گئی تھیں انتہائی صلح جو اور نرم مزاجی سی منزہ نے اپنے گھر کو جنت بنا رکھا تھا۔

''وہ کون سا کسی سے کم ہے۔ جب بھی آتی ہے کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ جاتی ہے اور سچ پوچھیں تو رضا کا دماغ اسی نے خراب کیا ہے۔ شیریں سے دوستی کا دعویٰ اس کو بھی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس لڑکی میں ایسا کیا جو دونوں بہن بھائی اس کے دیوانے ہوئے

جاتے ہیں۔ یاد ہے کئی بار کہہ چکی تھی کہ شیریں ہی سے رضا کی شادی کریں گے۔ ہونہہ کہاں زمین کہاں آسمان۔'' صدیقہ نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔

''صدیقہ بیٹی' ابھی تم بچی ہو۔ تمہیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں بیٹا اور پھر بیٹیوں کے معاملات بہت حساس اور گھمبیر ہوتے ہیں۔ اگر تم لوگوں کو کسی سے اختلاف ہے تو بیٹا اس کی کردار کشی کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔'' شجاعت احمد' صدیقہ کی تمام بات دروازے کے باہر سن آئے تھے۔

''ابا جان' آپ نے ہمیشہ مجھے غلط سمجھا' مجھ پر دوسروں کو ترجیح دی۔ ٹھیک ہے میں نہیں بولوں گی کسی معاملے میں۔'' صدیقہ بھرائی آواز میں بولیں اور باہر نکل گئیں۔

''ویسے صدیقہ درست کہہ رہی تھی۔ اس کی کوئی بات آپ کو نہیں بھاتی۔ بدنصیب بوجھ جو بن گئی ہے باپ بھائیوں پر اس لیے سب اس پر باتیں بناتے ہیں۔ وہ بھی اپنے گھر میں ہوتی ۔تو۔تو۔'' صدیقہ' بشریٰ بیگم کی چہیتی بیٹی تھیں ان کی آنکھیں بعد میں نم ہوتیں' ماں پہلے رو دیتیں۔

''بشریٰ بیگم! تم میرے ایسے محسن دوست کی بیٹی ہو جن کے لیے میری جان بھی قربان ہو جاتی تو کم تھا۔ اس لیے میں نے آج تک تمہارے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کیا۔ صدیقہ تمہاری ہی نہیں میری بھی اولاد ہے۔ اس کے اجڑ جانے کا کیا مجھے دُکھ نہیں۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ رضا سے پہلے صدیقہ بیٹی کے بارے میں سوچا جاتا تو زیادہ مناسب تھا اور بشریٰ بیٹیاں باپ کے لیے کبھی بھی بوجھ نہیں ہوا کرتیں مگر بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی شاد آباد رہیں تو تب ہی والدین بھی خوش رہ سکتے ہیں۔'' شجاعت احمد بہت نرم خو اور نرم مزاج واقع ہوئے تھے۔ اس وقت بھی وہ بہت نرمی سے اپنی بات کہہ گئے تو بشریٰ بیگم کچھ دیر کے لیے چپ سی رہ گئیں۔

''کہتے تو آپ ٹھیک ہیں مگر میں پہلے رضا کی عفت کے ساتھ شادی کرلوں تو پھر صدیقہ کے بارے میں سوچوں گی کیونکہ عفت کی وجہ سے شبیر بہت پریشان ہے اور میں تو کبھی بھی اسے پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ ایک تو اس لڑکے نے جان عذاب میں کر رکھی ہے۔ نہ میں بھائی کو چھوڑ سکتی اور نہ۔'' بشریٰ بیگم زندگی میں پہلی بار شوہر سے متفق ہوئیں۔''

''میں رضا سے بات کروں گا۔'' شجاعت اٹھتے ہوئے بولے۔

''بات کرنے کا فائدہ تو تب ہونا جب اس نے کسی کی بات ماننا ہو۔ اس پر تو اس ڈائن نے جانے کیا جادو کر دیا ہے کہ۔''

''بشریٰ بیگم۔ کسی کی بیٹی کو اس طرح نہیں کہنا چاہیے۔ میں نے کہہ جو دیا کہ تم شبیر کو بار کہہ دو۔'' شجاعت احمد کمرے سے نکلتے نکلتے مڑے اور یہ کہہ کر چلے گئے۔

گھر کا ماحول۔ اس قدر مکدر ہو چلا تھا کہ شجاعت احمد کو مداخلت کرنی ہی پڑی تھی ان کی تو اپنی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا فیصلہ کیا جائے یہ وہ عفت اور شیریں میں چناؤ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ عفت بھی بچپن ہی سے رضا کے خواب دیکھتی آ رہی تھی لیکن فیصلہ کسی ایک کے حق میں ہونا ہی تھا اور فیصلہ بھی وہ جس سے گھر کا سکون بحال ہو سکے۔ جواب ختم ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے بہت کچھ سوچ کر رضا سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''جی ابا جان' آپ نے بلایا تھا۔'' رضا پیچھے ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے تو شجاعت احمد نے کتاب ایک طرف رکھ کر بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ ان کو بہت مرجھائے ہوئے کمزور سے لگے۔ ذہنی کشمکش نے چہرے کی ساری شگفتگی ختم کر ڈالی تھی۔ شجاعت احمد آخر باپ تھے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بس ایک گہرا سانس لے کر رہ گئے۔

''یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ بیٹے۔ ضیاء بیٹے دروازہ بند کر کے تم بھی آ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم باپ بیٹوں کی باتیں دوسرے لوگ بھی سنیں۔'' ضیاء اٹھ کر دروازہ بند کر آئے اور رضا بیڈ پر باپ کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

''رضا۔ تم جانتے ہو میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے؟''

''جی کچھ کچھ اندازہ ہے؟'' رضا سر جھکائے آہستگی سے بولے۔

''مجھے یقین ہے بیٹے کہ یہ تمہارا اندازہ نہیں بلکہ تمہیں یقین ہے کہ میں کیا کہنے جا رہا ہوں۔''

''رضا' ابا جان تم سے عفت کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔'' ضیاء نے گویا والد کے لیے بات کرنا آسان کر دیا۔

''رضا بیٹے' آج کل جو گھر کا ماحول ہے' میں اس سے قطعی خوش نہیں ہوں۔ میں ساری حقیقت جانتا ہوں۔ بیٹے تمہیں حق بجانب بھی سمجھتا ہوں مگر۔ مگر انسان جب جذباتی ہوتا ہے تو اسے پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور جو کر رہا ہے اس کے بعد میں نتائج کیا ہوں گے' دیکھو بیٹے' میں بھی بیٹیوں کا باپ ہوں اس لیے میرے لیے تو شیریں اور عفت دونوں ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں شیریں نیک شریف اور اچھی لڑکی ہے اور مجھے اس لیے عزیز ہے کہ وہ تمہیں پسند ہے اسی طرح عفت بھی میری بیٹی ہے اور بچپن سے تمہارے ساتھ منسوب ہے ایسے موڑ پر بیٹے جب محبتوں کی تقسیم کا معاملہ ہو تو انسان کو بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے اور وہ فیصلہ کرنا چاہیے جس سے اسے زیادہ سے زیادہ محبتیں مل سکیں اس لیے بیٹے کہ انسان زر زمین کے بغیر تو زندگی گزار سکتا ہے مگر محبت کے بغیر نہیں میرے بات غور سے سن رہے ہو نا بیٹے۔'' شجاعت نے خاموش سر جھکائے رضا کے شانے پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔ جن کے دماغ میں اس وقت آندھیاں چل رہی تھیں۔

"جی ابا جی۔"

"تو بیٹا۔ محبتوں کے اس سودے میں مات نہ کھا جانا۔ شیریں تمہاری یک طرفہ خوشی ہے جس کو پا کر تم تمام محبتیں کھو بیٹھو گے جس سے شیریں کی توہین ہوگی اور اگر تم الگ ہو جاؤ گے سب کو چھوڑ دو گے تو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تمہیں اپنوں کی یاد ستائے گی۔ اس وقت تمہیں شیریں سے بھی نفرت ہو جائے گی اور تم اسے موردِ الزام ٹھہراؤ گے۔ اس طرح زندگی تلخ ہو جائے گی۔

لیکن یہ فیصلہ تمہارے دل کا یک طرفہ ہوگا اور اگر تم جذبات سے ہٹ کر فیصلہ کرو اور عفت سے شادی پر تیار ہو جاؤ تو۔ تو بیٹے' اتنے پھول کھلیں گے اتنے پھول کھلیں گے محبتوں کے تمہیں تنگیٔ دامن کا شکوہ ہونے لگے گا۔"

"گستاخی معاف ابا جی" آپ نے ناحق اپنا قیمتی وقت برباد کیا۔ اتنی سی بات کے لیے آپ مجھے حکم دے دیتے سرتابی کی مجھے جرأت کہاں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ لوگ اپنی خوشی پوری کر سکتے ہیں۔" رضا جھکڑوں میں گھرے بمشکل بولے۔

اور پھر اس شام وہ اپنی بائیک لے کر سمندر کنارے آ گئے ساحل تقریباً سنسان تھا ہاں ایک دو ران کی طرح...... دور اُفق پر ڈوبتے سورج کا...... نظارہ کر رہے تھے۔ شاید وہ بھی محبت کی بازی ہار کر آئے تھے' ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھے رضا ایک ٹک ڈوبتی کرنوں کو دیکھتے رہے حتیٰ کہ کرنیں شام کے دھندلے سایوں میں کھو گئیں کائنات شام کے گہرے آنچل میں چھپنے لگی مگر رضا کے دل بے قرار کو قرار نہ آ رہا تھا۔ بعض اوقات انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ خود ہی اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر ان کو حسرتوں کی لحد میں خود اپنے ہاتھوں دفن کر دیتا ہے اور رضا بھی تو یہ سب کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

شیریں جوان کی اولین محبت تھی' ان کا ارمان تھا۔ وقت نے ان سے چھین لیا تھا اور ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا جس کے لیے ان کے دل میں نہ تو کوئی نرم گوشہ تھا اور نہ ذہنی ہم آہنگی تھی۔ یہ وقت کا لگایا ہوا زخم تھا جس نے تمام عمر رستے رہنا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ناز اٹھانے تھے۔

رضا کی رضا پاتے ہی گھر میں خوشیوں کے شادیانے بج اٹھے۔ منیزہ چپ سی ہو کر رہ گئی تھیں کیونکہ وہ رضا اور شیریں کی دیوانگی کو جانتی تھیں۔

"شکر ہے امی جان رضا کے سر سے اس چڑیل کا جادو تو اترا۔"

"ہاں بیٹی' خدا کا شکر ہے ورنہ مجھے تو کوئی آثار نہیں لگتے تھے نامراد نے ایسا جکڑا تھا میرے بچے کو کہ کہیں کے قابل نہیں رہا تھا۔"

اور پھر دونوں ماں بیٹیاں منگنی کا پروگرام بنانے لگیں۔ رضا نے سب کچھ گھر والوں پر چھوڑ

کر چپ سادھ لی تھی۔ ان کی خوشی کا کنول نہیں کھل سکا تھا تو وہ ان کو تو خوشی بھرپور انداز میں دے سکتے تھے۔ سو دے رہے تھے۔

"بس ماموں جان' اب بالکل دیر نہیں ہونی چاہیے۔ آپ جلدی سے منگنی کی تاریخ بتا دیں۔" صدیقہ مٹھائی تقسیم کرتے ہوئے خوشی سے کھنکتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"میرے خیال میں صدیقہ بیٹی منگنی کی تاریخ رکھنے کی بجائے شادی کی تاریخ رکھی جائے کیونکہ کافی تاخیر پہلے ہی ہو چکی ہے اور پھر دونوں گھروں کی تیاریاں بھی ہیں کیوں بھائی صاحب؟" شبیر بیگ نے بہنوئی کی طرف دیکھا جو خاموشی سے بیٹھے تھے۔

"جی ہاں۔ بالکل' اب تو شادی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خواتین سے پوچھ کر بسم اللہ کر دی جائے تو زیادہ مناسب ہے۔" شجاعت احمد نے بھی رضامندی کی مہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے خیال میں وہ تعلیم مکمل ہونے سے پہلے مانے گا نہیں۔" صدیقہ پرخیال انداز میں بولیں تو بشریٰ بیگم نے بھی بیٹی کی تائید میں گردن ہلائی۔

"آپ لوگ بسم اللہ کر کے تاریخ رکھیں' وہ مان جائے گا نیک کام میں دیر کیوں؟"

'ہاں' ضرور مان جائے گا صدیقہ' تمہارے ابا کو بڑا ڈھنگ آتا ہے اس سے اپنی بات منوانے کا۔" بشریٰ بیگم نے تعریفی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا جو سوچ رہے تھے ان کو ڈھنگ کیا آنا ہے بیٹے کی سعادت مندی ہے اور حوصلہ ہے۔

اور پھر مبارک سلامت کے شور میں تاریخ مقرر ہونے لگی۔ اسی شور میں صدیقہ اٹھ کر عفت کے کمرے میں آ گئیں۔

"ارے میری چھوٹی بھابھی' دلہن بن کر تو حور لگے گی' چاند کو بھی شرمائے گی۔ ہائیں یہ تمہارا منہ کیوں بنا ہوا ہے عفت' ارے بھئی مبارک دن ہے مرادوں کے بھر آنے کا دن ہے اور تم۔" صدیقہ بیگم کا سارا جوش عفت کے بنے ہوئے منہ کو دیکھ کر اتر گیا۔

"خوش کیا خاک ہوں وہ ناگن میری خوشیوں کو ڈس چکی ہے۔ آپی آپ خود بتائیں کہ میں جس کو بچپن سے چاہتی آئی ہوں۔ اس کے دل میں کسی اور کی محبت ہو۔ مجھ سے تو یہ سب برداشت نہیں ہوگا۔" عفت جانے کب سے بھری بیٹھی تھی۔ آج پھٹ پڑی۔

عفت چندا' میری بہن کمال کرتی ہو تم بھی بھئی۔ تمہارا اس کے ساتھ کیا مقابلہ۔ اس قسم کی لڑکیاں بھولے بھالے امیر گھرانوں کے لڑکوں کو اپنے دام الفت میں الجھا ہی لیتی ہیں مگر یہ جادو زیادہ دیر نہیں رہتا اب دیکھو نا' رضا نے تمہارے لیے خود ہی کہا ہے کہ میں تو عفت سے شادی کروں گا اور ویسے بھی وہ اب اس لڑکی کی اصلیت جان گیا ہے۔ کہنے لگا آپی اب تک میں غلطی پر تھا۔ بھلا وہ لڑکی عفت کا کہاں مقابلہ کر سکتی ہے شادی تو بہرحال مجھے عفت ہی سے کرنی ہے۔ اس لیے اب رضا کے دل اور گھر کی مہارانی تم ہی ہو۔ تم نے ہی اس کے دل

کی سلطنت پر راج کرنا ہے۔ چلو شاباش موڈ درست کرو۔ بدشگونی ہوتی ہے خوشی کے موقع پر آنسو بہانا۔ صدیقہ نے ضرورت سے زیادہ مغالطہ آرائی سے کام لیتے ہوئے عفت کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اور جوانہوں نے پھر سے اس سے ملنے کی کوشش کی تو۔''

''لو اور سنو' بات ہے یہ کوئی کرنے والی۔ بھئی اوّل تو تم ایسا موقع نہ آنے دینا کہ وہ پھر اس سے ملے اور پھر ہم لوگ بھی تو یہیں ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

اور رضا چاہے لاکھ تڑپتے یا شیریں اپنی ٹیسیں دباتی بے حال ہو جاتی' مقدر میں جو لکھا تھا ہو کر رہا۔ رضا نہ صرف شبیر بیگ کے داماد بن گئے۔ بلکہ انکی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے بلا شرکت غیرے مالک بھی جس سے ان کو نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ طلب تھی۔ دلچسپی تو ان کو ان کی بیٹی سے بھی نہیں تھی مگر یہ سب انہوں نے مصلحتاً کیا تھا اور مصلحت اور سمجھوتے میں دل کی رضا اور جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ صرف حالات سے سمجھوتا ہوتا ہے۔

شبیر بیگ نے سارا بزنس ان کے حوالے کر دیا تھا اور خود حج پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ رضا گویا مشین ہی بن کر رہ گئے تھے۔ جذبات و احساسات سے عاری انہوں نے یونیورسٹی بھی چھوڑ دی تھی۔ حالانکہ دوست احباب نے کتنا ہی کہا کہ آخری سال ہے کلیئر کر لو مگر وہ تو یونیورسٹی جانے کی خود میں ہمت نہیں پاتے تھے۔ شیریں سے ان کی ملاقات شادی کے بعد نہیں ہوئی تھی شیریں نے اس جان لیوا صدمے کو جس طرح برداشت کیا تھا' یہ وہی جانتی تھی۔ اس کے کتنے ہی پرپوزل آتے۔ مگر وہ ہر بار انکار کر دیتی۔ اس بار جو رشتہ آیا اتنا اچھا تھا کہ اس کے والدین اور بھائی ہرگز اس کو مس کرنا نہیں چاہتے تھے۔

''شیریں' آخر کب تک تم محبت کا سوگ مناؤں گی۔ آخر تمہیں کہیں نہ کہیں تو شادی کرنا پڑے گی۔ اگر ایسے خیال ہوتا تمہارا تو وہ سب کچھ کر سکتا تھا اور پھر ایک عمر ہوتی ہے جب لڑکیوں کے رشتے آتے ہیں اور۔''

''بھابھی جان یہ آپ لوگوں کی قطعی غلط فہمی ہے کہ میں رضا کی وجہ سے شادی سے منکر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتی آپ پلیز انکار کر دیں اور اگر رشتہ اتنا ہی اچھا ہے تو زریں کا۔''

شیریں اپنے فیصلے پر کچھ اس طرح اڑی کہ پھر وہاں زریں کا رشتہ طے ہو گیا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شیریں اپنے اندر درد کا جہاں بسائے ٹیسوں کو دبائے سب کچھ کر رہی تھی۔ اس کے تو گویا دل نے دھڑکنا ہی چھوڑ دیا تھا اور جب دل ہی مردہ ہو تو یہ عارضی بناوٹی خوشیاں کیا کر سکتی ہیں۔

♥ ♥ ♥

رضا کا خیال تھا کہ ان کے اس فیصلے سے ان کو قلبی و روحانی نہ سہی مگر گھریلو سکون تو میسر ہوگا مگر یہ خیال خام سے بڑھ کر کچھ ثابت نہ ہوا عفت کے ناز گھر بھر اٹھاتا۔ ہر کام اس کے حکم اور مرضی سے ہوتا مگر پھر بھی وہ ناخوش ہی رہتی۔ ہر وقت ناراض اور گریزاں اور رضا کی تو ہر وقت کھوج میں رہتی ہے وہ آفس جاتے تو جب تک نہ آجاتے بار بار فون کر کے یہ معلوم کرتی رہتی کہ آیا وہ آفس میں ہیں اور اگر باہر گئے ہیں تو کہاں گئے ہیں کب تک آجائیں گے وہ کیا کرتی' اس کو شوہر پر اعتبار ہی کم تھا۔

''عفت کیا تماشا ہے یہ سب' میں کوئی تمہارا مجرم ہوں کہ میرے پل پل کی خبر رکھتی ہو تم'' رضا آخر کب تک برداشت کرتے' اس روز پھٹ پڑے۔

''میں بیوی ہوں آپ کی' حق رکھتی ہوں۔'' عفت بھلا برداشت کرنے والوں میں سے کب تھی۔

'بیوی ہو تو بیوی بن کر رہو' حاکم نہیں۔ میں تمہارا ملازم نہیں کر کہ تم میری نگرانی کرتی پھرو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے آئندہ بار بار آفس فون کرنے کی۔'' رضا کو بہت غصہ تھا' اس لیے انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔

''جی ہاں۔ نہیں کروں گی بار بار فون تاکہ آپ آفس کا کہہ کر اس منحوس ماری کے ساتھ عیش کرتے پھریں۔''

''عفت۔'' رضا کی گرج دار آواز پر صدیقہ بھی اندر آگئی۔ رضا سب کچھ برداشت کر سکتے تھے مگر شیریں کی کردار کشی نہیں۔

''کیا بات ہے عفت' تمہاری آنکھوں میں آنسو؟'' صدیقہ نے بڑھ کر عفت کو ساتھ لگا لیا اور آنسو صاف کرنے لگیں۔ عفت نے ساری بات مرچ مصالحے کے ساتھ بتا دی۔

"رضا۔ عفت تو تمہاری بیوی ہے مگر شک تو مجھے بھی ہے کہ۔" صدیقہ نے مشکوک انداز میں رضا کو دیکھا جس کے غصے میں بہن کی بات سن کر شدید اضافہ ہوگیا تھا۔

"آپ اپنی تو بات ہی چھوڑیں آپی' آپ کو شک والا مرض لاحق نہ ہوتا تو اپنے گھر میں آباد نہ ہوتیں۔" رضا یہ بات کہنا تو نہیں چاہتے تھے پھر بھی وہ بہت تلخ انداز میں بولے۔

"سن لیا امی جان۔ اب آپ کے بیٹے مجھے طعنے دینے لگے ہیں' میں بوجھ ہوں ان پر۔ میں اپنے باپ کے گھر پر ہوں' ان کے نہیں جو یہ باتیں بناتے ہیں۔"

"ارے چپ کر جا بیٹی' اس کے اختیار میں کچھ نہیں اِس نامراد نے جانے کون سا جادو کر رکھا ہے' اس پر کہ اثر ہی نہیں رہا۔ اور سن رکھو تم لوگ' میری بیٹی کسی پر بوجھ نہیں ایک تو پہلے سے ہی بدنصیب ہے اور اوپر سے تم لوگ اسے ستاتے رہتے ہوں۔"

بشریٰ بیگم نے صدیقہ کو ساتھ لگا کر آنسو پونچھتے ہوئے رضا کے ساتھ ضیاء کو بھی سنا ڈالا۔ اس قسم کی باتیں اب معمول بن چکی تھیں۔ ذہنی کرب سے بچنے کے لیے رضا نے کام کو بہت پھیلا لیا تھا اور رات گئے تک کام کرتے رہتے وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب رہتے مگر کس سے شکوہ کرتے۔ ماں اور بہنیں بہترین ساتھی ہوتی ہیں مگر ان کی ماں اور بہن سے بات کرنا ہی ہنگامے کو دعوت دینا تھا ان سے چھوٹی بہن سارا بہت چھوٹی تھی۔ وہ تو ضیاء کے بیٹے کے برابر تھی' اب رہ جاتی تھی منزہ تو وہ ان کو دیکھ کر تڑپ تڑپ جاتیں۔

"رضا۔ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے میرے بھائی اسی طرح ہوتا ہے دنیا میں: چاہنے والے کہاں مل پاتے ہیں۔ کچھ پھول تو میرے چاند کھلتے ہی مزاروں کے لیے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے باجی' عفت تو عفت' امی جان اور صدیقہ آپی نے بھی دائرہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ عفت شیریں پر غلط الزام لگاتی ہے مجھ پر شک کرتی ہے اور وہ دونوں اس ساتھ دے کر مجھے ہی خوار کرتی ہیں۔ بتائیں میں کیا کروں۔ میں تو تنگ آگیا ہوں۔" ر بے حد تھکے ہوئے تھے ہارے ہوئے لہجے میں انہوں نے سب کچھ اپنی دوست بہن کو بتا دیا۔

"اللہ ہی ان سب کو ہدایت دے' میری تو کوئی بات سنتی ہی نہیں۔ تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا آج یہیں رہو ذرا ذہن کو آسودگی حاصل ہوگی۔" رضا نہ نہ ہی کرتے رہ گئے مگر منزہ نے گھر فون کر دیا کہ رضا ان کے ہاں ہیں' لہٰذا فکر نہ کریں۔

"دیکھا آپ نے یہ ہے ان کو میری پروا ہے کہ مجھ سے بچ کر بہن کے گھر چلے گئے ہیں' میں بھی جا رہی ہوں اپنے ابو کے گھر میں کوئی گری پڑی نہیں ہوں۔ میں سب جانتی ہوں با کے ہاں رہنے کا بہانہ ہے۔ اس چڑیل کے ساتھ گھومیں گے۔" عفت کو آگ لگ گئی تھی بات سن کر۔

"نہ رو میری بچی' آلینے دے اسے۔"

"تو کیا کرلیں گی آپ ان کا' اب تک تو کچھ کر نہیں سکیں' اب کیا کریں گی۔ فضل چلو گاڑی نکالو۔"

عفت نے ساس کو پیچھے ہٹایا اور ڈرائیور کے ساتھ باہر نکل گئی۔ صدیقہ' شجاعت صاحب' ضیاء احمد' شاہین بھابھی سب ہی اسے روکتے رہے گئے مگر وہ یہ جا وہ جا۔

"ابا جی دیکھ رہے ہیں ناں آپ رضا کی حرکتیں۔ پھر اگر میں بولوں تو سب کو اعتراض ہوتا ہے۔" صدیقہ سیدھی باپ کے کمرے میں آگئیں۔

"تمہیں صرف رضا پر ہی زہر اگلنا آتا ہے' عفت کو بھی سمجھایا کرو۔ اگر وہ اسے اچھا ماحول اور خلوص دیتی تو وہ ہر بات بھول سکتا تھا وہ آخر کہاں تک برداشت کرے۔"

"ہاں صدیقہ' تمہارے بھیا درست کہہ رہے ہیں عفت کو۔"

"آپ لوگوں کی ان ہی باتوں نے تو اس کا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔" صدیقہ نے گھور کر شاہین بھابھی کو دیکھا جو شوہر کی تائید میں بولنے کے جرم میں مرتکب ہوئی تھیں۔ رضا آئے تو ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ بےقصور شیریں کے کردار پر کیچڑ اچھالی گئی جو شادی کے بعد نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اور وہ تڑپ جاتے۔

"رضا۔ یہ تم نے کیا گھر کا ماحول خراب کر رکھا ہے۔ عفت روٹھ کر چلی گئی ہے۔ ماموں ممانی الگ ناراض ہیں۔ امی' صدیقہ......" رضا آئے تو ضیاء ان پر برس پڑے تو رضا نے بےبسی سے ان کو دیکھا۔

"آپ بھی مجھے ہی قصور وار گردانتے ہیں۔ بھائی جان آپ ہی بتائیں میں گھر کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں' کہیں تو جان دے دوں اور تو میرے پاس چارہ نہیں ہے کوئی۔ آپ خود انصاف کریں۔ وہ لڑکی جسے چاہنا میرے لیے جرم اور اس کے لیے عذاب ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد میں قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ مجھے نہیں ملی ہے اور نہ میں ملا۔ مگر پھر بھی ہر روز اسی کے چرچے اسی کو الزام' اسی کی کردار کشی' میری نیت پر شبہ۔ بتائیں میں کس طرح عفت کو یقین دلاؤں کہ میں شیریں سے نہیں ملتا۔" رضا دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیڈ پر گر سے گئے۔

"یہ عورت مہربان ہو تو پیار کا برستا ساون ہے' نامہربان ہو تو۔ کڑکتی دھوپ جو جلا کر راکھ کر دیتی ہے' صبر' حوصلہ رضا' میں اور ابا جی تو تمہیں سرزنش کر سکتے ہیں نا' خدا تعالیٰ عفت کو بھی حوصلہ دے' ظرف عطا فرمائے۔ چلو باہر چلتے ہیں۔"

ضیاء احمد کہنے کو تو سخت بات رضا کو کہہ گئے تھے مگر جانتے تھے کہ وہ بالکل درست ہیں' یہ خواتین ہی پٹری سے اتری ہوئی ہیں مگر وہ ان کو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اور بھائی کو بھی سمجھتے تھے۔ شبیر بیگ نے بیٹی کو سسرال بھیجنے سے انکار کر دیا تھا کہ میری نازوں کی پلی اکلوتی بیٹی پر

دہاں ظلم ہوتا ہے۔ لاکھ بشریٰ بیگم اور شجاعت احمد نے معذرت کی مگر وہ نہ مانے۔

باپ کے گھر ہی میں خدا نے عفت کو بیٹا عطا کیا تو رضا نے جا کر ساس سسر سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگی۔ تب جا کر عفت بیگم واپس آئیں۔ نواسے کا نام نانا نے حیدر رضا رکھا جو سب کو بہت پسند آیا۔ حیدر کو پا کر رضا بے حد خوش تھے وہ اپنے تمام غم اس کی معصوم مسکراہٹ میں بھول جاتے۔

عفت اب بھی ویسے ہی تھی۔ وہی شک و شبہات تھے مگر اب رضا نے اسی رنگ میں جینا سیکھ لیا تھا اور پھر حیدر کی پیاری پیاری باتیں سب کچھ بھلا دیتیں۔ حیدر کے بعد دو جڑواں بیٹیاں ارم اور کرن ہوئیں تو رضا اور سب کا خیال تھا کہ اب چونکہ عفت خود بیٹیوں کی ماں بن گئی ہے لہٰذا اب سدھر جائیں گی۔ مگر ان کا خیال خوش فہمی بن جاتا وہ ہر وقت منہ پھلائے رکھتی۔

رضا کوئی بات کرتے تو ناک بھوں چڑھا کر جواب دیتی۔ بچے شرارت کرتے تو ان کو ڈانٹ دیتی۔

آج کل اس کو ایک اور وہم ستا رہا تھا کہ رضا نے شیریں سے خفیہ شادی کر رکھی ہے۔ اسی لیے وہ اب خوش بھی رہتے ہیں اور دوپہر کا کھانا بھی باہر کھانے لگے ہیں ان کے اس وہم کو صدیقہ نے مزید حقیقت کا رنگ دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو عفت' ارے ان جیسی چلتی پھرتی لڑکیوں کا کیا اعتبار ہوتا ہے۔ تم رضا پر نظر رکھا کرو۔ یہ مرد ایک بار ہاتھ سے نکل جائیں نا تو۔''

''میرے ہاتھ میں وہ آئے کب تھے۔ وہ منحوس عورت تو میرے آنے سے قبل ہی ان کے دل و دماغ پر قبضہ کر چکی تھی۔''

''تم دل چھوٹا نہ کرو' ہم لوگ تو تمہارے ساتھ ہیں اس کی کیا مجال کہ۔''

''اگر ایسا ہو تو قسم کھا کر کہتی ہوں آپی' میں زہر کھا لوں گی۔ ہاں مجھے کیا ملا ہے اس شادی سے۔ دل میں اس گھٹیا عورت کی محبت دماغ میں اس کی سوچیں۔ میں تو گویا گھر کی باندی ہوں۔'' عفت رونے لگی۔ اوپر سے رضا آ گئے تو صدیقہ بیگم ان کو گھورتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

''یہ کیا رونا دھونا مچائے رکھتی ہو' تم اب کس کا سوگ منا رہی ہو؟'' روز کا یہ معمول کہاں تک رضا برداشت کرتے۔

''اپنی اس سوکن کا جو ہر وقت آپ کے خیالوں پر چھائی رہتی ہے۔ اپنے ارمانوں کے قاتل کا منا رہی ہوں۔ سوگ جس نے میری زندگی کو عذاب بنا ڈالا ہے۔ آپ بتائیں میں

آپ کا اور اس چڑیل کا کیا بگاڑا تھا۔ کہ۔'' عفت جاہل عورتوں کی طرح اونچی آواز میں رونے لگی۔

''افسوس صد افسوس کہ۔ تمہاری تعلیم بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اس کی روشنی بھی تمہاری جہالت کے اندھیرے مٹا نہیں سکتی اور تم یوں ہی حسد کی آگ میں جلتی رہو گی۔ اس لیے کہ تم ہی جیسے بدنصیب ہوتے ہیں جو علم کی روشنی سے بھی جہالت کے اندھیروں کو نہیں مٹا سکتے جو لوگ حسد کا کشکول لے کر محبت کی بھیک مانگنے نکلتے ہیں نا عفت بیگم تو محبت تو درکنار ان کو توجہ کا کھوٹا سکہ بھی نہیں نصیب ہوتا اور ڈرو ایام کی گردش سے جب تمہیں اپنے دام میں الجھا کر زمین پر پٹخ دے اور تمہاری ہستی ٹوٹ کر بکھر جائے اور پھر تم اپنے بکھرے ہوئے ذروں کو بھی نہیں سمیٹ سکو گی۔'' رضا ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولے اور تیزی سے باہر نکلتے ہوئے تاریکی میں ڈوبے کمرے جس میں عفت کی سسکیاں گونج رہی تھی' لائٹ آن کرتے گئے' گویا اس روشنی سے عفت کے اندھیروں کو مٹانا چاہتے ہوں۔''

پھر وہ یوں ہی بے مقصد سڑکوں پر ٹہلتے رہے آج ان کے اندر کی طرح باہر کا موسم بھی گھٹا گھٹا سا تھا۔ نیالے بادل کہیں سے ہلکے' کہیں سے گہرے سیاہ' لگتا تھا ابھی چھما چھم برسنا شروع ہو جائیں گے۔

یوں ہی بادل کے ٹکرے کی طرح ایک پیارا سا بچہ ان سے بال لینے آ گیا جو ان کے قدموں میں نہ جانے کب آ گرا تھا وہ چلتے چلتے گھر سے قریبی پارک میں بلا مقصد ہی آ پہنچے تھے۔

''کوئی بات نہیں بیٹا۔ یہ لو اپنا بال''

''عابد۔ عابد بیٹے ادھر آؤ۔'' ایک باوقار سی خاتون شاید اس بچے کو آوازیں دیتی ان کی طرف ہی بڑھ رہی تھی۔

''آپ۔'' خاتون نے حیرت کا اظہار کیا۔

''تم۔؟'' رضا نے بھی پہچان لیا۔ ایک دم ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"زریں۔ یہ تمہارا بیٹا ہے۔؟" رضا نے حیرت سے زریں اور عابد کو دیکھا۔

"جی رضا بھائی، آپ کیسے ہیں؟" رضا کو دیکھ کر ایک ٹیس سی زریں کے دل میں اٹھتی تھی اور یہی حال رضا کا بھی تھا۔ رضا اس سے شیریں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے مگر زبان پر گویا تالے سے پڑ گئے تھے۔

"زندہ ہوں۔" وہ بمشکل آسمان پر گھر گھر آئے بادلوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"اس طرح کی زندہ تو وہ بھی ہیں۔"

"میں مخل ہو سکتا ہوں۔" اس آواز پر دونوں چونک گئے۔

"اوہ۔ سوری ساجد، ان سے ملیے۔ یہ ہیں رضا احمد۔ اور رضا بھائی یہ ساجد ہیں۔" زریں نے اپنے شوہر سے رضا کا تعارف کروایا۔

"اوہ۔ تو یہ ہیں رضا صاحب۔" ساجد نے کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ ہر بات سے واقف ہوں۔

"جی۔ مجھے ہی رضا کہتے ہیں۔" رضا نے گہری سانس لے کر سگریٹ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"رضا صاحب، آپ اکیلے آئے ہیں، ایسے آفت موسم میں، ایسی خوبصورت جگہ پر بچوں کے بغیر۔" ساجد بہت جلد فری ہو جانے والے لوگوں میں سے تھا۔

"اکیلا۔ ہونہہ، میں تنہا تھا۔ میں تنہا ہوں ساجد صاحب۔" رضا نے ایک لمبا کش لے کر دھواں ابر آلود فضا میں پھیلا دیا۔

"آپ بیوی بچوں والے ہو کر بھی تنہا ہیں رضا صاحب اور وہ تنہا ہو کر بھی اپنی ذات کے گنبد میں اپنی رُوح کے سناٹوں کو یادوں کا میلہ لگائے آباد رکھتی ہیں۔" ساجد شیریں کا ذکر کر

رہا تھا اور رضا نے زور سے ہونٹ بھینچ لیے۔ جیسے کسی شدید ٹیس کو دبا رہے ہوں۔

"تو کیا شیریں نے شادی۔؟"

"نہیں رضا بھائی، اس لیے تو میں آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر آپ تک رسائی اتنی آسان ہوتی تو میری معصوم بہن یوں برباد نہ ہوتی۔" زریں کی آواز رندھ گئی وہ ہر وقت ہی شیریں کے لیے تڑپا کرتی تھیں۔

"میں۔ میں سمجھا نہیں زریں۔" وہ سب سمجھ گئے تھے لیکن ساری تفصیل جاننا چاہتے تھے کتنا سکون ملا تھا۔ کتنا قرار آیا تھا تڑپتے دل کو۔ کتنی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا یوں جیسے کسی نے آگ پر پانی ڈال دیا ہو کہ شیریں نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ تو ان کی محبت میں نہیں کی تھی۔ کتنا نشاط آگیں تھا یہ لمحہ جس نے ان کو معتبر کر دیا تھا کہ کوئی تھا جو ان کو صرف ان کو چاہتا ہے اور ان کی خاطر اپنا سب کچھ نثار کر سکتا ہے۔

"رضا صاحب، میں آپ کے لیے اجنبی ضرور ہوں لیکن آپ میرے لیے نہیں۔ مگر جس ہستی کا آپ حوالہ ہیں وہ میری محترم بہن ہے جس کے سلسلے میں ہم بہت پریشان رہتے ہیں۔" ساجد کی آواز نے رضا کو کیف آگیں کیفیت سے باہر نکالتے ہوئے کہا تو وہ ان کو دیکھنے لگے۔

"ساجد درست کہہ رہے ہیں رضا بھائی۔ شیریں باجی شادی کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو رہی ہیں۔ امی اس تمنا کو لیے ہوئے قبر میں اتر گئیں۔ ابو اور بھائی ان کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں مگر وہ مان کے نہیں دیتیں۔ میری چھوٹی بیٹی انہوں نے لے لی ہے۔ کہتی ہیں ساری عمر رضا کی یادوں اور شفق کے سہارے بِتا دوں گی۔"

"تو۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں اس معاملے میں؟" ایک لطیف سا احساس ہوا مگر ساری خوشیاں چند ساعتوں کے لیے تھیں جو وقت نے نگل لی تھیں۔ تو رضا ویران سے ہو گئے۔ رضا جانتے تھے کہ زریں یہ ہی چاہتی ہے کہ وہ شیریں سے مل کر اسے شادی کے لیے مجبور کریں۔ کتنی ظالم تھی زریں۔ ان کے نصیب کی ایک واحد خوشی بھی چھین لینا چاہتی تھی۔ مگر وہ بھی تو مجبور تھی اور خود غرض رضا کو بھی نہیں بننا چاہیے۔

"آپ۔ آپ باجی سے ملیں رضا بھائی۔"

"اس سے ملنا بڑے نصیب کی بات ہے زریں اور میرے نصیب بڑے خراب ہیں۔" ٹوٹے ہوئے گمبھیر لہجے میں ناتمام تمناؤں کی سسکیاں اور مچلتے ارمانوں کی تڑپ عیاں تھی۔

"آپ کو ملنا پڑے گا رضا بھائی، اس لیے کہ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹال سکتیں، وہ صرف جذباتی ہو کر سوچتی ہیں۔ ان کو احساس نہیں کہ آئندہ کے لیے وہ اپنے ہی لئے بُرا کر رہی ہیں۔ والدین کے بعد کون پوچھتا ہے اور ہماری تو بھابیاں بھی بس۔

وہ تو بہت تنگ ہیں مگر بھائیوں کی وجہ سے چُپ ہیں اگر بھائیوں نے بھی کچھ کہہ دیا تو۔ تو وہ تنہا زندگی بسر نہیں کرسکتیں۔'' زریں بھیگے لہجے میں بولتی چلی گئی۔

''کتنی عجیب بات ہے زریں کہ کچھ لوگ کسی کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں اور کسی کے لیے بوجھ۔ ایک ناگوار سا احساس۔ کیوں۔ کیوں تمہاری بھابھیاں شیریں سے تنگ ہیں۔ بھلا خوشبو کسی کا کیا بگاڑتی ہے؟'' رضا کو غصہ آگیا پہلے تو زور سے بولے۔ پھر آہستگی سے گہرا سانس لے کر کہا۔ یہ بات انہیں توڑ گئی تھی کہ شیریں سے کوئی تنگ ہے۔

''رضا بھائی۔ باجی کے ایک سے ایک پروپوزل آئے مگر انہوں نے رتجکیٹ کردیئے۔ وہ مانتیں ہی نہیں' اگر زیادہ زور دیا جائے تو کہتی ہیں کہ میں بوجھ ہوں نا' تم لوگوں کے لیے۔ میں اپنی جان ہی ختم کردوں گی۔ اس بوجھ کو ہمیشہ کے لیے ختم کردوں گی۔''

''شیریں۔ شیریں' میں تم سے بچھڑ کر تمہیں کھو کر تو زندہ رہ سکتا ہوں مگر کوئی تمہاری توہین کرے' تمہیں بوجھ سمجھے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔'' رضا نے ایک ٹھنڈی سانس لی یہ سوچتے ہوئے۔

''میں تیار ہوں شیریں سے ملنے کو۔ میں اسے مناؤں گا۔ بتاؤ کہاں ملوں اس سے؟''

رضا پختہ ارادے کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔

''باجی ایک آفس میں جاب کرتی ہیں۔ آپ بتائیں آپ کو ان کے آفس چھوڑ آؤں گا۔''

اپنی زندگی میں آنے والے اس نئے موڑ پر کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں وقت کے اس ستم پر وہ تڑپ اٹھے تھے کہ جس کے وہ شدید طالب تھے جس کو پانے کی آرزو ان کی زندگی تھی۔ وہ اسے کہیں کہ وہ کسی اور کی ہم سفر بن جائے۔ کتنا کڑا امتحان لے رہا تھا وقت بھی ان سے۔ وہ الجھے ہوئے تھے مسلسل سوچ رہے تھے۔ اتنی مدت کے بعد ملنا تھا۔ کتنی آرزو تھیں شیریں کو دیکھنے کی اور وہ موقع آیا بھی تو کس طرح؟ دوسرا وہ اس بات سے بھی پریشان تھے۔ مبادا گھر والوں کو' عفت کو ذرا بھی پتا چل گیا تو قیامت سی قیامت آجائے گی گھر میں۔ مگر اب تو کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ جس کام میں انسان کے دل کی خواہش شامل ہو اس کے لیے تو وہ سب کچھ کرسکتا تھا۔ دوسرے روز وہ تیار تھے شیریں سے ملنے کے لیے۔

''آج مجھے بچوں کی شاپنگ کرنے جانا ہے۔'' عفت کرن کو اٹھائے منہ بنا کر بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔ ان کی تیکھی نظریں بڑا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں رضا کا۔

''غالباً میں نے کوئی پابندی عائد نہیں کر رکھی شاپنگ پر۔'' رضا نے آئینے میں اپنا سرسری جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''پابندیوں کی میں قائل نہیں۔'' آپ کو ساتھ چلنا ہے۔ حیدر بہت تنگ کرتا ہے۔'' عفت کی بات پر رضا نے تیز سی نگاہ ان پر ڈالی مگر بولے کچھ نہیں۔ اپنا کام کرتے رہے' فائل وغیرہ سیٹ کرتے رہے۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے؟'' رضا کا یہ رویہ کھولا گیا عفت کو۔

''مجھے بہت ضروری کام ہے آج' آپی کے ساتھ چلی جانا اور آج میں دیر سے آؤں گا۔''

رضا بریف کیس لے کر تیز تیز قدم بڑھاتے پورچ تک آگئے' یوں جیسے ذرا بھی وہ رکے یا مڑ کے دیکھا تو پتھر کے ہو جائیں گے یا کوئی ان کو باندھ لے گا اور وہ شیریں سے نہیں مل

پائیں گے۔

''ہونہہ۔ میں سب جانتی ہوں ضروری کاموں کو۔ اور چڑیل' خدا تجھے غارت کرے' تو نے میرا شوہر مجھ سے چھین لیا۔ میرا گھر برباد کر دیا' خدا تمہیں کوئی خوشی نصیب نہ کرے۔'' عفت ہاتھ اٹھا کر اپنی رقیب' اپنی دشمن کو بددُعا دے رہی تھیں۔

''اچھا رضا صاحب' باجی اندر آفس میں ہیں۔ آپ جائیں' میں چلتا ہوں۔'' ساجد' رضا کو آفس کے پاس لا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔

''شیریں کو میرے آنے کی خبر ہے؟'' رضا نے پلٹ کر ساجد کو دیکھا۔

''نہیں۔ اس لیے کہ وہ ہرگز نہ مانتیں۔ اور شاید آج آفس میں نہ آتیں۔''

''اچھا شکریہ۔' ساجد کے جانے سے کتنی دیر تک رضا آفس کے سامنے کھڑے رہے عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

''صاحب' آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' چپڑاسی کی آواز پر رضا چونک گئے۔

''ہاں وہ۔ مس شیریں۔''

''جی ہاں۔ مس صاحبہ اس وقت فارغ ہیں۔'' چپڑاسی نے اندر خبر کر دی اور تھوڑا سا دروازہ کھولتے ہوئے خود پیچھے ہٹ گیا۔ رضا غیر محسوس انداز میں چلے گئے۔

''رضا۔ تم۔'' شیریں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے لہجے میں صدیوں کی تھکن کا بوجھل پن تھا۔

پہنچ کے در پہ تیرے کتنے معتبر ٹھہرے

''ہاں۔ میں۔ پہچان لیا تم نے؟'' رضا' شیریں کے ملیح چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے جس کو لگتا تھا صدیوں بعد دیکھا تھا۔ لیکن نہیں یہ چہرہ تو آنکھوں میں بس کر رہ گیا تھا۔

''جس کا حوالہ میری شناخت بن گیا ہو۔ اسے کیسے نہیں پہچانوں گی میں۔ بیٹھو نا۔ آج میری یاد کیسے آگئی؟'' شیریں کے لہجے میں لہروں کی سی نرمی تھی۔

''کاش تمہیں یاد کرنے کی نوبت بھی آتی۔ حسرت ہی رہی کہ کوئی لمحہ تو تمہاری یاد سے خالی گزرے تاکہ میں بھی یاد کی کیف آگیں کیفیت کو محسوس کر سکوں۔'' رضا ماضی کی طرف پلٹتے ہوئے بولے۔

''اور کیسی گزر رہی ہے زندگی۔؟'' رضا کے لہجے کی تھکن شیریں کو بھی بوجھل کر رہی تھی۔

''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیوں آیا ہوں؟'' رضا ان انمول ساعتوں کو جو بڑے مقدر سے نصیب ہوئی تھیں' ان میں کوئی تلخ بات کرنا نہیں چاہتے تھے مگر اب وہ لوگ اس موڑ پر تھے جہاں دل کی نادان خواہشوں کو کم سنا جاتا ہے۔

''میں سب جانتی ہوں رضا۔ مجھے معلوم تھا وہ لوگ ایسا ہی کریں گے مگر۔ مگر۔''

''یہ زیادتی ہے شیریں۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی ایک انسان کی خاطر اتنے سارے دلوں کو توڑیں' ان کی خواہشات کا خون کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اپنے لیے نہ سہی مگر۔ مگر۔'' رضا سے مزید بولا نہ گیا۔ انہیں یوں محسوس ہوا گویا وہ اپنا دل نکال کر کسی اور کے حوالے کر رہے ہوں۔

''رضا۔ اس معاملے میں میرے گھر والوں نے تمہیں استعمال تو کیا ہے مگر۔ مگر۔ میں اتنی گھٹیا نہیں کہ ایسی منافقت کروں۔ ہو سکے تو میرے گھر والوں کو سمجھا دو۔ مت تنگ کریں مجھے اس گناہ پر مت اکسائیں جو میں کرنا نہیں چاہتی۔ میں کسی پر بوجھ ہوں' نہ بنوں گی۔ میری زندگی کے لیے تمہاری محبت اور یادوں کا اثاثہ اور میری شفق ہی بہت ہے پلیز رضا۔ پلیز کہہ دو ان سے میں شادی نہیں کروں گی۔ کبھی بھی نہیں۔'' وہ یہ سب کہتے ہوئے بے تحاشا رو دی۔

''میں ایسا کب چاہتا ہوں شیریں مگر میں اپنی محبت پر خود غرضی کا الزام بھی نہیں لے سکتا لیکن پھر بھی شیریں جو فیصلہ بھی کرو۔ آئندہ زندگی کو مدنظر رکھ کر کرو۔ اس طویل مسافت کی راہیں بہت کٹھن ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی موڑ پر تھکن تمہیں پچھتانے پر مجبور کر دے۔''

''میں نے آئندہ زندگی کو مدنظر رکھ کر ہی فیصلہ کیا ہے رضا' مجھے معلوم ہے کہ مسافت طویل اور کٹھن ہے مگر مجھے خدا پر ایمان ہے اور اپنے ضبط پر اعتبار۔ کسی موڑ کی تھکن مجھے پچھتاوے پر مجبور نہیں کر سکتی۔'' مضبوط اور پختہ ارادوں والی اس لڑکی کو رضا صرف دیکھ کر رہ گئے۔ اور خود کو مزید معتبر سمجھنے لگے تھے کہ اس نے ان کو چاہا تھا ان کی محبت تھی وہ۔

''اچھا میں چلوں۔ بہت وقت ہوگیا۔ وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔'' رضا گھڑی دیکھتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں بھی چلوں گی۔ شفق کی کچھ شاپنگ کرنی ہے۔'' شیریں بھی ان کے ہمراہ چلتی ہوئی بولی تو رضا کی دھڑکنوں نے چپکے سے ان لمحوں کے امر ہو جانے کی دُعا کر ڈالی۔

''آؤ۔ میں چھوڑ دوں۔''

''نہیں رضا۔ رکشے سے چلی جاؤں گی۔' شیریں نے مصلحتاً انکار کیا۔

''شیریں۔ تم اپنے ساتھ کی ساعتی خوشی بھی مجھے دینے کو تیار نہیں' رضا نے کچھ ایسے، کہا شیریں خاموشی کے ساتھ ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گاڑی کی خاموش فضا میں وہ دونوں بھی خاموش بیٹھے تھے۔ بس یہ سکون ہی رابطہ بنا ہوا تھا۔ ایسے سکوت کی زبان اتنی فصیح اور بلیغ ہوتی ہے کہ ہر لفظ بے معنی سا ہو جاتا ہے۔

''بس رضا۔ یہیں اتار دو۔'' شیریں ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے آہستگی سے بولی۔

''چلو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم کیسی شاپنگ کرتی ہو؟''

پھر رضا بھی شیریں کے ساتھ آگئے۔ شیریں نے شفق کے کپڑے جوتے اس کی دیگر

ضروریات کی چیزیں خریدیں۔

''یہ تحفہ میری طرف سے شفق بیٹی کو دے دینا۔'' نیلی آنکھوں والی اور سنہری بالوں والی گڑیا رضا نے شیریں کی طرف بڑھائی تو ان کی نظریں سامنے آتی آپی اور عفت پر پڑیں۔ ایک سرد سی لہر ان کے وجود کو ٹھنڈا کر گئی۔ عفت تو کسی بم کی طرح شاید اس وقت پھٹ پڑتیں مگر آپی ان کو پکڑ کر باہر لے گئیں۔

وہ گھر میں اٹھنے والے طوفان کو ابھی سے دیکھ رہے تھے۔

''رضا۔ رضا۔'' شیریں نے رضا کا شانہ ہلایا۔

''ہوں۔'' وہ بری طرح چونک گئے۔ وہ طوفانی موجوں سے ابھرتے ہوئے۔

''کیا بات ہے، پریشان سے لگ رہے ہو۔'' شیریں نے بھی ان کے متغیر چہرے کو غو سے دیکھا۔

''ہوں، کچھ نہیں۔ تم سے مل کر میں بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ سب کچھ بھول گیا تھا۔ ج تمہیں چھوڑ دوں۔''

رضا گھر میں لگی آگ کی تپش محسوس کر رہے تھے۔ واپسی پر رضا خود کو اس طوفان سے نمٹنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے مجرم بن گئے تھے۔ سارا ضبط، ساری سچائی، ساری صداقت دھری رہ گئی تھی۔ اس ذرا سی غلطی سے ان کی تمام باتیں، تمام شکوک و شبہات درست ثابت ہو گئے تھے۔ اب تو وہ اپنا دفاع کر سکتے تھے اور نہ شیریں کے پاکیزہ کردار کو اپنی بیوی اور ماں بہن کے نشتروں سے بچا سکتے تھے۔

حسبِ توقع گھر میں ہنگامہ عروج پر تھا گھر کے تمام افراد ان کے بیڈ روم میں جمع تھے۔ شجاعت احمد ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔ باقی سب کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ عفت کا رو رو کر برا حال تھا اوپر سے صدیقہ لقمے دے کر جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔

''دیکھ لیا نا آپ نے، اپنی آنکھوں سے، بیگم صاحبہ کے ساتھ بچوں کی شاپنگ ہو رہی تھی۔'' عفت بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ وہم تو ان کو سدا سے تھا، مگر آج تو یقین آ گیا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھیں۔

''شک تو مجھے بھی تھا کہ رضا نے شیریں سے شادی کر رکھی ہے مگر رضا اتنی صفائی سے جھوٹ بولتا کہ۔''

''مجھے خبر ہوتی کہ وہ ڈائن اب تک میرے بچے کا پیچھا نہیں چھوڑے گی تو۔ تو اسے ملک سے باہر بھیج دیتی۔''

گھر کی خواتین کو یقین تھا کہ رضا شیریں سے خفیہ شادی رچا چکے ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں۔ باہر کھڑے رضا پتھر جیسا دل بنائے سب کچھ سن رہے تھے۔ معصوم شیریں پر کیا ک

الزام نہ لگ رہے تھے مگر غلطی تو خود ان کی اپنی تھی۔ اب اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑے گا۔

''بس اب حد ہو گئی۔ میں یہاں اب ایک پل بھی نہیں رکوں گی۔ رکھیں اپنے بچے میں جا رہی ہوں۔'' عفت نے ارم کو بیڈ پر پٹختے ہوئے کہا تو وہ بری طرح رونے لگی۔

''ہوش کے ناخن لو عفت، محض شک کی بنیاد پر اتنا ہنگامہ بُری بات ہے۔ رضا کو آ جانے دو۔ اصل حقیقت معلوم کرنے دو پھر جو کرنا ہے کر لیں گے۔ ہم کس لیے موجود ہیں۔'' ضیاء نے بری طرح روتی ہوئی ارم کو اٹھاتے ہوئے عفت کو سمجھانا چاہا۔

''آپ تو رہنے دیں بھائی۔ آپ لوگوں کی ان ہی باتوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی ہے۔'' صدیقہ ارم کو ضیاء سے یوں کھینچتی ہوئی بولیں جیسے سارا قصور انہی کا ہو۔

''اب تو فیصلہ ہو کر رہے گا کچھ بھی ہو۔''

''حد سے آگے نہ بڑھو عفت۔'' رضا سے اب برداشت مشکل ہو رہی تھی، وہ اندر آ گئے تو سب نے ان کو یوں دیکھا وہ کوئی بہت بڑا گناہ کر کے آئے ہوں۔

''رضا۔ میرے بیٹے تو نے یہی حرکت کرنی تھی تو پہلے بتاتے۔ کیوں ہم شبیر کے سامنے شرمندہ ہوتے؟'' شجاعت احمد ان کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''ابا جی۔ آپ بھی۔ آپ اور ضیاء بھائی ہی مجھے سمجھتے ہیں۔ اب آپ لوگ ہی شک کرنے لگے تو۔ تو۔''

رضا نے دکھ سے باپ اور بھائی کو دیکھا۔

''رضا۔ یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے؟ ہر وقت چخ چخ۔ یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟ اگر جھوٹ ہے تو وضاحت کیوں نہیں کرتے؟'' ضیاء، رضا پر ہی برس سکتے تھے سو برس رہے تھے۔

''بھائی جان، مجھے اپنا ناکردہ گناہوں کی صفائی پیش کرنے کا موقع تو دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیریں اب تک شادی کرنے پر تیار نہیں۔ اس کی بہن نے مجھ سے کہا کہ میں اسے کہوں۔''

''ہاں۔ تم گویا اس کے بزرگ ہو نا اس کے۔''

''مجھے بات پوری کرنے دیں آپی۔'' رضا نے آپی کو دیکھا جو درمیان میں بول پڑی تھیں۔

''کہ وہ شادی کر لے۔ شیریں نے اپنی بہن کی بیٹی لے رکھی ہے اور اس روز وہی اس کی شاپنگ کر رہی تھی، خدا گواہ ہے کہ یہ ملاقات ہماری شادی کے بعد پہلی ملاقات تھی۔'' رضا کے صادق لہجے پر بھی خواتین کو شبہ تھا۔

''میں کسی دلیل کسی مفروضے کو نہیں مانتی۔ میں نے شاپنگ کرنے کو کہا تھا تو کئی ضروری کام نکل آئے اور اس کو کتنے ارمانوں سے شاپنگ کرائی جا رہی تھی۔ بس میں ایک پل بھی نہیں

رکوں گی۔ میں جا رہی ہوں۔'' بُری طرح روتی عفت اٹھ کھڑی ہوئی۔

''عفت۔ صبر' حوصلہ میری بہن۔ اتنی جلدی بدگمان نہیں ہوا کرتے۔ جلد بازی میں کیے گئے فیصلوں پر انسان ہمیشہ پچھتاتا ہے۔'' ضیاء احمد نے آگے بڑھ کر بے حال ہوتی عفت کے سر پر دوپٹہ درست کیا۔

''ہونہہ۔ جلد بازی' ابھی بھی جلد بازی ہے۔ پانچ چھ سال ہو گئے ہیں مجھے موت کی اس آگ میں جلتے ہوئے میرے ارمانوں کو تو اس ناگن نے پہلے ہی ڈس لیا تھا۔ میں اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رکوں گی۔''

''جاؤ چلی جاؤ۔ لیکن واپسی کے لیے دروازے بند سمجھنا۔''

''رضا'' ضیاء کا ہاتھ بلند ہوا مگر شاہین بھابھی نے بڑھ کر پکڑ لیا

''رضا بھیا۔ آپ کا فون ہے۔'' سارا نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانک کر کہا اور رضا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر آ گئے۔

''ہیلو۔ رضا بول رہا ہوں۔''

''نہیں۔ نہیں۔ شیریں۔ نہیں۔'' رضا پوری قوت سے چیخے تو سب باہر آ گئے۔

''کیا بات ہے رضا؟ کیا ہوا شیریں کو؟'' ضیاء احمد پریشانی سے رضا کی طرف بڑھے جو وحشت ناک ہو رہے تھے۔

''بھائی جان۔ شیریں کا بہت بُرا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ اتنا بُرا کہ۔ کہ وہ۔'' رضا آگے کچھ نہ بول سکے اور تیزی سے باہر چلے گئے۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا ایسی ویسی عورتوں کو۔''

''صدیقہ۔ کبھی تو موقع محل دیکھ کر بات کیا کرو۔'' ضیاء احمد سے اس قسم کی باتیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ انہوں نے ٹوک دیا تو وہ منہ بنا کر کمرے سے چلی گئیں عفت کا تو بُرا حال تھا کہ رضا نے کچھ خیال نہیں کیا اور شیریں کے ایکسیڈنٹ کا سن کر پیچھے دیکھے بغیر نکل گئے رضا بھی گاڑی چلا نہیں رہے تھے' اڑتے ہوئے ہاسپٹل پہنچے تو شیریں کے تمام گھر والے لبوں پر دُعائیں اور آنکھوں میں نمی لیے بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ رضا کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ حوصلے پست ہو گئے۔

''رضا بھائی۔ رضا بھائی۔ میری باجی۔ میری شیریں نہ جانے کس کی نظر لگ گئی میری بہن کو۔'' زریں' رضا کو دیکھتے ہوئے انکی طرف بڑھیں۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔

''موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹرز پُر امید ہیں۔'' ساجد نے آگے بڑھ کر زریں کو سمجھایا سارا دن اور ساری رات گزر گئی تھی موت اور زیست کی کشمکش جاری تھی۔ رضا گھر واپس نہیں گئے وہیں ہاسپٹل کے ٹھنڈے ستون کے

ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ کس ناتے سے آگے بڑھ بڑھ کر ڈاکٹرز سے پوچھتے۔ اپنی بے چینی کو کس نام سے سب کے سامنے عیاں کرتے۔ انہیں بھی احساس نہیں تھا۔ پیچھے ان کے گھر میں کیا ہو رہا ہے ان کی اس دیوانی سی حرکت کا انجام کیا ہوگا۔

رضا کے جانے سے ناراض اور پریشان تو سب ہی تھے مگر عفت تو گویا انگاروں پر لوٹ رہی تھیں وہ حسد کی آگ میں خاک ہو رہی تھیں اور ٹھیک ہی تو تھا ان کا جلنا کہ ان کا شوہر ایک دوسری عورت کے لیے یوں بے قرار ہو کر گھر سے نکلا کہ گھر کی خبر نہ لی کہ بیوی بھی بیمار ہے مگر ان کی بلا سے بیوی مرے یا جیئے۔

ساری رات موت اور حیات کی جو جنگ جاری رہی اس میں جیت زندگی کے نام ہو گئی۔ شیریں کے نیم مردہ لبوں سے زندگی کا پہلا لفظ ٹوٹ کر گرا تو سب کے چہروں پر زندگی مسکرانے لگی۔ رضا نے ٹھنڈے ستون سے پیشانی ٹکا کر ایک طویل گہرا سانس لیا۔ شیریں کے کمرے میں سب ان کے رشتہ دار خون کے رشتے' دوسرے رشتے دار داخل ہو گئے تھے مگر وہ باہر سے لوٹ گئے۔ کیونکہ شیریں سے ان کے رشتے کا کوئی نام نہیں تھا۔ دل میں شیریں کی زندگی کا جشن مناتے رضا نے گھر میں قدم رکھا۔ تو ایک ہنگامے نے استقبال کیا۔ یہ ہنگامہ کوئی بات نہیں تھی۔ عفت بچوں سمیت اپنے میکے جانے کو تیار تھی۔ جبکہ بشریٰ بیگم اور صدیقہ ان کو منا رہی تھیں۔

''نہیں پھوپھی جان اب انتہا ہو گئی۔ میں اب اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی اور نہ ہی کوئی مجھے لینے آئے۔'' عفت اٹل اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

اور عفت چلی گئی۔ رضا نے منانا بھی فضول جانا کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ وہ نہیں رکیں گی اور کچھ وہ نادم بھی تھے۔ کہ ان کو یوں رات باہر نہیں گزارنی چاہیے تھی۔ مگر دل ہی تو ہے دل پر کس کو اختیار ہوا ہے۔

عفت کے جانے کے بعد ان کو گھر بھر سے صلواتیں سننے کو ملی تھیں اور حکم ملا تھا کہ عفت کو منا کر لاؤ اور انہوں نے بھی عفت کو منانے کا فیصلہ کر لیا مگر تقدیر کا فیصلہ ان سے مختلف تھا۔

''تیسرے ہی روز ہاسپٹل میں عفت کی گود میں زندگی اشعر کی صورت میں مسکرانے لگی اور خود ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے زندگی سے محروم ہو گئیں اور لبوں نے آخری بار کلمہ توحید پڑھا اور سدا کے لیے خاموش ہو گئے۔

عفت کی جواں مرگی نے دونوں خاندانوں کو جڑوں سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک قیامت تھی جو گزر گئی تھی۔ سب لوگ رضا ہی کو اس کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے اور وہ اشعر کو سینے سے لگائے شدت سے رو دیئے ان کو عفت کی ناگہانی موت کا شدید دکھ تھا مگر وہ نادم نہیں تھے انہوں نے تو بڑے خلوص اور دل کی سچائی کے ساتھ عفت سے شادی کی تھی اور کبھی دانستہ

عفت کو دکھ نہیں دیا تھا۔ انہوں نے تو شیریں کو ایک خواب سمجھ کر بھلا بھی دیا تھا اور پورے خلوص سے عفت کے ہو گئے تھے مگر عفت کے شک' ہر وقت کے طعنوں نے ان کی زندگی عذاب بنا دی تھی ایک روز بھی تو عفت نے ان کو گھر کا سکون اور سچا' بے لوث شک وشبہ سے پاک خلوص نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے شیریں سے ہر تعلق ختم کر دیا تھا مگر ہمہ وقت ان کو اسی تعلق کے طعنے ملتے جو انجانے میں شیریں سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی سزا ان کو پل پل دی گئی تو آخر وہ بھی تو انسان تھے۔ پتھر تو نہیں تھے۔ عفت بڑے ظرف کا مظاہرہ کرتی' ان کو بے لوث چاہت دیتی' گھریلو سکون مہیا کرتی تو...... تو وہ اپنے دل سے شیریں کی ایک ایک یاد کھرچ سکتے تھے مگر عفت یہ کر ہی نہیں سکی۔ لیکن پھر بھی وہ مجرم تھے' وہ خطا کار تھے۔

''تم تو مجھے مجرم نہ سمجھنا۔ میرے بچو اپنے باپ کو خطا وار نہ سمجھنا بلکہ وقت اور حالات کا مارا ہوا انسان سمجھ کر معاف کر دینا۔ معاف کر دینا میری جان۔ میں تم کو دنیا کی ہر نعمت دے سکتا ہوں مگر روٹھی ہوئی جنت نہیں دلا سکتا۔ کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔''

رضا' اشعر کے ساتھ ارم اور کرن کو بھی ساتھ لگائے رو رہے تھے انہوں نے دھندلی آنکھوں سے حیدر کو دیکھا۔ وہ جانے کہاں چھپا ہوا تھا۔ اسے تو اپنی ماں سے گویا عشق تھا۔ وہ تو اپنی مما سے ایک منٹ بھی جدا نہیں رہ سکتا تھا۔ اب جانے کہاں تھا۔ گھر بھرا ہوا تھا لوگوں سے تعزیت کرنے والوں سے رونے چیخنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر روح کے سناٹے رضا کو بے چین کر رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں بچوں کو لیے چھپے بیٹھے تھے یوں جیسے باہر نکلے تو اس جرم کی سزا میں سپردِ دار کر دیئے جائیں گے۔

''پپا۔'' ارم کرن اور اشعر کو ساتھ لگائے اس آواز پر رضا نے چونک کر دیکھا تو سات سالہ حیدر آنسوؤں سے تر چہرہ لیے سوالیہ نگاہوں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

''حیدر۔ حیدری۔ میرے بچے' میری جان۔''

پہلی بار اس سانحے کے بعد حیدر ان کے پاس آیا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ جانے کتنی دیر باپ بیٹا اپنے دل کا غبار آنسوؤں کی صورت میں نکالتے رہے۔

''بس میری جان۔ پپا تو ہیں نا۔ آپ کے پاس' دیکھو جان یہ جو زندگی ہوتی ہے نا' اللہ تعالیٰ کی امانت ہوتی ہے اور جب اللہ میاں جی چاہتے ہیں واپس بلا لیتے ہیں۔'' رضا' حیدر کا اشکوں سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے اسے موت و زندگی کا فلسفہ سمجھا رہے تھے جس کا شعور ان فلسفوں سے بے نیاز صرف اپنی مما کو چاہتا تھا۔

''پپا۔ یہ شیریں کہاں رہتی ہے؟'' حیدر نے ایک دم اچانک ہی پوچھا تو رضا اسے حیرانی سے دیکھتے رہ گئے۔

''آپ کو کس نے بتایا بیٹا شیریں کے بارے میں؟'' انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''بڑی پھپھو نے بتایا ہے کہ شیریں۔ ہاں شیریں نے میری مما کو مارا ہے میں بھی اب شیریں کو ماروں گا۔ نہیں چھوڑوں گا۔ بس مجھے میری مما چاہیے۔''

''اف میرے خدا۔ عورت انتقام میں اس قدر بھی گر سکتی ہے کہ ایک معصوم ذہن کو بھی آلودہ کر دیا۔ آپی' خدا جانے آپ کی منزل کہاں ہوگی۔'' رضا نے بلکتے ہوئے حیدر کو ساتھ لگاتے ہوئے انتہائی دکھ سے سوچا۔

''حیدر۔ میرے بیٹے بُری بات ہے' ایسے نہیں کہتے۔ شیریں آپ سے بڑی ہیں آپ کو آنٹی کہنا چاہیے اور یہ بہت غلط بات ہے جو آپ کی پھپھو نے بتائی ہے۔''

''نہیں پپا۔ پھپھو غلط نہیں کہہ سکتیں میں نہیں چھوڑوں گا شیریں کو۔'' بچے کا ذہن کورا کاغذ ہوتا ہے اس پر پہلی جو تحریر لکھ دی جائے اس کو مٹانا بہت مشکل ہوتا ہے اور رضا بھی حیدر کے ذہن میں لکھی جانے والی اس تحریر کو مٹانا تو درکنار ہلکا بھی نہ کر سکے۔ عفت کے بے وقت موت نے گویا دونوں گھروں سے زندگی چھین لی تھی۔

عفت شبیر بیگ کی اکلوتی اولاد تھی اور اکلوتی اولاد بھی نہ رہے تو گویا والدین زندہ درگور ہو جاتے ہیں اس سانحے کو جس طرح انہوں نے برداشت کیا تھا یہ وہی جانتے تھے بیٹی کے بچوں کو سینے سے لگاتے تو کچھ قرار آ جاتا۔ اس لیے بچے زیادہ تر ان کے پاس رہتے۔ عفت کے بعد رضا مزید اپ سیٹ ہو گئے تھے گھر کا عجیب سا ماحول ہو گیا تھا صدیقہ تو اٹھتے بیٹھتے ان ہی کو موردِ الزام ٹھہراتیں۔ سہمے ہوئے بچوں کو دیکھ کر الگ دل کڑھتا۔ عفت کچھ بھی تھی مگر ان کے بچوں کی ماں تھی۔ بچوں کو تو کسی محرومی کا احساس نہیں تھا۔ خوش وخرم تھے اور ان کو بھی بچوں کی کبھی اتنی پرواہ نہیں ہوئی تھی مگر اب عفت نہیں تھی تو ان کو ہر ذمہ داری کا احساس ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتے۔ ان کی ذرا ذرا سی ضرورت کا خواہش کا خیال رکھتے۔ فرصت کے سارے لمحات بچوں ہی کے ساتھ گزارتے مگر وہ محسوس کر رہے تھے کہ حیدر اور ارم اپنی بڑی پھپھو کے زیرِ سایہ تھے اس لیے ان دونوں کے انداز بڑے جارحانہ ہوتے۔ خصوصاً حیدر تو بری حد تک بدتمیز ہوتا جا رہا تھا اس کی طبیعت میں بہت چڑچڑا پن آ گیا تھا ہر کھیل میں دھندلی کرتا خوامخواہ بچوں کو پیٹنے لگتا۔

اس روز کرن روتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ اس کے نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' وہ سارے کام چھوڑ کر کرن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''پپا۔ بھیا اور ارم نے مارا ہے۔''

''کیوں۔ کس بات پر بیٹا؟'' رضا اس کے ہونٹ سے خون صاف کرتے ہوئے بولے۔

''انہوں نے پہلے مجھے کہا کہ شیریں بن جاؤ۔ میں بن گئی تو۔'' کرن کی باقی کی بات ہچکی

کی نذر ہوگئی۔ رضا کے ہاتھ وہیں رک گئے تھے غصے سے ان کی طنابیں کھینچ گئیں انہوں نے زور سے ایک تھپڑ حیدر کے رخسار پر جڑ دیا دوسرا لگانے لگے تو صدیقہ نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''آپ ہٹ جائیں۔ آپی آپ نے تو میرے بچوں کا بیڑا اغرق کر دیا ہے زہر بھر رہی ہیں ان کی رگوں میں آخر کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا۔'' رضا صدیقہ سے الجھ پڑے۔

''اوقات میں رہو رضا۔ تم نے اس دو ٹکے کی عورت کے لیے اپنے گھر کو ہمیشہ دوزخ بنائے رکھا بیوی نہ رہی تو اب بچوں کو قربان کرو گے کیا؟''

''آپی پلیز۔ خاموشی سے چلی جائیں۔ میں بہت غصے میں ہوں۔ جانے آپ کس قسم کی عورت ہیں اور کس بات کا انتقام لے رہی ہیں مجھ سے اور شیریں سے۔'' رضا نے پھٹتے ہوئے سر کو تھامتے ہوئے بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ یہ ہی صلہ دو گے کہ تمہاری اولاد کو جو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔'' اور یہ تھی بھی حقیقت کہ انہوں نے رضا کے بچوں کو پھول کی مانند رکھا ہوا تھا ان کی ہر بات' ہر ضد پوری کر دی جاتی اور اس بے جا پیار اور توجہ نے بچوں کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا خصوصاً حیدر اور ارم اپنی بڑی پھپھو کے زیر اثر تھے اور ان کی ہی بات کو مانتے اور رضا اسی بات سے خوفزدہ تھے کہ صدیقہ انکے بچوں کو بغاوت کی طرف مائل کر رہی تھیں ان کے معصوم ذہنوں کو آلودہ کر رہی تھیں۔ رضا زندگی کے اس جال میں الجھ کر رہ گئے تھے کس سے بات کریں کون تھا جو ان کا مسیحا بنتا۔ بالآخر انہوں نے اپنا دل ماں کے سامنے کھول دیا۔ جو اب بہت بدل گئی تھیں۔

''امی جان۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ آپی اٹھتے بیٹھتے مجھے کوستی ہیں۔ بچوں کو میرے خلاف کرتی ہیں۔ اور شیریں کے متعلق غلط باتیں بچوں کو بتاتی ہیں آپ خود بتائیں' کیا یہ انصاف ہے کہ معصوم ذہنوں کو گندہ کیا جائے۔ وہ بچوں کو سنبھالنے کا طعنہ دیتی ہیں تو مت سنبھالا کریں میرے بچوں کو۔ میں خود سنبھال لوں گا۔ میرے بچے' میری ذمہ داری ہیں کسی اور کی نہیں۔'' رضا بہت دکھی ہو رہے تھے۔

''میں سب دیکھ رہی ہوں بیٹا۔'' سب جانتی ہوں صدیقہ کی تو زبان ہی ایسی ہے ورنہ و تو بچوں کے پیچھے مرتی ہے رہا بچوں کو سنبھالنے کا خیال' تو بیٹا اب تمہیں کچھ سوچنا پڑے گا کون پرائے بچے سنبھالتا ہے یہ تو خیر نہیں ہیں مگر کب تک ہیں شادی ہو جائے گی تو۔ تو بعد میں ان ک سنبھالے گا کون؟ میں تو چراغ سحر ہوں آج ہوں کل شاید۔ اس لیے بیٹا میں نے ایک د لڑکیاں دیکھی ہیں بہت اچھی ہیں اور۔''

''پلیز امی جان۔'' اب نام نہ لیں آپ شادی کا۔ پہلے کون سی خوشیاں ملی ہیں مجھے شادی کر کے۔ نہیں اب میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ رضا نے قطعی طور پر انکار کر کے بشریٰ بیگم کو مایوس کر دیا تو وہ ایک گہرا سا سانس لے کر رہ گئیں۔

اشعراب ڈیڑھ سال کا ہو گیا تھا بشریٰ بیگم وقفے وقفے سے ان کو شادی کے لیے تیار کرتی رہتیں اور کچھ بچوں کو دیکھتے ہوئے وہ بھی نرم پڑ گئے اور انہوں نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا مگر اس سوچ کی آخری سرحد جہاں ختم ہوتی تو وہاں شیریں کھڑی تھی۔

شیریں کے خیال سے یکبارگی ایک عرصے کے بعد دل کے نگر سے خوشگوار دھڑکنوں کا گزر ہوا تو وہ کچھ پرسکون سے ہو گئے مگر ان کو معلوم تھا کہ شیریں کا نام لینے کے بعد بھی وہی کچھ ہوگا جو اس سے قبل ہوا تھا اور اب تو ان کے بچے بھی۔

اس لیے وہ چاہتے تھے کہ شیریں ہی آئے تاکہ وہ اپنے خلوص اور محبت سے بچوں کے دل جیت لے ان کو صدیقہ سے خطرہ تھا مگر اب ان کو کسی کی پرواہ نہیں تھی اگر شیریں مان گئی تو وہ کسی کی پرواہ نہیں کریں گے اس سلسلے میں انہوں نے پہلے شیریں سے ہی بات کرنا مناسب جانا۔ جس نے صرف انکی خاطر شادی نہیں کی تھی شیریں کے ایکسیڈنٹ اور عفت کی وفات کے بعد رضا' شیریں سے نہیں ملے تھے۔ رضا نے کچھ جھجکتے ہوئے شیریں کے ذاتی فلیٹ کی بیل پر انگلی رکھ دی تو حیدر کی عمر کی پیاری سی بچی نے دروازہ کھولا اور اب حیرانی سے آنے والے کو دیکھ رہی تھی۔

''بیٹا۔ وہ آپ کی۔''

''خالہ جانی۔ نماز پڑھ رہی ہیں۔ آپ آجائیں انکل؟'' بچی سمجھ گئی کہ یہ اس کی خالہ جانی ہی کا پوچھ رہے ہیں وہ نفاست سے سجے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ اور بچی بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی گویا آداب میزبانی نبھا رہی ہو۔

''شفق بیٹا۔ ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔''

''آپ کو میرے نام کا کیسے پتا ہے انکل؟'' وہ حیرانی سے انہیں دیکھتی ہوئی پاس آگئی۔

''بھئی ہمیں صرف نام ہی نہیں معلوم بلکہ یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری بیٹی کس کلاس میں پڑھتی ہے۔'' اور پھر رضا نے حیدر کے حساب سے بتایا تو شفق انکل سے متاثر ہو گئی۔

''رضا تم۔؟'' شیریں سفید آنچل سنبھالتی آگئی۔

''ہاں میں' اس لیے کہ میرے تمام راستے اس طرف آتے ہیں۔ کیسی ہو؟'' رضا دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولے

''میں تو ٹھیک ہوں مگر تم بہت تھکے سے لگ رہے ہو۔'' شیریں نے رضا کو دیکھا جن کے چہرے پر صدیوں کی تھکن کی دھول تھی۔ رضا نے گہرا سانس لے کر صوفے سے ٹیک لگالی اور سگریٹ کا گہرا سا کش لے کر راکھ ایش ٹرے میں ڈال دی۔

''صرف تھکا ہوا ہی نہیں۔ شیریں میں بہت تھک گیا ہوں' ٹوٹ گیا ہوں۔ بکھر رہا ہوں اسی لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں میں کل بھی تمہارا طلب گار تھا اور آج بھی شیریں۔ اس سے

قبل کہ میری ہستی کا شیرازہ بکھر جائے۔ مجھے سمیٹ لینا ورنہ۔ ورنہ۔'' رضا نے سر ہاتھوں میں تھام لیا ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں یہ بھی ایک طرف سے ان کی خود غرضی تھی کہ وہ شیریں کو چار بچوں کی ذمہ داری سونپنا چاہتے تھے شیریں نے دکھ سے اس شخص کو دیکھا جس کی خاطر انہوں نے عمر بھر کا جوگ لیا تھا آج وہ کتنا مضطرب اور بکھرا ہوا لگ رہا تھا اور وہ سمجھ بھی رہی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں مگر اب تو کوئی فیصلہ کرنا خواہ رضا ہی کے حق میں کیوں نہیں بہت مشکل لگ رہا تھا۔

''شیریں۔ میں بہت تھک گیا ہوں پلیز۔''

''رضا۔ زندگی کے اس موڑ پر اس عمر میں۔ میں۔''

''ہاں۔ ہاں کہہ دو کہ تمہیں میرا ساتھ قبول نہیں۔ چلو ایک چرکا اور سہی۔ ایک میں ہی تو ملا ہوں وقت کو کھیلنے کے لیے کھلونا۔ شیریں میں نے اس زندگی کا کیا بگاڑا ہے کہ مجھے اتنی تڑپتی سلگتی زندگی ملی ہے۔ کیا میں اس قابل نہیں کہ میری زندگی کی کوئی خواہش تو پوری ہو جائے۔ ایک تمہاری ذات ہی تو ہے جس سے ہمیشہ مجھے سکون ملا ہے بے لوث محبت کی ٹھنڈک کا احساس ہوا ہے وقت نے کبھی بھی مجھے فیصلے کا اختیار نہیں دیا۔ اور اگر اس بار دیا ہے تو۔ تو تم۔'' رضا جذبات میں ذرا بلند آواز میں بول گئے تھے۔ احساس ہوا تو کھڑکی کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ شیریں دونوں ہاتھ گود میں رکھے فیصلے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ رضا ان کی چاہت تھے۔ وہ انکو دکھی بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اور کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

''تمہارے بچے مجھے قبول کر لیں گے رضا؟'' رضا چونک کر مڑے پھر شیریں کی طرف آ گئے۔

''تم۔ تم شیریں ان کو قبول کر لو۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ توجہ اور محبت سے اپنائے جا سکتے ہیں اور مجھے امید ہے۔ کہ تم بہت جلد بچوں کو اپنا بنا لو گی۔''

''مجھے سوچنے کا موقع تو دو رضا۔'' شیریں کے سامنے بہت سے معاملے تھے جن کے بارے میں سوچنا تھا۔

''شیریں۔ تم میرے بارے میں سوچو گی۔ میرے بارے میں؟'' رضا نے بے یقینی اور حیرانی سے شیریں کو دیکھا۔

''تمہارے بارے میں کیا سوچنا رضا؟ تمہارے بعد تو سوچنے کی راہیں ہی مسدود ہو جاتی ہیں۔ میں۔ میں رضا۔ شفق کے بغیر نہیں جی سکتی۔

''تمہیں یہ کون کہہ رہا ہے کہ تم اس کے بغیر جیو شیریں شفق مجھے بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں۔

شفق میرے گھر میں دوسرے بچوں کی سی حیثیت کے ساتھ رہے گی۔ کیا تمہیں مجھ پر

اعتبار نہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا رضا۔ کہ میں کیا فیصلہ کروں۔'' شیریں فیصلے کے موڑ پر الجھ کر رہ گئی تھی۔

''تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے میں فیصلہ کر چکا ہوں اور۔ اور اب میں ہارنے کا حوصلہ نہیں رکھتا شیریں یہ سوچ لینا۔''

رضا ان کو ایک نئی سوچ دے کر باہر نکل گئے اب رضا کے لیے دوسرا مسئلہ گھر میں بات کرنا تھا لیکن اب وہ کسی بات سے خوفزدہ نہیں تھے۔

''امی جان۔ امی جان۔ آپ اس روز ذکر کر رہی تھیں۔'' وہ ماں سے بات کرتے ہوئے جھجک رہے تھے مگر وہ سمجھ گئی تھیں۔

''ہاں۔ ہاں بیٹا۔ کیا سوچا ہے تم نے؟'' وہ خوش ہو گئیں۔

''سوچا تو ہے امی لیکن اس بار بھی میری اور آپ لوگوں کی سوچ میں اختلاف ہی پایا جاتا ہے امی جان شیریں نے اب تک شادی نہیں کی۔'' رضا اب یہ بات حتمی کرنا چاہتے تھے مگر ماں کے سامنے وہ آہستگی سے ہی بولے۔ مگر ایسے لہجے میں کہ بشریٰ بیگم کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ کوئی فیصلہ بھی شیریں کے خلاف نہیں کر سکتیں اور ویسے بھی ان کو شیریں سے کوئی ذاتی عناد نہیں تھا وہ تو بس عفت کی وجہ سے شیریں کے خلاف تھیں اور اب تو جب عفت ہی نہ رہی تو بیٹے کی خواہش پوری کر دینے میں ان کو کوئی قباحت نظر نہیں آئی تھی اسی لیے انہوں نے رضا مندی دے دی۔ رضا کو اپنی سماعتوں پر شبہ ہونے لگا باقی کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا جبکہ صدیقہ نے حسب توقع منہ بنایا تھا۔

''آپی۔ شیریں سے آخر آپ کو کیا دشمنی ہے کہ اس کی دشمنی میں آپ اپنے سگے بھائی کو بھی اس آگ میں جھلسا رہی ہیں۔'' رضا سے نہ رہا گیا تو شکایت لبوں پر آ ہی گئی۔

''مجھے اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بس وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' صدیقہ منا بنا کر شیریں سے اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔

''بس آپی کسی سے نفرت کے لیے ٹھوس وجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آپ کو اچھی نہیں لگتی تو نہ سہی مگر مجھے تو لگتی ہے۔'' رضا کا لہجہ ذرا تلخ ہو گیا۔

''ہونہہ۔ سوچ کر فیصلہ کرنا۔ وہ تمہارے بچوں کی سوتیلی ماں بن گئی تو شاید تمہیں بھی رائے بدلنی پڑے۔''

''وہم ہے آپ کا۔ شیریں ان سطحی اور چھوٹی باتوں سے بلند ہے۔''

بھائی کا خیال آ گیا تھا یا کوئی اور بات تھی کہ صدیقہ نے زیادہ مخالفت نہیں کی تھی اور یوں شیریں رضا انکی زندگی کی تلخیوں کو ختم کرنے کے لیے آ گئی شفق کو دیکھ کر صدیقہ نے کہا تھا بڑا

جیتا جاگتا جہیز لائی ہو۔تب بشریٰ بیگم نے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا تو وہ مزید انگارے چبا کر رہ گئیں۔

''رضا۔ یہ سارے بچے آتے ہیں میرے پاس مگر حیدر۔'' شیریں نے سوئے ہوئے اشعر کو بستر پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں شریں۔ حیدر اور ارم دونوں بچے کچھ ٹیڑھے ہیں تمہیں ان پر خصوصی توجہ دینی پڑے گی میں بھی ان کو سمجھاؤں گا بس بچے ہیں۔ ماں کے بعد ذرا ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔''

رضا نے خود بھی یہ بات نوٹ کی تھی کہ حیدر شیریں کے پاس نہیں آیا تھا کیوں نہیں آیا تھا، یہ بھی جانتے تھے اور خود بھی یہی چاہتے تھے کہ کچھ عرصہ حیدر' شیریں سے دور ہی رہے' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ صدیقہ نے حیدر کے ذہن میں بارود بھر دیا تھا جس سے شیریں اپنے بے لوث خلوص کے ساتھ زخم زخم ہو جائے۔

''میں جانتی ہوں رضا۔ بچے ماؤں سے کتنے اٹیچ ہوتے ہیں اور جب ماں بھی چھن جائے تو بچے چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ میں انشاء اللہ تعالیٰ بچوں کی یہ محرومی دور کر دوں گی۔ اپنے خلوص سے' اپنی محبت سے'' شیریں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ رضا دل میں آمین کہتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ اب ایسا ناممکن ہی لگتا ہے ان کی اپنی بہن نے ان کے معصوم بچوں کی رگوں میں بغاوت کا زہر بھرا تھا۔ وہ کس سے شکوہ کرتے۔

''ہاں کوشش کرنا شیریں۔ ایسا ہی ہو۔ حیدر سمجھ لو میری جان ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں رضا۔ آپ مایوس نہیں ہوں گے۔ انشاء اللہ۔''

شیریں نے بڑے خلوص سے یقین دلایا۔ شیریں کا یہ رضا ہی سے نہیں خود اپنے آپ سے بھی عہد تھا کہ وہ ان بن ماں کے بچوں کو اپنی محبت اور ممتا سے۔ ہر محرومی ختم کر دیں گی اور رضا کی الجھی زندگی کی تاروں کو سلجھاتی ہوئی چلی جائیں گی۔ انکی خواہش تھی کہ بچے ان کو سوتیلی ماں نہ سمجھیں بلکہ اپنی سگی ماں کی طرح ان کے پاس آئیں۔ ان سے اپنی ہر ضرورت طلب کریں۔ کوئی تکلیف ہو تو ان کو بتائیں۔ ان سے اپنے کام کرائیں مگر ایسا نہیں تھا۔ حیدر اور ارم تو ان سے نفرت کرتے تھے البتہ کرن اور اشعر شیریں سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور اسی لیے حیدر' ارم کے عتاب کا نشانہ بھی بنتے رہتے تھے۔

اشعر تو جب شیریں آئی تھی اتنا چھوٹا تھا کہ اگر اس کو نہ بتایا جاتا کہ یہ اس کی دوسری مما ہیں تو شاید اسے تمام عمر اس بات کا پتا نہ چلتا۔ مگر اتنا ظرف صدیقہ کے پاس آتا کہاں سے اب وہ خود خاموش رہتیں۔ حیدر کے شانے پر بندوق رکھ کر نشانہ لگاتیں۔ اشعر کے سکول میں پیرنٹس ڈے (والدین کا دن) تھا۔ اشعر کا اصرار تھا کہ مما پپا دونوں چلیں۔ شیریں تو تیار تھیں ویسے بھی وہ بچوں کے اسکول جا کر ان کی رپورٹ وغیرہ لایا کرتی تھیں۔

''مما آپ آئیں گی نا؟ اشعر تصدیق چاہ رہا تھا۔''

''ہاں بیٹا۔ کیوں نہیں آؤں گی۔ شیریں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

''تو پپا سے بھی کہیے۔ وہ بھی چلیں۔''

''سوری میری جان۔ بہت ضروری کام ہے ورنہ۔''

''کوئی کام بچوں کی خوشی سے زیادہ ضروری نہیں ہوتا رضا۔ اور نہ اہمیت رکھتا ہے آپ کو اشعر کے لیے وقت نکالنا پڑے گا۔ اس طرح بچوں کے دل چھوٹے ہو جاتے ہیں اور وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

''او کے بیٹا۔ ہم ضرور آئیں گے۔'' کچھ سوچ کر رضا نے ہامی بھر لی تو اشعر خوش ہو گیا۔

''مما۔ پتا ہے آپ کون سے کپڑے پہنیں۔ آپ بلیو والی ساڑھی پہن کر آیئے گا۔''

اشعر نے اپنی مما کو اپنی پسند کے کپڑے بھی بتا دیئے۔

''اچھا۔ آپ کو وہ ساڑھی اچھی لگتی ہے تو چلو ہم وہی پہن لیں گے۔''

''تھینک یو مما۔ اشعر خوش خوش باہر نکل گیا تو شیریں اٹھ کر وارڈ روب کی طرف آ کر بلیو ساڑھی نکال کر دیکھنے لگیں کہ اشعر بری طرح روتا ہوا آ گیا۔

''کیا ہوا بیٹے؟ رضا اور شیریں ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے۔

''مما۔ آپ ہماری مما ہیں نا۔ اپنی والی مما؟'' وہ ہچکیوں کے درمیان پوچھ رہا تھا اور شیریں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''ہاں بیٹا۔ میں آپ ہی کی مما ہوں۔ شیریں نے اشعر کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''مگر۔ مگر مما۔ پھر حیدر بھائی کیوں کہہ رہے تھے کہ آپ ہماری مما نہیں ہیں۔ ہماری مما اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی ہیں۔ اور۔''

''اوہ۔ مائی گاڈ۔'' رضا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''حیدر۔ حیدر۔'' انہوں نے کمرے ہی سے حیدر کو غصے سے پکارا۔

''نہیں رضا۔ آپ حیدر کو کچھ نہیں کہیں گی وہ بچہ ہے اس کا کیا قصور ہے؟ بچہ تو اندھے انسان کی مانند ہوتا ہے اسے اچھائی کے راستے پر ڈال دیا جائے یا برائی کے۔ وہ تو اسی طرف چل پڑتا ہے نا۔ اگر آپ اس کو میری وجہ سے کچھ کہیں گے تو اس کے دل میں میرے لیے مزید نفرت پیدا ہو جائے گی اور پھر نفرت کے زہر کے اثر کو محبت سے زائل کیا جاتا ہے۔ مزید نفرت سے نہیں چلیے اسے آپ میرے اور حیدر کے درمیان محبت اور نفرت کا مقابلہ ہی سمجھ لیں اگر میری محبت میں گہرائی اور پائیداری ہو گی تو میں جیت جاؤں گی۔ اور نہ ہوئی تو۔ آپ میری جیت کی دُعا کریں۔'' شیریں نے ہچکیاں لیتے ہوئے اشعر کو ساتھ لگا کر کہا۔ تو رضا محبت و وفا کی اس دیوی کو دیکھتے رہ گئے۔

الھڑ پن شوخی شرارت اور بدتمیزی تو حیدر پر گویا ختم تھی۔ گھر کا کوئی بچہ اس کی شرارت اور بدتمیزی سے بچا ہوا نہیں تھا اور خصوصاً شفق سے تو اسے اللہ واسطے کا بیر تھا شیریں کے حوالے سے کم گوسی صلح جو سی یہ لڑکی اس کی ہر زیادتی اس لیے برداشت کر جاتی کہ کوئی اس کی خالہ جانی کو برا نہ کہے۔ حیدر بھی اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

وہ مشکلوں سے بالوں کی پونی بناتی تو وہ اس کا ربن کھول دیتا تھا۔ وہ جھنجھلا کر مڑتی تو تھپڑ رسید کر دیتا وہ شکایت کرتی تو صاف مکر جاتا اور اس کی حامی تو بڑی پھپھو تھیں۔ پھر بھلا وہ جھوٹا کیونکر ہو سکتا تھا اس روز کرن اور شفق گڑیا گڑیا کھیل رہی تھیں۔ اپنے سارے کھلونے سجائے ہوئے تھیں۔ حیدر آیا۔ پہلے ہنسا اور پھر دونوں کی گڑیاں فضاء میں اچھال دیں۔ ان کا چھوٹا سا بنایا ہوا گھروندہ مسمار کر دیا تو دونوں ایک طرز میں رونے لگی۔

''او۔ چپ کرو۔ گونی لگ گئی ہے کیا؟'' وہ ڈپٹ کر بولا۔

''ہم۔ پپا سے شکایت کریں گے۔'' وہ دونوں کورس میں بولیں۔

''اچھا تو تم پپا سے میری یعنی کہ میری شکایت کرو گی؟'' وہ طنزیہ ہنسی لیے ان کی طرف بڑھا۔

''ہاں ضرور کریں گے۔'' شفق اس سے مرعوب ہوئے بغیر بولی۔

''بی مینڈ کی۔ تمہارا زکام تو ایک گھونسے سے ٹھیک ہو جائے گا خبردار جو شکایت لگائی تو ورنہ یہ جو تم دونوں کی پنسل کی طرح باریک گردنیں ہیں نا۔ ان کو ایسے مسل دوں گا جیسے چیونٹیوں کو مسل دیا کرتا ہوں۔''

''وہ اپنے چھوٹے مگر مضبوط ہاتھوں کی گرفت ان کی گردنوں پر سخت کرتا ہوا بولا تو کرن نے جلدی سے سوری بھیا کہہ کر گردن چھڑالی۔

''تم خود کو کیا سمجھتے ہو بھوت کہیں کے۔ میں پپا سے ضرور شکایت لگاؤں گی۔'' شفق نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑالی۔

''کھٹ کھنی بندریا۔ یہ تم ہمارے پپا کو پپا کیوں کہتی ہو؟'' وہ دوبارہ اس کی طرف بڑھا۔

''اس لیے کہ وہ میرے بھی پپا ہیں۔'' شفق کا ننھا سا ذہن رشتوں کے ردوبدل کو نہیں سمجھتا تھا اسے جو کہا گیا وہ وہی کرتی تھی۔

''ہرگز نہیں۔ وہ صرف اور صرف ہم چاروں کے پپا ہیں اور بس۔ آئندہ کبھی تم نے ہمارے پپا کو پپا کہا تو انگارے رکھ دوں گا زبان پر۔'' وہ واقعی انگارے چباتا ہوا بولا۔

''کہوں گی۔ کہوں گی۔ ضرور کہوں گی لنگور کہیں گے۔'' وہ اسے زبان دکھاتی ہوئی بھاگی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی بھاگا مگر سامنے سے شیریں کو آتے ہوئے دیکھ کر رک گیا۔

''آپ۔ آپ اسے سمجھا لیں جی۔ یہ میرے ساتھ بدتمیزی کرتی ہے۔ اگر میں نے کچھ

کہہ دیا تو آپ کو اعتراض ہو گا'' وہ اس طرح کچھ دھونس اکڑ اور کچھ احترام سے بولتا شیریں کو بہت اچھا لگا۔

''خیر اس کو تو میں خوب اچھی طرح سمجھا دوں گی بیٹے لیکن ایک بات آپ بھی تو سمجھ لیں کہ میں آپ کی مما ہوں۔ آپ مجھے مما کہا کرو۔ یہ کیا کہ غیروں کی طرح آپ پر گزارہ کرتے ہوں؟'' وہ نرمی سے مسکراتی ہوئی بولیں تو حیدر نے تیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ میری مما نہیں ہیں۔ آپ نے میری مما کو مارا تھا تا کہ آپ پپا سے شادی کر سکیں اب تو خوش ہیں نا آپ؟'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا جس سے اس کی نفرت کا پتا چل رہا تھا۔

''اف میرے خدایا۔ میں نے ایسی زندگی کا تو تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔'' شیریں دکھ کی دلدل میں دھنستی چلی گئیں۔ کس قدر بڑی بات حیدر نے اپنے چھوٹے سے منہ سے ادا کی تھی۔ انہوں نے حیدر کو کچھ نہیں کہا۔ سیدھی صدیقہ کے پاس آگئیں انہوں نے شیریں کو تیز نگاہ سے دیکھا اور اخبار میں مصروف ہو گئیں۔

''آپی مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ۔ کہ اگر میں خطا کار ہوں تو آپ مجھے سزا دیں زندہ درگور کر دیں یا دیوار میں چنوا دیں مگر پلیز بچوں کے پاکیزہ اور معصوم ذہنوں کو عداوت بناوٹ اور نفرت سے آلودہ نہ کریں۔ یہ ان کے لیے مہلک ناسور بن گیا تو۔ تو کوئی بھی خوش نہ رہ سکے گا۔''

''تو تمہارا خیال ہے میں بچوں کو بھڑکاتی ہوں۔ ہمارے بچے بہت ذہین ہیں۔ سب کچھ خود ہی محسوس کر لیتے ہیں اور مجھے تم سے کیا دشمنی ہونے لگی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تمہارے وجود سے تمہارے ذکر سے ہمارے گھر میں فساد کھڑا ہوا ہے اور بچے بھی یہ سب محسوس کرتے ہیں تو خود بخود نفرت ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔'' صدیقہ نے حقارت سے ان کو دیکھا اور اخبار ایک طرف رکھ کر اٹھ گئیں۔

''شیریں۔ معاف کرنا اتنی محبت اور قربانی کا تمہیں۔ یہی صلہ مل سکتا ہے یہاں تو صبر حوصلہ میری بہن۔ کبھی نہ کبھی تو یہ بادل نفرت کے چھٹیں گے ہی آخر۔ ضیاء بھیا اور شاہین بھابھی بڑھ کر ان کے زخموں پر اپنی ہمدردی کے پھائے رکھتے تو کچھ دیر کے لیے درد کی شدت میں کمی آجاتی۔

حیدر کو دو روز سے بخار تھا۔ رضا کو پتا چلا تو وہ تڑپ اٹھے۔

''حیدر کی اتنی طبیعت خراب تھی اور کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بتا ہی دے۔ شیریں۔ شیریں۔'' وہ حیدر کو گود میں لیے شیریں کو پکارنے لگے۔

''اسے کیوں بلاتے ہو۔ اس کے کون سے جگر کا ٹکڑا ہے کہ اسے تکلیف ہو گی' اسے تو اپنی

جاب کی فکر ہوتی ہے یا پھر شفق کی۔'' صدیقہ نے جلتی پر تیل ڈالا تو آگ بھڑک اٹھی۔ رضا غصے میں اپنے کمرے میں آگئے اور سوئی ہوئی شیریں پر سے چادر کھینچ لی۔ تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا رضا۔؟'' وہ رضا کو اس طرح دیکھ کر ڈر گئیں۔

''ہوا نہیں تو ہو جائے گا۔ ہو جائے گی مراد پوری۔'' وہ دھاڑے۔

''رضا۔ رضا۔'' وہ بالکل بھی نہ سمجھ پائی تھی۔

''ہاں۔ تم کیوں سمجھو گی؟'' اگر اس طرح شفق بخار میں مبتلا ہوتی تو پھر میں دیکھتا کہ تم اس طرح آرام سے سوتی ہو۔''

''رضا۔ میں اب بھی نہیں سمجھی۔'' شیریں نے رضا کو دیکھا جو اس وقت ہمیشہ سے مختلف لگ رہے تھے۔

''کچھ خبر بھی ہے کہ حیدر کو دو روز سے کس قدر کا تیز بخار ہے۔ پتا کیا ہے اس کا؟'' تپش محسوس کی ہے اس کے بخار کی؟''

''حیدر کو بخار ہے۔ مگر۔ مگر رضا۔ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔'' وہ دوپٹہ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں۔ مسجدوں میں اعلان ہوتا۔ تب آپ کو خبر ہوتی۔'' رضا کے سلگتے لہجے نے شیریں کے روئیں روئیں کو جھلسا ڈالا۔ مگر اس وقت انہوں نے رضا سے بحث فضول جانی۔ وہ کیسے بتاتیں کہ حیدر کو ان کی پھپھو ان سے اس طرح بچاتی ہیں جیسے وہ اچھوت ہوں۔

''تم کل سے جاب پر نہیں جاؤ گی۔ پوری توجہ گھر اور بچوں پر دو گی۔ سمجھیں۔'' رضا حکم دیتے ہوئے باہر نکل گئے۔ گویا وہ انکی باندی تھیں۔ زرخرید لونڈی تھیں۔ جس کے ساتھ جس کا جو جی چاہتا سلوک کرتا مگر ان کے ظرف میں اتنی بلندی' اتنی لچک تھی کہ وہ برداشت کرتیں اسی لیے انہوں نے دھندلا جانے والی آنکھوں کو رگڑا اور حیدر کے کمرے میں آگئیں۔

''حیدر۔ حیدر بیٹے۔ کیسی طبیعت ہے آپ کی جان۔'' انہوں نے رضا کی گود میں پڑے حیدر کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''مت چھوئیں آپ مجھے۔ چلی جائیں میرے کمرے سے۔'' حیدر نے ان کا ہاتھ بدتمیزی سے جھٹک دیا تو اس بے عزتی پر شیریں کا جی چاہا خودکشی کر لیں۔ انہوں نے شاکی' ڈبڈبائی نظروں سے رضا کو دیکھا جواب نادم نادم سے لگ رہے تھے ان سے نگاہیں چرا گئے وہ رات شیریں نے روتے ہوئے گزاری۔ رضا شرمندہ سے ان کو دیکھتے رہے۔

''سوری شیریں۔''

''وہ لوگ مجھے سنگسار بھی کر دیں تو دکھ نہیں ہوگا۔'' مگر رضا' آپ کا مارا ہوا پھول بھی زخم

زخم کر گیا ہے مجھے۔ مجھے تو یہ ہی اعتبار تھا کہ آپ مجھے اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر آج پتا چلا کہ ہم تو سدا کے اجنبی ہیں' انجان ہیں۔''

''سوری شیریں۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ میں نے تمہارا انتخاب بھی اسی اعتبار پر کیا تھا کہ تم ہی میرے بچوں کو حقیقی ماں کا پیار دے سکتی ہو۔ مگر اب میں اپنے نصیبوں کا کیا کروں۔ شیریں میں تو زندگی کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا ہوں تمہیں کھو کر زندگی میں پر نہ ہونے والا خلا پیدا ہو گیا تھا پالیا تو سوچا کہ میں اب دکھوں کی سرحد پار کر آیا ہوں اور سکھ' امن اور خوشیوں کی وادی میری منتظر ہے مگر یہ بھی میرا خیال ہی رہا۔ میں تمہیں غلط نہیں کہہ رہا ہوں شیریں۔ شیریں میری زندگی میں کوئی لمحہ بھی مجھے ایسا یاد نہیں جس کے دامن میں میرے لیے کوئی ایسی حقیقی خوشی ہو جو کسی دکھ کا سوز لیے ہوئے نہ ہو۔'' دکھی لہجے میں سلگتی ہوئی لبوں سے لفظ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

شیریں نے دھندلی آنکھوں سے رضا کو دیکھا جن کی خوشی کے لیے انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا اور عہد کیا تھا کہ وہ ان کو خوش رکھیں گی مگر بعض اوقات خوشیاں اس رنگین اور خوش نما تتلی کی مانند ہو جاتی ہیں کہ انسان تمام عمر ان کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اور جب اس تتلی تک رسائی ہو جاتی ہے اسے پکڑتا ہے تو اس کے سارے رنگ اڑ چکے ہوتے ہیں رضا اور شیریں بھی شاید کسی ایسی ہی خوش نما تتلی کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

لیکن ایسے حالات کے باوجود شیریں نے ہمت نہیں ہاری تھی وہ بادِ مخالف سے گھبرا کر پرواز بدلنے والوں میں سے نہیں تھی۔ بلکہ وہ ہواہوں کے رخ اپنی طرف موڑنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ لیکن اس کے لیے اس کو بہت ضبط اور صبر کی ضرورت تھی۔ انسان ہی تو تھی۔ کبھی کبھی لڑکھڑا ہی جاتی تھی۔ شفق ان کی بہن کی بیٹی تھی مگر ان کو یوں لگتا کہ وہ ان کی اپنی اولاد ہے اسے کچھ ہوتا تو ان کی جان پر بن جاتی مگر حیدر جب اسے کچھ کہتا' مارتا تو وہ بس ضبط کر کے رہ جاتیں۔

اس روز ارم' کرن اور شفق لڈو کھیل رہے تھے حیدر آیا اس نے پکڑ کر لڈو کے دو ٹکڑے کر دیئے اور خود صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ لڑکیوں کا خون جل کر رہ گیا۔

''حیدر۔ تم اس قدر ذلیل انسان کیوں ہو؟'' شفق کمر پر ہاتھ باندھے اس طرح پوچھ رہی تھی گویا کوئی خطاب دے رہی ہو۔ حیدر نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا اور شفق کو بالوں سے پکڑ کر گھما کر چھوڑ دیا۔ تو شفق کی پیشانی میز کے کونے سے جا ٹکرائی۔ اور خون سے اس کا سارا چہرہ بھر گیا۔ اس کی پیشانی پر چار ٹانکے لگے تو گویا شیریں کو یوں لگا اس کے اپنے دل پر لگے ہیں۔ رضا حیدر کو سزا دینا چاہتے تھے مگر شیریں نے روک دیا۔

''شیریں اس طرح بھی بچہ بگڑ جاتا ہے کہ اس کی ہر بات' ہر غلطی کو معاف کر دیا جائے۔''

نہیں رضا۔ یہ میرے اور شفق کے ضبط کا امتحان ہے۔ ہمیں پورا اترنے دیں۔''

شیریں کی ہر ممکن خواہش ہوتی کہ وہ حیدر کے دل سے نفرت کی میل کو اپنی محبت سے دھوڈالے اس لیے اس کی ہر بات کا خیال رکھتی۔ اس کے لیے اس کی پسند کے کپڑے لاتی تو وہ اٹھا کر باہر پھینک دیتا نٹ کھٹ سے اس لڑکے کو نہ جانے کون سی محرومیاں مضطرب کیے رہتیں کہ وہ امن سے کھیلتے بچوں کا کھیل بگاڑ دیتا اور کسی کی کیا مجال کہ اس دھانسو کی شکایت کسی بڑے سے لگالے۔

اسی دوران اللہ تعالیٰ نے شیریں کو ثناء کی صورت میں پیاری سی بیٹی عطا کر دی تو ان کو لگا جیسے کوئی بہت بڑا خلا تھا جواب پُر ہو گیا ہے۔

اس خوشی کے بعد شجاعت احمد کی وفات کی صورت میں صدمہ بھی دیکھنے کو مل گیا۔ بشریٰ بیگم اور رضا' ضیاء کو اب صدیقہ کی فکر لگی رہتی جن کی ڈھلتی عمران کے چڑچڑے پن میں مزید اضافہ کر رہی تھی ضیاء کے ایک دوست جن کی بیوی وفات پا گئی تھی' دو بیٹے تھے۔ وہ صدیقہ کے لیے طلب گار تھے چونکہ پرپوزل اچھا تھا سب ہی رضا مند تھے مگر صدیقہ کا کہنا تھا کہ اول تو وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی اور اگر کرے گی تو شادی شدہ یا بچوں والے شخص سے ہرگز نہیں کرے گی۔ شیریں تو اس سلسلے میں بالکل ہی کچھ نہیں بول سکتی تھیں البتہ دوسرے لوگ بہت سنجیدہ تھے۔''

''امی جان۔ آپ ہی صدیقہ کو سمجھائیں۔ اب ہمارے پاس چوائس کا وقت نہیں ہے۔ ذرا اور عمر ڈھل گئی تو۔''

''جی امی جان۔ اظفر بہت اچھا انسان ہے۔ آپی خوش رہیں گی۔'' رضا اور ضیاء احمد بشریٰ بیگم کو کہہ رہے تھے تاکہ وہ صدیقہ کو سمجھائیں۔

اور پھر جانے کون کون سے دلیلیں دے کر بشریٰ بیگم نے انہیں منا ہی لیا۔ لیکن ان کی شرط تھی کہ وہ ارم اور حیدر کو ساتھ لے کر جائیں گی۔ وہ ان دونوں کو شیریں کے پاس نہیں چھوڑیں گی' کہیں وہ ان سے انتقام نہ لیں مگر رضا نے قطعی انکار کر دیا تھا کہ وہ اپنے بچے اپنے پاس ہی رکھیں گے۔

صدیقہ کی زندگی کی یہ واحد بات تھی جو نہیں مانی گئی تھی وہ بل کھا کر رہ گئیں۔ تاہم خاموش رہیں کیونکہ اب وقت کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اب بھائیوں پر بوجھ ہیں اور اب اپنا گھر بنا لینا چاہیے۔ گو کہ انہوں نے ایسے گھر کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا جہاں بچے پہلے سے موجود ہوں اور یہ سوتیلی ماں بن کر جائیں بہرحال کچھ بھی تھا ان کو اعتماد تھا کہ وہ سب کچھ دیکھ لیں گی مگر ان کو آہستہ آہستہ پتہ چل رہا تھا کہ یہ لوہے کے چنے ہیں کہ نہ اگل سکتی ہیں نہ ہی نگل سکتی ہے۔

اظفر کے دونوں بیٹے نومی اور روفی خاصے بگڑے ہوئے بچے تھے اور اظفر کی طرف سے حکم تھا کہ ان کو کچھ نہیں کہا جائے خواہ یہ کتنا ہی برا کام کیوں نہ کریں۔ وہ خود کو سنبھالیں گے یہ صدیقہ کی انا پر تازیانہ تھا کہ انہوں نے اپنے گھر پر حکومت کی تھی جیسا چاہا تھا ویسا ہی کیا تھا مگر انہیں اندازہ ہوا تھا کہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔

صدیقہ کی شادی سے یہ ضرور ہوا تھا کہ گھر کی فضاء جو پہلے مکدر سی رہتی تھی اب خوشگوار سی ہو گئی تھی لیکن حیدر کے ذہن میں نفرت' بغاوت کا بیج جو وہ بو گئی تھی' وقت کے ساتھ ساتھ وہ پنپ رہا تھا۔ اتنی محبت' اتنے خلوص کے باوجود شیریں' ارم اور حیدر کے دل میں جگہ نہیں بنا سکی تھیں۔ یہ بچے اتنے سالوں کے بعد بھی ان کا ناکردہ گناہ معاف کرنے کو تیار نہیں تھے بلکہ یہ دونوں کرن اور اشعر کے بھی خلاف ہو گئے تھے کہ یہ شیریں سے محبت کیوں کرتے تھے۔

اشعر' ثناء کو پیار کرتا تو حیدر ایک تھپڑ جڑ دیتا تھا اور کہتا کہ یہ صرف مما کی بیٹی ہے ہماری بہن نہیں ہے ایسی باتیں اس کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں تھیں بلکہ سکھائی گئی باتیں تھیں مگر وہ کیا کر سکتی تھیں رضا نے سوچا تھا کہ صدیقہ کی شادی ہو جائے گی تو بچے بھی سدھر جائیں گے مگر صدیقہ کا گھر قریب تھا جہاں سارا وقت بچے گھسے رہتے یا وہ یہاں رہتیں۔

رُتیں بیتیں' موسم بدلے تو گلشن کی معصوم کلیاں کھل کر پھول بن گئیں معصوم مسکراہٹوں کی جگہ شوخ کھنکتے جواں قہقہوں نے لے لی جن میں سب سے بلند اور شوخ قہقہہ حیدر رضا کا ہوتا۔ بچپن میں بھی سارے کزنز خوب انجوائے کرتے تھے مگر جوان ہو کر تو زندگی کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا۔ عطیہ بیگم کے نوید' وحید' اسد اور بیٹیوں میں سامیہ' اور نائمہ' ضیاء احمد کے وسیم اور وقار تو بڑے تھے مگر وقاص اور ایاز اور حِنا' بینا اور شینا تھیں۔ صدیقہ بیگم کے اپنی کوئی اولاد نہ ہوئی البتہ نومی اور روفی ضرور ان کے گینگ میں شامل ہو گئے۔ گو کہ۔ اپنی پھپھو کی وجہ سے حیدر ان سے خاصی خار کھاتا تھا مگر دونوں بڑے سلجھے ہوئے تھے اور شفق بھی چونکہ فطری طور پر کم گو اور سنجیدہ سی تھی اس لیے ان سے اس کی خوب بنتی تھی اور حیدر نے ان تینوں کو۔ بلا روک ٹوک قنوطی' احساس کمتری کے مارے ہوئے کہہ دیا تھا۔ شفق چاہتی تو اس کا منہ توڑ جواب دے سکتی تھی مگر اپنی خالہ جانی کی خاطر اسے چپ رہنا پڑتا تھا۔

اس وقت بھی وہ روفی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں کہ اسد اور سامیہ وغیرہ آ گئے۔

''بھئی۔ یہ اپنا ہیرو نظر نہیں آ رہا۔ بتا سکتی ہو شفق؟'' اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑا کر حیدر کو ڈھونڈا۔

''وہ لوگ میرے خیال میں ابھی کالج سے نہیں آئے۔ لو ادھر نام لیا ادھر موجود۔''

کوریڈور میں حیدر' وقاص اور ایاز کی آوازیں سن کر شفق نے مسکرا کر کہا۔

''اوہو۔ روفی صاحب تشریف فرما ہیں۔ تب ہی میں بھی کہوں کہ ان کے چہرے پر

مسکراہٹوں کے گلاب کیوں کھل رہے ہیں۔" حیدر کی تیز نظریں شفق کے آر پار ہو گئیں وہ اسی طرح اس کی تذلیل کر دیا کرتا تھا۔ روفی بھی کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔

"حیدر۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم اس قسم کی باتیں کرو۔"

"نا۔ تو حق مانگا کس نے ہے بھئی۔ ہم تو حق چھیننے کے عادی ہیں۔ خیر تو پھر کیا موضوع ڈسکس ہو رہا تھا۔" وہ شفق کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ کیا بات ہو رہی تھی۔" شفق نے کتاب اٹھائی اور کمرے میں آ گئی۔

"ہونہہ۔ ہری مرچ۔" وہ کشن گود میں رکھ کر اور ٹانگیں میز پر پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"ویسے یار' اللہ تعالیٰ نے آج عزت رکھ لی کہ پٹتے پٹتے بچ گئے۔ ورنہ۔" وقاص حیدر کو دیکھ کر شوخی سے بولا۔

"یار' مجھے کیا پتا تھا کہ میں جسے لیلیٰ سمجھ رہا تھا۔ وہ لیلیٰ کی ماں نکلے گی یا ویسے آنٹی تھیں بڑی اسمارٹ۔"

حیدر نے دوسرا کشن بھی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور آنٹی کی ہیل بھی بڑی سمارٹ تھی۔ سرو قد لمبی سی۔"

"یہ کیا باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ؟ آخر ہمیں بھی تو بتائیں۔" اب لڑکیوں کو بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔

"کیا خیال ہے بتا دوں؟" اسد نے حیدر کی طرف دیکھا۔

"بتاؤ۔ مجھ سے تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے صرف میری بات ہو۔"

"اچھا تو میرے پاس آؤ میرے دوستو۔" "ایک قصہ سنو۔"

سب کے سب اسد کے قریب ہو گئے' جیسے وہ کوئی بڑی راز کی بات بتانے والا ہے۔

"ہاں تو قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم جیسے ہی کالج سے نکلے ہمارے سامنے ایک برقعہ پوش خاتون جا رہی تھیں' خاصی اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ حیدر کو حسبِ عادت شرارت سوجھی۔ بولا۔ چلو پیچھا کرتے ہیں۔ کہا بھی کہ بھائی ہیل کافی بڑی ہے۔ مانا کہ تمہارے بال خاصے ہیں مگر نہ مانا۔ خیر ہم بھی ساتھ ہو لیے اور ہم نے کافی دیر تک خاتون کا پیچھا کیا۔ آخر خاتون کو بھی شک ہو گیا تو وہ ایک جگہ رُک گئیں۔ انہوں نے ایک ادا سے نقاب اٹھایا تو ہم لوگ جہاں تھے وہیں رہ گئے۔

"کیوں بیٹا' تمہیں اپنی امی کی تلاش ہے۔" انٹی نے کاری ضرب لگا کر ہماری شرارت کو چکنا چور کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی۔ وہ اصل میں میرا دوست۔" حیدر صاحب ہکلا رہے تھے۔

"اچھا تو تمہارا دوست برقعہ بھی پہنتا ہے۔" آنٹی بھی ہمیں شرمندہ کرنے کا پروگرام بنا چکی تھیں۔

"نہیں جی۔ وہ برقعہ تو نہیں مگر وہ۔ ہیل۔" حیدر صاحب کو کچھ ہوش نہیں تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

"اچھا تو ہیل والی جوتی تمہارے دوست کی ہے۔" آنٹی بھی کسی زمانے میں شوخ حسینہ رہ چکی تھیں شاید۔

"جی۔ برقعہ۔ جوتی۔ سلام علیکم آنٹی۔"

"حیدر صاحب نے جلدی سے سلام جھاڑا اور ہم لوگ نو دو گیارہ ہو گئے۔" اسد نے کچھ اتنے مزے سے بات سنائی کہ سب ہنس پڑے۔ مگر نائمہ چونک گئی۔

"بھیا۔ یہ کس روز کا واقعہ ہے؟"

"کل کا۔"

"ہوں۔ تو یہ آپ لوگ تھے۔ آپ کو پتا ہے وہ ہماری مس تھیں۔ انہوں نے آج ہمیں یہ بات بتائی تھی' کہ اس طرح چند لڑکے ان کے پیچھے لگ گئے تھے' ہائے میں اب ان کے سامنے کیسے جاؤں گی وہ کیا خیال کریں گی۔"

"تو جاہل لڑکی۔ ان کو کیا خبر کہ تمہارے بھائی ہیں۔" حیدر نے ڈپٹ کر کہا۔

"یار۔ بڑے بدذوق ہو۔ باہر موسم ہے عاشقانہ اور تم لوگ اندر سڑ رہے ہو۔"

"تو جائیے' عشق فرمائیے۔ یہاں کیوں چلے آئے گھاس چرنے؟" وقاص نے کشن کھینچ کر ایاز کو مارا۔

"بس یار۔ تمہیں کمپنی دینے چلا آیا۔ اکیلے چرتے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔"

"واہ۔ کیا چرب زبانی ہے۔ گدھو! کبھی تو انسانی لباس میں نظر آیا کرو۔" حیدر نے ان دونوں کو ڈپٹ دیا۔

"اچھا بھائی جان۔" ایاز کی بات پر سب مسکرا دیے۔

"ویسے واقعی' موسم تو ایسا ہو رہا ہے کہ اندر بیٹھنا اس موسم کی توہین ہے کیا خیال ہے چلیں کہیں باہر؟" حیدر نے پردے کھسکا کر دیکھا تو فوراً باہر کہیں جانے کو تیار ہو گیا۔

"بھیا۔ ہم لوگ بھی چلیں گے۔" ارم اور کرن ایک ساتھ بولیں۔

"ہم بھی چلیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ایاز نے ڈانٹ کر کہا۔

"ہاں ہاں سب چلیں گے ماسوائے ناپسندیدہ لوگوں کے۔" حیدر نے شفق کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جو کسی کام سے آ گئی تھی مگر اس وقت اس نے اس بدتمیز کے منہ لگنا پسند نہیں کیا۔

"کم بکا کرو حیدر۔ چلو شفو اور باقی لڑکیو! جلدی سے اٹھارہ سنگھار کر کے تیار ہو جاؤ۔ دیکھو

دوسنگھار کی مفت میں اجازت دے رہا ہوں۔ شفق ذرا جلدی سے۔''

''سوری وقاص۔ میں بھی ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ جانا پسند نہیں کرتی۔'' شفق نے بھی تیز نگاہوں سے حیدر کو دیکھتے ہوئے حساب برابر کیا۔

''یہ تم مجھ سے یعنی حیدر رضا سے کس حساب میں مقابلہ کرتی ہو۔ بھلا زمین اور آسمان کا کیا مقابلہ؟''

وہ کمر پر ہاتھ باندھے اُسے کھا جانے والے انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں۔ بھلا زمین اور آسمان کا کیا مقابلہ ہوسکتا ہے۔'' وہ بھی چبا چبا کر بولی۔

''اوہ۔ کم آن یار۔ یہ کیا تم دونوں ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف محاذ گرم کیے رکھتے ہو۔ کوئی پروگرام ہو کہیں جانا ہو' تم دونوں کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ چلو بس سب فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ ہمارا موڈ آف نہ ہو جائے۔'' وقاص نے اپنا موڈ آف ہونے کی دھمکی دی۔ جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

''تو بھیا۔ ہم لوگ تیار ہو جائیں؟'' کرن نے حیدر کو دیکھا۔

''ہاں' ذرا جلدی تیار ہو جاؤ۔''

شفق کا قطعی موڈ نہیں ہو رہا تھا جانے کا۔ مگر کچھ لوگوں کی خوشی کے لیے جن میں کرن بھی شامل تھی' تیار ہو گئی۔ راستے بھر یہ سب خوب ہا ہو کرتے رہتے۔ گانے بھی گاتے رہے۔ موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔

گہرے مٹیالے بادل لگ رہا تھا ابھی برس پڑیں گے۔ سب سے زیادہ شوخ حیدر تھا۔ سب تالیاں بجا رہے تھے اور حیدر گا رہا تھا۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ لگتا تھا باقاعدہ اس نے موسیقی کی تربیت حاصل کی ہے۔ اتنا ٹھہراؤ تھا اس آواز میں۔

''شفق۔ تم بھی ہنسا بولا کرو۔'' زندگی کے اتنے خوبصورت لمحوں کی تتلی سے اس کا ہر رنگ چرا لینا چاہیے۔''

اس نے چپ بیٹھی باہر۔ کا نظارہ کرتی شفق کو دیکھ کر کہا۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے!
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

اس سے پہلے کہ شفق بولتی' حیدر نے اسے دیکھتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ تو وہ راکھ ہو گئی۔

''زندہ دلی اگر بلند و بانگ کھوکھلے قہقہوں اور اوٹ پٹانگ پاگلوں والی حرکتوں کا نام ہے تو مجھے ایسی زندہ دلی قطعی نہیں چاہیے۔''

''شفق۔ تم ہر وقت انگارے ہی چباتی رہتی ہو۔'' ارم نے منہ بنا کر شفق کو دیکھا۔

''اور تم دونوں کے منہ سے تو گویا پھول جھڑتے ہیں نا۔'' شفق بھی مزاحمتی قوت سے ماالا

مال تھی۔

''مخبوط الحواس صاحبہ۔ زبان پر تو بڑا عبور حاصل ہے آپ کو۔ یار اسی لیے کہا تھا کہ میرے ناپسندیدہ لوگوں کو نہ لے کر چلو' ماحول خراب ہوگا۔'' حیدر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس تذلیل پر شفق کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے۔ حد ہوتی برداشت کی بھی۔

''وقاص پلیز۔ گاڑی روکو میں نہیں جا سکتی تم لوگوں کے ساتھ' یہیں اتار دو مجھے۔'' وہ بمشکل اپنی بھیگتی آواز پر قابو پاتی ہوئی سختی سے بولی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

وقاص نے نہ جانے کیا سوچ کر بریک لگائے اور گاڑی سائیڈ میں کر کے روک دی۔

''وہاں۔'' اسد کا بہت ہی موڈ آف ہو گیا تھا باقی سب کے بھی منہ بن گئے۔

حیدر نے باری باری سب کو دیکھا اور زندگی سے بھرپور اس کا بلند قہقہہ گاڑی کی گھٹی گھٹی فضاء کو خوشگوار کر گیا۔

''یار۔ ایک دم گاؤدی ہو تم سب۔ کیا ضرورت ہے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینے کی۔ چلو وقاص، گاڑی آگے بڑھاؤ اور کوئی اچھا سا لطیفہ سناؤ۔ تاکہ مابدولت کا موڈ ایک دم فریش ہو جائے۔''

''بالکل بالکل۔'' اس نے شوخ نگاہوں سے بیزار سی بیٹھی شفق کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہا مگر پھر سب کا خیال کر کے خاموش ہو گیا۔

''جی نہیں۔ چونکہ تم نے ہم سب کا موڈ آف کیا ہے لہٰذا آج بھی تم ہی کرو گے یعنی کہ تم ہی لطیفہ سنا کر ہنساؤ سب کو۔''

وقاص نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا سب کی طرف سے فیصلہ سنا دیا۔ چونکہ یہ سب کا فیصلہ تھا چنانچہ اس نے سب کو منانے کے لیے کتنے ہی مزیدار لطیفے سنائے کہ سب کے موڈ فریش ہو گئے۔ اس کے لطیفوں پر شفق بالکل خاموش ہونٹ بھینچے بیٹھی رہی۔ حیدر سب کچھ نوٹ کر رہا تھا۔ اس کی ایک ایک جنبش پر اس کی نظر تھی۔ ایسے لطیفے تھے کہ سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے مگر شفق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں آئی۔

''چچ۔ چچ۔'' حیدر نے اسے دیکھ کر کہا تو سب ڈر گئے کہ اب پھر ہنگامہ ہو گا۔ ایاز نے فوراً کہا کہ اب میں لطیفہ سناؤں گا۔ پھر اس نے اچھا سا لطیفہ سنایا تو سب ہنس پڑے۔ شفق بھی خوب ہنسی مگر حیدر نے رونی صورت بنالی۔

''کیوں کیسا تھا؟'' ایاز نے پوچھا۔

''یار ہنسی نہیں آئی، ورنہ بہت ہنستا۔''

اس کی ہر بات ہی نرالی تھی۔ بقول وقاص کے تم وہ اونٹ ہو جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ سب کے متفقہ فیصلے کے بعد یہ لوگ کلفٹن کے ساحل پر آ گئے۔ کافی لوگ تھے وہاں۔

''یار۔ یہاں موسم کچھ زیادہ ہی حسین ہو رہا ہے۔'' حیدر نے چند الٹرا ماڈرن لڑکیوں کے گروپ کو دیکھ کر کہا۔

''پٹو گے تم۔''

''ہاں بھیا۔ نہ ہی کریں کوئی حرکت کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔'' لڑکیوں نے بھی منع کیا۔

''احمق ہو تم سب۔ بھئی یہ حیدر رضا کے ساتھ زیادتی ہے کہ اتنے حسین موسم میں اتنے حسین لوگوں سے بات نہ کرے۔ تعارف نہ حاصل کرے۔

اور پھر سب ہی منع کرتے رہے گئے۔ مگر وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکیاں بھی اس بات سے باخبر تھیں کہ یہ شریر لڑکے ان کی طرف متوجہ ہیں اس لیے کچھ اور بننے لگیں۔

''ایکسکیوزمی جی۔'' وہ انتہائی وقار اور اخلاق سے بولا۔

''جی فرمائیے۔'' وہ سب اس کی طرف گھوم گئیں۔

آپ ٹی وی اسٹار مینا ہیں۔'' حیدر نے ایک پیاری سی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔'' زبان سے زیادہ اس کی پونی ہوا میں لہرانے لگی۔

''سوری جی، ویری سوری۔ اصل میں۔ میں مینا جی کا زبردست فین ہوں اور آپ تو ان کی گویا ہم شکل بہن معلوم ہوتی ہیں۔ میں سمجھا کہ آپ وہی ہیں لہٰذا سوچا آٹوگراف ہی لے لیا جائے۔'' وہ بالکل ایسے ہی بن رہا تھا جیسے واقعی سچ کہہ رہا ہو اور اسے مینا جی ہی کی تلاش ہو اور وہ لڑکی اندر سے خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی کہ اس کی شکل اتنی خوبصورت ہیروئن سے مل رہی ہے۔

''شرط لگا لو یہ بندہ ادھڑ کر آئے گا۔ اس کا ایک ایک بخیہ کھل جانا ہے۔'' وقاص اسے دور سے باتیں کرتا یقین بھرے لہجے میں شرط لگا رہا تھا۔

''کوئی نہیں۔ ہمارے بھیا تو شہزادے ہیں۔ لڑکیاں تو ان سے بات کرنے کو خوش قسمتی تصور کرتی ہیں۔''

ارم نے اپنے خوبرو بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ جن لوگوں کا دماغی توازن بگڑ چکا ہوتا ہے۔'' شفق نے جل کر کہا تو ارم نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

''اچھا جی۔ میں ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں۔ دیکھیں صورتیں دھوکا بھی تو دے دیتی

ہیں نا۔ میں سمجھا کہ۔'' وہ پھر معذرت بھرے لہجے میں بولا۔

''ارے آپ تو خوامخواہ ہی پزل ہو رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں' غلط فہمی بھی تو ہو ہی جاتی ہے۔'' وہ لڑکی تو نہ بولی۔ غالباً وہ خود کو ہیروئن ہی سمجھنے لگی تھی۔ البتہ دوسری لڑکی متانت سے جواب دے رہی تھی۔

''اچھا تو ماشاء اللہ' آپ لوگ پڑھتی ہیں؟'' ان کی طرف سے نرمی کے مظاہرے پر وہ پھیلنے لگا۔

''جی پڑھتے ہیں۔'' اور پھر نہ صرف انہوں نے اپنے نام بتائے بلکہ سب کچھ بتا دیا حتیٰ کہ ایڈریس تک بتادیا اور وہ دل کی نوٹ بک پر نوٹ کرتا رہا۔

''قسم سے اب بندہ پٹا۔ لڑکی کے ہاتھ سینڈل کی طرف جا رہے ہیں۔''

''واقعی یار۔ معاملہ تو گڑبڑ ہے۔ ہمیں بھی تو چلنا چاہیے۔'' اسد فوراً ہی حیدر کی مدد کے لیے تیار ہو گیا۔

''قطعی نہیں۔ اپنے سر پر اتنے بال نہیں ہیں کہ حسینوں کی سینڈل کی نظر کیے جائیں۔''

دور سے ایک لڑکی جو اپنے سینڈل درست کرنے کے لیے جھکی تھی' وہ سمجھے کہ حیدر کی پٹائی ہونے لگی ہے۔ ارم اور کرن بھی پریشان دکھائی دینے لگی تھیں۔

''میرے خیال میں ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ شاید لڑکیاں' لڑکوں کا خیال کرلیں۔'' سامیہ وغیرہ تیار ہو گئیں۔

''آپ کافی پیئیں گے؟'' وہ لڑکیاں چونکہ خود کافی پی رہی تھیں اس لیے یہ اخلاقی اعتبار سے مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ اتنی اچھی پرسنیلٹی والا بندہ اتنے اخلاق سے بات کر رہا ہو اور اس کو کافی بھی پیش نہ کی جائے۔

''جی ضرور۔ کافی تو میری جان ہے۔ اگر فالتو ہو تو۔'' وہ مزید پھیل رہا تھا اور لڑکیوں سے کچھ فاصلے پر دری پر براجمان ہو کر مگ پر بنے مکی ماؤس کارٹون کو دیکھنے لگا۔

''یہ مکی ماؤس ہے۔'' ایک لڑکی شوخی سے بولی۔

''اچھا۔ میں سمجھا آپ کی تصویر ہے۔ میرا مطلب ہے آپ نے مائنڈ نہیں کیا۔''

حاضر جوابی تو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی مگر یہاں اسے کچھ برا محسوس ہوا۔ جانے لڑکی کیا سوچے گی۔

''آپ فکر نہ کریں۔ اس کے پاس مائنڈ نام کی کوئی چیز نہیں۔'' دوسری لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلیے پھر ٹھیک ہے۔'' حیدر شوخی سے مسکرایا۔ وہ لڑکی اچھا خاصا ظرف رکھتی تھی شاید اسی لیے دونوں کی بات پر مسکرا اٹھی تھی۔

''لگتا ہے بندے کا جادو چل ہی گیا ہے۔'' ایاز وغیرہ نے اسے یوں ان کے ساتھ بیٹھ کر کافی پیتے دیکھ کر کہا۔

''بدتمیزو۔ مجھے جانے دیتے تو اب میں بھی کافی کے مزے لے رہا ہوتا۔'' اسد اور وقاص کو واقعی افسوس ہو رہا تھا۔

''جی نہیں بات پرسینلٹی کی ہوتی ہے۔ ہرا یرا غیرا تو کافی نہیں پی سکتا' ارم' کرن جو اب تک کسی ممکنہ واردات سے سہمی ہوئی تھیں اب اترا کر کہہ رہی تھیں۔

''آ۔ آپ۔'' گرم اور تلخ کافی حیدر کے حلق میں اٹک کر رہ گئی اور آنکھیں پھیل گئیں اور نگاہیں آنٹی پر جم گئیں جو دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''آپ۔ آنٹی۔ اسلام علیکم۔ کک۔ کیسے مزاج ہیں؟''

''آہ۔ میں مرگئی۔ میرا پاؤں۔'' بے دھیانی میں حیدر نے لڑکی کا پاؤں کچل ڈالا۔

''صاحبزادے۔ میرے مزاج بحال ہیں۔ میں تمہارے مزاج پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم میری بیٹی اور اس کی دوستوں کے پاس کیا کر رہے ہو؟'' آنٹی آہستہ سے حیدر کے قریب آتی ہوئی بولیں۔

''جی میں۔ کچھ نہیں۔ اوہ ہاں ہم ذرا محبت پر بحث کر رہے تھے کہ آج کل کے چھچھورے لڑکے خوامخواہ ہی کوئی بہانہ بنا کر لڑکیوں سے لفٹ لینے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر بات محبت پر پہنچ جاتی ہے کیوں مس؟'' حیدر نے بوکھلاہٹ میں آنٹی کی بیٹی ہی سے پوچھا جو اپنی ماں کے آجانے سے خاصی نروس لگ رہی تھی۔

''جی نہیں۔ ہم سیاست پر بحث کر رہے تھے۔''

''اوہو۔ ہاہاہا۔ لو بھلا' میں بھی کیا کہہ بیٹھا ہوں آنٹی' ہم سیاست پر بحث کر رہے تھے بس آنٹی ہمارے ملک کی سیاست کی ناؤ بھی بس طوفان میں گھری ہے۔ خدا ہی پار لگانے والا ہے وہ پل بھر میں سیاست کے لیے پریشان ہو گیا۔ لڑکیاں اس خوبرو سے رنگ بدلتے لڑکے کو دیکھ دیکھ کر اپنی ہنسی کو ہونٹوں کی سرحد میں بمشکل مقید کر رہی تھیں۔

''سیاست کی ناؤ آر لگے یا پار۔ تم یہاں لڑکیوں کے پاس آئے کیوں؟'' آنٹی اپنی بساط سے زیادہ غصے میں آگئیں۔

''وہ۔ وہ۔ جی لڑکیوں کو ایک پاگل تنگ کرنے آ گیا تھا اسے بھگانے آ گیا تھا میں تو۔''

''تم سے بڑا پاگل تو نہیں ہو گا وہ۔'' آنٹی کی برجستگی کو وہ دل میں داد دیتا کان کھجا کر رہ گیا۔

''ارے ہٹیے بھی آنٹی' آپ تو بہت مخولیا ہیں۔'' وہ فری ہوتا ہوا بولا۔

''بکومت۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں تم جیسے اوباش لڑکوں کو اچھی طرح

جانتی ہوں۔ اب آنٹی نے باقاعدہ لیکچر دینا شروع کر دیا تو وہ پیچھے ہاتھ باندھ کر جھک کر کھڑ ہو کر غور سے سننے لگا۔ گویا اس کے بعد وہ ایسا نہیں کرے گا۔ دوسرا یہ کہ دوسرے لوگ یہ سمجھیں کہ بڑے کام کی باتیں ہو رہی ہیں۔

''لو بھئی کرن ارم۔ آپ لوگوں کا شہزادہ بھائی تو پٹنے کو تیار ہے۔''

''بھئی۔ میں تو اس بندے سے رشتہ داری ظاہر نہیں کروں گا۔''

''تم رشتہ داری کی بات کرتے ہو۔ میں تو محلے داری بھی ظاہر نہیں کروں گا۔ بھئی ہم ا عزت دار لوگ ہیں۔'' وقاص نے اپنا کالر درست کیا۔

''جی میں سب جانتی ہوں۔ اس روز جو آپ نے پڑوس والی نئی لڑکی کا ہاتھ پردے کے پیچھے سے پکڑا تھا۔ اور وہ ہاتھ لڑکی کا نہیں اس کی اماں کا تھا جو انہوں نے آپ کی حالت کی تھ وہ بھول گئے ہیں کیا؟'' کرن بھلا اپنے بھیا کے بارے میں کوئی بات کیوں کر سنتی۔

''ضرورت بھی کیا تھی اس غیر اخلاقی حرکت کی۔'' شفق نے منہ بنا کر کہا۔

''آپ خاموش رہیں مس اخلاقیات۔'' کرن نے گھور کر شفق کو دیکھا۔

''یار۔ ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے تم خواتین کبھی کسی مسئلے کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔'' یہ سوچ کہ اب کیا کرنا ہے۔ آنٹی تو بہت غصے میں ہیں۔''

''توبہ۔ مجھے کتنی شرم آئے گی اگر مس کو پتا چل گیا کہ آپ لوگ میرے بھائی ہیں اور حید بھیا نے تو حد کر دی۔'' نائمہ کو بس ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

''باپ رے۔ آنٹی کا ہاتھ اٹھا۔ ہوا میں لہرایا۔ اور۔ او۔ ناظرین جیسا کہ آپ نے دیکھ آنٹی کا ہاتھ لہرایا۔ اور ناک پر بیٹھی مکھی کو اڑاتا ہوا واپس اپنی پوزیشن پر جا رکا۔ اور ناظرین حید رضا صاحب جو کہ ناک آؤٹ ہو چکے ہیں سر جھکائے کھڑے ہیں اور آنٹی ان کے سار پول لڑکیوں کے سامنے کھول رہی ہیں تاکہ وہ آئندہ کم از کم ان لڑکیوں کو نہ چھیڑیں۔ اور یہ ک ناظرین۔ ایک لڑکی اٹھی۔ اس نے حیدر صاحب کو دھکا دیا۔ نہ تو یہ دھکا کیوں دے رہی ہیں بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ وہاں دھکا دھکا تو نہیں کھیلا جا رہا۔ خیر ناظرین۔''

''چپ کرو یار۔ حالات لگتا ہے بگڑ گئے ہیں۔'' احمر نے مسلسل بولتے یاسر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ بھی کیا ہوا۔ میں جا رہی ہوں۔'' ارم اور کرن دونوں بھائی کی مدد کو لپکیں۔

''کیا غضب کرتی ہو لڑکیو۔ یہ جو ڈھائی آنے کی عزت رہ گئی ہے۔ تم لوگ جا کر اسے گنواؤ۔'' ایاز نے بڑھ کر ان دونوں کا راستہ روک لیا۔

''اس بار میں تمہیں پھر معاف کرتی ہوں۔ مگر آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا سمجھے۔'' آنٹی زور سے چلائیں۔

''جی۔ سمجھ گیا۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

''کیا سمجھے ہو؟'' وہ آنٹی بھی تو جان کو آ گئی تھیں۔

''یہی کہ آپ سے بُرا کوئی ہے نہیں۔'' وہ اس انداز سے ہنستا ہوا آہستگی سے پیچھے ہٹ رہا تھا تاکہ ان لوگوں کو یہ تاثر دے سکے کہ بڑے خوشگوار انداز میں باتیں ہو رہی ہیں۔

''اور یہ واپس کرتے جاؤ۔'' آنٹی نے مگ کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ یہ اچھا۔ آنٹی یہ آپ کا کارٹون۔ میرا مطلب ہے آپ کا مگ۔ یہ لیجئے شکریہ۔ بہت بہت شکریہ آنٹی۔ اور باجیو اسلام علیکم۔'' وہ مسکرا کر سب کو دیکھتا ہوا دل میں خدا کا شکر ادا کرتا کہ شکر ہے آنٹی نے ایک دو ہاتھ جڑ کر بھرے بازار میں رُسوا نہیں کر دیا اب وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیٹی پر شوخ سی دھن بجاتا ان کے قریب آ گیا۔

''ہیلو۔ ہیلو۔ کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے مسکرا کر سب کو دیکھا۔

''ہوں۔ تو ہو گئی دوستی لڑکیوں سے؟'' وقاص نے شوخی سے پوچھا۔

''ہاں تو اس میں کیا مشکل بات تھی۔ ہاں وہ وقاص' آنٹی بھی تھیں' دیکھا ہو گا۔ یار' وہ تو بے حد اچھے اخلاق کی مالک ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ بہت تعریف کر رہی تھیں۔ کہ کتنا خوبرو جوان ہے اور پھر اپنی بیٹی اور اس کی دوستوں سے تعارف کرایا۔'' وہ خوب بارہ مسالے لگا کر ڈینگیں مار رہا تھا۔

''اوہو۔ اچھا تو وہ تم نے سلام کیا تھا جب لڑکی نے دھکا مار کر جواب دیا تھا کہ تم گرتے گرتے بچے تھے۔'' وہ لوگ کب بخشنے والے تھے بھلا۔

''ہاں۔ وہ دھکا تھوڑی تھا۔ محبت کا اظہار تھا۔ لڑکی کہہ رہی تھی آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو تمہارا خون پی جاؤں گی۔ بھائی جان' وقاص نے منہ بگاڑ کر کہا تو سب کو ہنسی آ گئی۔

''کہیں اس نے سب کچھ سن تو نہیں لیا۔'' حیدر نے پریشانی سے سوچا۔

''اوہو۔ بھائی جان۔ بھائی جان۔'' سب لڑکے ہم آواز بولنے لگے۔

''ہاں۔ میں بھائی جان ہوں نا ارم' کرن کا'' وہ بھی ڈھٹائی سے بولا۔

''اچھا۔ تو اور کیا کیا کہا آنٹی اور ان نازنینوں نے۔'' ''بس یار کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔ دیکھ نہیں رہے تھے راجہ اندر بنا ہوا تھا۔''

''جانے کیوں اسے خود پر اس قدر گھمنڈ ہے۔'' وہ شیخیاں بگھار رہا تھا اور شفق دور کھڑی اسے ناگواری سے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

''ہاں تو اب کیا پروگرام ہے' کیوں لڑکیو' کہیں جانا ہے؟'' وہ ایڑیوں پر گھوم کر لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''کہیں نہیں جانا۔ بادل زیادہ گہرے ہو گئے ہیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب واپس چلنا

چاہیے۔‘‘

شفق نے آسمان کے طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں لگ رہا تھا بادل ابھی برس پڑیں گے۔ حیدر نے تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

’’آپ کو رکنے کے لیے کسی نے دعوت نہیں دی۔ آپ جاسکتی ہیں۔‘‘

’’میں جا بھی سکتی ہوں۔ میں اس کمپنی میں آنا بھی نہیں چاہتی‘ جہاں تم موجود ہو‘‘ شفق بھی سختی سے بولی اور بیگ شانے پر لہراتی ہوئی آگے بڑھی۔

’’یار۔ دل چاہتا ہے قتل کردوں۔ تم دونوں کو۔ ہر وقت محاذ گرم رکھتے ہو ایک دوسرے کے خلاف۔ حد ہوگئی بھئی۔ چلو ادھر شفق۔‘‘ وقاص کو ان دونوں پر غصہ آگیا۔

’’نہیں وقاص۔ میں جاسکتی ہوں۔ بس دو بسیں بدلنی ہیں۔ پتا ہے مجھے۔ بس میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ میں بہت بور ہورہی ہوں اور نہ ہی مزید کہیں جانے کا موڈ ہو رہا ہے۔‘‘ وہ بے نیازی سے بول رہی تھی۔

’’ہاں۔ ان کے موڈ کے تو پابند ہیں نا سب‘ ان کا موڈ ہو تو کچھ کہا جائے‘ نہ ہو تو بس ان کی طرح منہ بسورے بیٹھے رہو۔ جانے دو اسے وقاص۔‘‘

’’جو جی میں آئے کرو۔ تم دونوں کو کون سمجھائے۔ ایک سیر ہے تو دوسرا سوا سیر۔‘‘ وقاص بھی منہ بنا کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔

’’دیکھو شفق۔ ہم سب ساتھ ہیں۔ پھر کس بات کی پریشانی ہے‘ گھر تو جانا ہی ہے نا۔ یوں نہیں کریں کہ ایک دو جگہ اور گھوم کر گھر چلیں۔‘‘ یاسر نے نرمی سے شفق کو سمجھایا تو وہ خاموش ہوگئی۔

’’ایسی باتوں سے اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی توجہ حاصل کی جائے۔‘‘

حیدر نے اسے ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھا اور آگے بڑھ گیا شفق کوئی سخت جواب دیتے ہوئے رک گئی کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ سب افسردہ ہوگئے ہیں کچھ دیر قبل سب خوش تھے پھر اس نے دل میں عہد کرلیا کہ آئندہ وہ ان کے ساتھ کہیں نہیں آئے جائے گی۔ نہ تو وہ اپنی فطرت بدل سکتی تھی کہ حیدر تو تھا ہی پیدائشی بدتمیز اور اوّل درجے کا ضدی۔

اسے پتا چل گیا تھا کہ شفق بور ہورہی ہے اس لیے وہ زیادہ دیر لگا رہا تھا۔ اب گاڑی وہ خود ڈرائیو کررہا تھا۔ اور جہاں جی چاہتا لے جاتا۔ باقی سب تو انجوائے کررہے تھے مگر شفق کڑھ رہی تھی۔ اسے نوٹس تیار کرنے تھے کیونکہ اگلے روز دکھانے تھے اور ان ہی سے ٹیسٹ بھی تھا مگر یہاں ہی اتنی دیر ہوگئی تو کام کیسے ہوتا۔

’’بھئی سب اپنی اپنی جیبیں ڈھیلی کریں‘ چائنیز جانا ہے۔‘‘ حیدر نے گیئر بدلتے ہوئے تھوڑا سا مڑ کر سب کو کہا تو کن آنکھوں سے بے زار بیٹھی شفق کو بھی دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔

’’کیوں لڑکیو کتنے پیسے ہیں؟‘‘ ایاز نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

’’میرے بیگ میں تو سوا روپیہ ہے۔‘‘ صائمہ نے وہ سوا روپیہ ایاز کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

’’اس کا اپنا صدقہ دے دو۔‘‘ آگئیں کہیں سے۔‘‘ ایاز نے چڑ کر وہ پیسے صائمہ کو واپس کردیئے۔

’’ہم اپنے بھائیوں کے ساتھ ہیں اور جب بھائی ساتھ ہوں تو بہنیں پیسے نہیں دیا کرتیں۔‘‘ کرن نے سیاسی پتہ پھینکا۔

’’چلو یار۔ پھر بھی سہی‘ اس وقت تو ہمارے پاس بھی اتنے نہیں کہ۔‘‘

’’اوہو۔ تم لوگ اتنے فقیر ہوگئے‘ اس کا اندازہ نہ تھا۔ خیر کیا یاد کرو گے۔ آج تم سب کو علاوہ ایک کے میری طرف سے دعوت۔‘‘ حیدر نے سامنے لگے آئینے میں شفق کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مگر اس نے بڑے ضبط سے یہ ظاہر کیا گویا اس نے سنا ہی نہیں۔

’’کیا۔ کیا۔ کیا کہا تم نے؟ یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟‘‘ سب نے حیرانگی سے حیدر کی طرف دیکھا جو دھیرے دھیرے کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔

’’یہ آج تمہیں حاتم طائی بننے کا خیال کیسے آگیا۔‘‘ یاسر نے بے یقینی سے حیدر کو دیکھا۔

’’بھئی کیا کروں۔ آخر رشتہ داری بھی تو نبھانی ہوتی ہے نا۔‘‘ وہ مسکراتا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

’’اوہو۔ تو کیا رشتہ۔ ہے حاتم طائی سے؟‘‘

’’انسانیت کا۔‘‘ وہ موڑ کاٹتا ہوا بولا۔

’’اچھا ہے‘ تمہارے پاس انسانیت نام کی کوئی چیز؟‘‘ شفق نے بڑے کٹیلے لہجے میں براہِ راست حیدر کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

’’اب اگر میں نے کچھ کہہ دیا تو چلتی گاڑی سے چھلانگ لگادو گی اور ایک سڑیل ہری مرچ کا خون میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا لہٰذا معاف کیا۔ کیا یاد کرو گی۔ اور نہیں تو اعلیٰ ظرفی تو یاد کرو گی نا؟‘‘

پھر اس نے انگلیوں میں دبائے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور سیدھا ہوگیا۔

’’چلو بھئی آؤ۔ آگیا چائنیز‘‘ حیدر نے ایک چھوٹے سے فٹ پاتھی قہوہ ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی تو سب چیخ پڑے۔

’’یہ۔ یہ چائنیز ہے۔‘‘

’’ہاں بھئی۔ سو روپے میں ایسے چائنیز میں جایا جاسکتا ہے ویسے بھی ٹھنڈ ہورہی ہے اور چائے کی طلب شدید ہورہی ہے لہٰذا آپ لوگ فی الحال اسی چائنیز پر گزارہ کریں پھر۔‘‘

"پھر کنجوس کہیں گے۔"

"قسم لے لو یہیں کا ہوں۔" حیدر نے مڑ کر ارم اور نائمہ کو دیکھا جو منہ بنائے کھڑی تھیں۔

"وقاص میں چائے صرف اس شرط پر پیوں گی کہ تم اپنے پیسوں سے میرے لیے چائے لاؤ۔"

شفق نے آہستگی سے کہا تھا مگر حیدر کے کانوں کی باریک تہہ تک اس کی آواز پہنچ چکی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن خیال رکھنا حیدر کو خبر نہ ہو ہنگامہ کر دے گا۔"

وقاص اسے کہہ کر گیا اور اپنے پیسوں سے چائے لا کر شفق کو دی اور خود ایاز' یاسر کی طرف بڑھ گیا۔

"اتنے بے خبر تو ہم نہیں۔ یہ میری توہین ہے اور اپنی توہین کی کم از کم تمہیں میں اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ چائے نہیں' یہ چائے پیو گی میرے ذاتی پیسوں کی۔"

حیدر نے وہ چائے جو وقاص اسے دے گیا تھا' پانی والے جگ میں انڈیل دی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا کپ شفق کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شفق نے پہلے تو اسے گھورا۔ اور پھر وہ چائے بھی اس نے اسی جگ میں انڈیل دی اور حیدر کے اٹھنے سے قبل اٹھ کر گاڑی میں جا بیٹھی حیدر بھی جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گیا۔

"کہاں رہ گئے یہ بچے۔ آج کوئی موسم تھا گھر سے نکلنے کا اور وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ۔ جانے کب آندھی طوفان شروع ہو جائے۔ تم سے اجازت لی تھی حیدر نے۔" رضا شیریں کو دیکھتے ہوئے بولے جواب یہ سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دیں۔ حیدر ان کو کسی قابل سمجھتا ہی کب ہے۔

"شیریں۔ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

"ہاں۔ جی سب بچوں کا پروگرام بن گیا تھا اور پھر جب گھر میں مجھ سے بڑے موجود ہیں تو اجازت کا حق بھی وہی رکھتے ہیں۔ ویسے بھی حیدر نے پوچھا تھا مجھ سے۔" وہ ابھرتی ہوئی دکھ کی لہروں کو دباتی ہوئی بولیں اور باہر آ گئیں۔ اس وقت وہ سب بھی آ گئے۔ سب سے آگے حیدر تھا شیریں وہیں رک گئیں۔

بیٹے۔ اتنی دیر۔ تمہارے پپا کتنی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔ رات کے نو بجنے والے ہیں۔" وہ نرمی سے بولتی رہیں مگر وہ انجان بنا کھڑا رہا۔

"بس یا مزید کچھ کہنا ہے آپ کو۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے پیش آتا تھا شیریں سے۔

"نہیں بیٹا۔ کیا کہنا ہے۔ تم لڑکوں کی تو خیر ہوتی ہے مگر بیٹا لڑکیوں کی زیادہ فکر ہوتی

ہے۔"

"لڑکیاں ہمارے ساتھ گئی تھیں۔ اکیلی نہیں کہ آپ کو فکر لاحق ہوئی اور ویسے بھی آپ کو صرف ایک لڑکی کی پروا کرنی چاہیے نہ کہ لڑکیوں کی۔" وہ مسلسل انگارے چبا رہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا تم لوگ بہنوں کے ساتھ تھے لیکن۔ اگر بارش ہو جاتی تو۔" شیریں اس کی ان تمام بدتمیزیوں کی عادی تھیں اور وہ ہمیشہ اس کی ایسی بدتمیزی اور ہٹ دھرمی کے جواب میں بے حد نرمی سے پیش آتیں۔

"تو کیا لڑکیاں نمک تھیں کہ پگھل کر غائب ہو جاتیں؟" اس کی ہر بات' ہر منطق ہی نرالی تھی۔

سوری چچی جان۔ ہمیں واقعی اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی۔" وقاص اور یاسر آگے بڑھے اور ایاز' حیدر کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دروازے کے اس پار کھڑے رضا نے حیدر کی تمام بدتمیزی سن لی تھی اور ان کی گرفت دروازے کے ہینڈل پر اتنی سخت ہو گئی کہ خون رسنے لگا۔

کھانے کے بعد انہوں نے حیدر کو اپنے کمرے میں آنے کو کہا تو حیدر نے عجیب سے نگاہوں سے شیریں کو دیکھا اور کھانا درمیان میں چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"جی پپا۔" اب وہ انتہائی سنجیدہ سا سر جھکائے کھڑا تھا۔ رضا نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

"مجھے پڑھنا ہے۔ آپ بات کریں۔" وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ رضا کو غصہ تو اس قدر تھا کہ وہ اسے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر جانتے تھے۔ ان کا کچھ بھی کہا ہوا شیریں کو بھگتنا پڑے گا۔ جو قطعی بے قصور ہے۔

"دیکھو بیٹا۔ اب تم سمجھ دار ہو۔ میں کوئی لیکچر نہیں دینا چاہتا مگر صرف یہ کہوں گا کہ شیریں تمہاری۔"

"وہ صرف آپ کی بیوی ہیں پپا۔ ہماری ماں نہیں۔" رضا کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی حیدر بولا تو مارے غصے کے رضا کی طنابیں کھنچنے لگیں۔

"شٹ اپ۔ اینڈ ناؤ گیٹ لاسٹ۔" وہ پوری قوت سے بولے تو حیدر فوراً باہر نکل گیا۔

کاریڈور میں اس کی مڈبھیڑ شیریں سے ہوئی۔ حیدر ان کو خونخوار نگاہوں سے گھورنے لگا۔

"کیا بات ہے حیدر۔ رضا کیوں چلا رہے ہیں؟"

"جائیے۔ اور جا کر پوچھ لیجیے۔ اور بھریں انکے کان ان ہی کی اولاد کے خلاف۔ اس کے علاوہ آپ کا کام ہی کیا ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولتا آگے بڑھ گیا تو شیریں دل ستم زدہ کو

تھامتی رضا کے پاس آ گئیں۔ جو کھلی کتاب پر گہری سانسیں لے رہے تھے۔ شیریں پریشانی سے ان کی طرف بڑھیں رضا پسینے سے شرابور تھے۔

''رضا۔ رضا' کیا بات ہے؟''

''چلی جاؤ یہاں سے۔ نہیں ضرورت مجھے کسی کی۔ نہ کسی بیوی کی۔ نہ بچوں کی۔ اگر میری قسمت میں سکون ہی نہیں' خوشی ہی نہیں تو مجھے بھی کسی رشتے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ میں کہتا ہوں جاؤ نکل جاؤ۔ میرے کمرے سے اور اکیلے ہی مجھے اپنا ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے دو۔ جاؤ۔'' رضا زور سے بولے تو شیریں تڑپتے دل کے ساتھ باہر آ گئیں۔

رضا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر دروازے کے باہر کھڑی رہیں۔ برداشت نہ ہو سکا تو اندر آ گئیں۔ رضا بہت تکلیف میں تھے۔ انہوں نے بڑھ کر ان کو لٹا دیا۔ پانی دیا مگر ان کی طبیعت بحال نہ ہوئی۔

''شفق جلدی جاؤ ضیاء بھائی کو بلاؤ۔ وقاص کو کہو ڈاکٹر کو لے آئے۔'' مارے گھبراہٹ کے شیریں کی آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔ پل بھر میں سارا گھر جمع ہو گیا وقاص فوراً ہی ڈاکٹر کو لے آیا۔

''مسز رضا۔ ان کے لیے سکون بہت ضروری ہے جس قدر ممکن ہو ان کو خوش رکھا جائے ذہنی الجھن نہیں ہونی چاہیے فی الحال تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن بہر حال احتیاط بہت ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نے رضا کو انجکشن لگاتے ہوئے شیریں اور دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔

اس تمام عرصے پر حیدر بس خاموشی سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے' جن کو پڑھنا مشکل تھا۔

''حیدر بیٹے۔ لگتا ہے آپ پپا کا خیال نہیں رکھتے۔ بیٹے بہت عزت کیا کرو اور بہت خیال رکھا کرو ان کا۔ کیونکہ ان کو بے حد ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر کریم حیدر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''انکل آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ میں پپا کا خیال نہیں رکھتا۔ ان کو تنگ کرتا ہوں۔'' حیدر نے چبھتی نگاہوں سے شیریں کو دیکھا جو ہولے ہولے رضا کے پاؤں دبا رہی تھیں۔

''کسی نے بھی نہیں۔ بس ویسے ہی میں تنبیہاً کہہ رہا تھا۔ خیر فکر کی کوئی ضرورت نہیں فی الحال انجکشن کے باعث سوئیں گے۔ اٹھیں' تو مسز رضا' کوئی ہلکی سی غذا ان کو دے دیجئے گا۔ اور وقاص میاں' جیسے لے کر آئے تھے ویسے چھوڑ بھی آؤ۔'' ڈاکٹر کریم نے مسکرا کر سب کو خدا حافظ کہا تو وقاص ان کا بکس لے کر باہر آ گیا۔

رضا کی طبیعت کی وجہ سے سب گھر والے ہی گھبرا گئے تھے۔ سب ان کے کمرے میں جمع

تھے۔

''چلو بھی سب' اب آرام کرنے دو رضا کو۔ شیریں جیسے ہی رضا جاگے' مجھے ضرور بلانا۔ آخر ایسی کون سی پریشانیاں اس نے پال لی ہیں کہ۔ خیر اللہ تعالیٰ اسے صحت دے۔ یاد سے بلانا'' ضیاء اٹھتے ہوئے بولے۔

''جی بہتر بھائی جان۔'' شیریں آہستگی سے بولی۔

''ارم کرن۔ جاؤ بیٹے' اب آرام کرو۔ پپا ٹھیک ہیں تمہارے۔ میں جو ہوں پریشان ہونے کے لیے' تم لوگ کیوں فکر کرتے ہو۔ جاؤ شاباش حیدر! کیا سوچ رہے ہو؟ جاؤ بیٹا جا کر آرام کرو۔'' شیریں نے ارم کرن کو پیار سے ساتھ لگا کر شفق کے ساتھ باہر بھیجا اور پھر حیدر کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا مگر اس نے غصے سے ہاتھ جھٹک دیا۔

''آپ جا کر آرام کیجیے۔ میں خود پپا کے پاس ٹھہروں گا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

''ضد نہیں کرتے بیٹا۔ تم تھکے ہوئے ہو سارا دن بھی گھومتے رہے ہو۔''

''ہاں یہ ہی تو دکھ کھائے جا رہا ہے نا آپ کو کہ ہم ہنستے بولتے کیوں ہیں۔ اور تو اور ڈاکٹر صاحب کو بھی بتا دیا کہ میں پپا کو تنگ کرتا ہوں۔ میں ان کی بیماری کا باعث ہوں۔ ہمیں پپا سے دور کرتی جا رہی ہیں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں' ہم کچھ نہیں سمجھتے۔'' اس کی آواز پہلے تو آہستہ تھی' پھر بلند ہوتی گئی۔

''حیدر۔ حیدر بیٹے' آہستہ بولو۔ جو جی میں آئے۔ مجھے کہو۔ نصیب جو بُرے لکھوائے ہیں میں نے۔ مگر اپنے پپا کا تو خیال کرو۔ اچھا تم بیٹھو ان کے پاس۔ میں ہی چلی جاتی ہوں۔'' شیریں اپنے آنسوؤں پر بمشکل قابو پاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ حیدر الجھا ہوا پپا کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''آئی ایم سوری پپا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھے۔ مگر۔ مگر پپا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے مجھے اس عورت سے کس قدر نفرت ہے مگر اس بدنصیبی کا کیا کیا جائے کہ جس سے مجھے نفرت ہے' آپ کو اس سے محبت ہے۔ نہ آپ اس سے نفرت کر سکتے ہیں اور نہ میں اس سے محبت کر سکتا ہوں۔ اور نہ ہم دونوں ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔''

رضا بے سدھ پڑے تھے اور حیدر ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے آہستگی سے بولے جا رہا تھا۔ پھر وہ اخبار لے کر ان کے قریب ہی بیٹھا رہا کہ جانے کب ان کی آنکھ کھل جائے یا وہ پانی مانگیں نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ بار بار اسے نیند کے جھونکے آ رہے تھے۔ وہ کبھی ادھر لڑھک جاتا اور کبھی ادھر۔ شیریں کئی بار جھانک چکی تھیں۔ جانے کیوں ان کو حیدر پر غصے کی بجائے پیار آ رہا تھا۔

''حیدر۔ حیدر بیٹے' جاؤ سو جاؤ۔ نیند کو اتنا خراب نہیں کرتے۔'' انہوں نے حیدر کا شانہ ہلا کر اسے جگایا تو وہ نیند سے بوجھل نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگا۔

''میری نیند کا جو آپ کو خیال ہے' وہ میں جانتا ہوں۔ ہاں اگر آپ چاہتی ہیں کہ پپا ہوش میں آ کر پہلے آپ ہی کو دیکھیں تو ایسا ہی سہی۔'' حیدر نے ایک سلگتا ہوا تیر شیریں کے دل میں اتارا اور باہر نکل گیا۔

شیریں دل تھام کر وہیں بیٹھ گئیں۔ کبھی کبھی تو ان کو اپنے ہی خلوص میں کوئی کمی' کوئی خامی نظر آتی کہ اسی وجہ سے وہ بچوں کا پیار نہیں حاصل کر سکیں۔ مگر اپنی ذات میں جھانکتیں' اپنے خلوص کو پرکھتیں تو خود کو بے قصور پاتیں تو پھر کیا وجہ تھیں کہ بچے ان سے متنفر تھے۔ وہ فیصلہ نہ کر پاتیں تو بہتر یہی سمجھتیں کہ خاموش ہی رہا جائے۔ وہ جانے سوچ کی کس وادی میں جانکلیں کہ رضا جاگنے لگے۔ وہ آنکھیں صاف کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''پانی۔'' رضا ابھی بھی نیند میں تھے۔ شیریں نے بڑھ کر پانی دیا۔

''یہ پانی۔ رضا کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''ہوں۔ ٹھیک ہوں۔ مگر ہوا کیا تھا مجھے؟'' رضا حیران کن نظروں سے شیریں کو دیکھ رہے تھے' وہ خاموش رہیں۔

''اوہ۔ میرے خدا۔'' پھر جیسے رضا کو سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ انہوں نے دکھ سے آنکھیں موند لیں۔

''رضا۔ کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتے ہیں۔ بس آپ ذہن کو خالی کر کے پرسکون ہو کر سو جائیں۔ وہ میرے بچے ہیں۔ ان کو حق ہے وہ جو چاہیں کریں۔ اور جو میں چاہوں کروں۔ آپ ناحق اثر لیتے ہیں۔'' شیریں نے اپنے شیریں لہجے میں رضا کے اندر اتری ہوئی تلخیوں کو کسی حد تک کم کیا۔

''حیدر کہاں ہے؟ میں نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا تھا۔ تم نہیں جانتیں شیریں' یہ حیدر میرے لیے کیا ہے۔'' رضا کو دکھ ہو رہا تھا کہ انہوں نے حیدر کو کیوں ڈانٹا۔

''میں جانتی ہوں رضا۔ اس وقت وہ سو گیا ہے۔ پتا ہے وہ بھی بہت ڈسٹرب رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو اٹھ کر یہاں سے گیا ہے۔ بس آپ آرام کریں۔'' شیریں نے ان کے اوپر کمبل درست کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں' اب تو نیند نہیں آئے گی۔ تم سو جاؤ۔ بہت تھکی ہوئی ہو۔'' رضا نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کچھ کھائیں گے رضا؟'' شیریں کو فوراً ڈاکٹر کی بات یاد آ گئی۔

''ہاں۔ کچھ ہو جائے تو بہتر ہے۔ بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن اب اتنی رات گئے

کہاں تکلیف کرو گی۔''

''تکلیف کی کیا بات ہے؟ ویسے بھی میں نے سوپ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ابھی گرم کر کے لے آتی ہوں۔''

شیریں اٹھ کر کچن میں آئیں۔ سوپ گرم کر کے ایک پیالے میں ڈالا اور دوبارہ رضا کے کمرے میں پہنچ گئیں۔

''آئی ایم سوری شیریں۔'' رضا نے سوپ لیتے ہوئے ندامت سے شیریں کو دیکھا۔

''کس بات پر رضا؟'' شیریں نے اس طرح حیرانی سے رضا کو دیکھا گویا کوئی بات نہ ہو گزری ہو۔

''مانتا ہوں' جانتا ہوں میں تمہاری اعلیٰ ظرفی کو شیریں مگر اب اتنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت بھی نہ دو کہ میں پاتال میں اترتا جاؤں۔'' رضا کا پور پور نادم تھا شیریں کے آگے۔

''پلیز رضا۔ خدا کے واسطے مت سوچا کریں ایسی باتیں۔ نہ میں فرشتہ ہوں اور نہ کوئی اتنی اعلیٰ ظرفی یہ ایک محض نارمل سا انسانی رویہ ہے اور اگر انسان انسانیت کا بھی ثبوت نہ دے تو انسان کیونکر کہلا سکتا ہے۔'' وہ اپنے شیریں لہجے کی حلاوت گھول رہی تھیں اور رضا خاموشی سے ان کو دیکھے جا رہے تھے۔

''شیریں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہجر' وصال سے زیادہ خوبصورت اور نشاط آگیں احساس لیے ہوتا ہے۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔'' شیریں نے حیرانی سے رضا کو دیکھا۔

''مطلب یہ ہے شیریں کہ میں سمجھتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ شادی کر کے اپنا ہی نقصان کیا ہے اس خوشی اور اس لذت' اس لطیف احساس کو خود ہی اپنے ہاتھوں مار دیا ہے۔ کتنا حیات بخش ہوتا ہے میرے لیے یہ احساس کہ تم نے صرف میری خاطر شادی نہیں کی۔'' صرف میرے نام پر زندگی گزار رہی ہو۔'' رضا بہت بوجھل لہجے میں بول رہے تھے۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں۔ رضا۔ میں اب بھی تو آپ کے نام پر زندگی گزار رہی ہوں۔''

''ہاں شیریں۔ تم نے تو ہر بازی جیت لی ہے مگر۔ مگر میں نے تمہیں کیا دیا ہے سوائے دکھوں اور پریشانیوں کے۔ تمہیں خبر نہیں شیریں۔ میں تو ٹوٹنے لگتا ہوں اندر سے جب تم سے بچے بری طرح پیش آتے ہیں۔ کیوں کرتا ہے حیدر' کیوں نہیں سمجھ پاتا' وہ تمہیں کیوں غلط سمجھتا ہے' مجھے بھی۔ وہ نہیں کہ۔ کہ۔'' آرام سے باتیں کرتے کرتے رضا کی سانس پھر اکھڑنے لگی تو شیریں گھبرا گئیں۔

''رضا۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ سب ٹھیک ہے' یہ میرا اور بچوں کا معاملہ ہے جب میں کسی بات کو اہمیت نہیں دیتی تو آپ کیوں سوچتے ہیں؟ آپ کچھ فکر نہ کریں رضا' دیکھیے گا ایک دن

ایسا آئے گا کہ حیدر خود مجھے مما کہے گا' میں محبت سے اسے جیت لوں گی۔ انشاء اللہ۔ آپ فکر نہ کریں۔ آرام کریں۔'' شیریں نے جلدی سے ان پر کمبل درست کر کے انکولٹا دیا۔ رضا کی بیماری سے ارم' کرن بہت سہم گئی تھیں۔

''کرن۔ بُری بات ہے' روتے نہیں۔ دُعا کرو خدا ہمارے پپا کو صحت اور زندگی دے۔ رونے سے بدشگونی ہوتی ہے۔'' شفق نے کرن کے آنسو صاف کرتے ہوئے سمجھایا۔

''پتا بھی ہے یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے؟'' ارم شفق کو گھور رہی تھی۔

''بس خدا کی طرف سے ہوا ہے ارم' تم جاؤ یہاں سے'' کرن جانتی تھی کہ اب ارم آگے کیا کہنے والی ہے' اس لیے وہ جلدی سے بول پڑی۔

''آؤ کرن' پپا کے پاس چلیں۔'' پھر شفق اور کرن رضا کے کمرے میں آگئیں جو تازہ اخبار دیکھ رہے تھے۔

''ہم آجائیں پپا۔'' دونوں ایک ساتھ بولیں۔

''آؤ بھی' میں بھی کہوں۔ میری آنکھوں کی روشنی کیوں کم ہو رہی ہے۔ پتا چلا اپنی بیٹیوں کو نہیں دیکھا۔ ارم کہاں ہے۔'' رضا نے اخبار ایک طرف رکھ کر دونوں کو پیار سے دیکھا۔

''ارم ابھی آتی ہے۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے پپا؟'' اس بار وہ پھر دونوں ایک آواز میں بولیں۔

''بھئی جڑواں تو ارم اور کرن ہیں مگر ہم زبان' ہم آواز تم دونوں ہو۔ خیر خدا کا شکر ہے' بالکل ٹھیک ہوں اب'' رضا نے شگفتگی سے کہا۔

''پپا۔ لائیے میں آپ کے شانے دبا دوں'' شفق اٹھ کر رضا کے شانے دبانے لگی اور کرن پاؤں۔

''واہ۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹیاں بھی کیا چیز بنائی ہیں۔ کتنا سکون ہے ان کے ہاتھوں میں۔ لگتا ہے کوئی دکھ درد نہیں رہا۔'' رضا نے آنکھیں موند کر بڑے سکون سے کہا۔ اسی وقت حیدر اندر آگیا۔ اس نے پہلے خشمگیں نگاہوں سے شفق کو دیکھا مگر اس نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ رضا کے شانے دباتی رہی۔

''تم دونوں جاؤ۔ مجھے پپا سے بات کرنی ہے۔'' حیدر نے کرن اور شفق کو باہر جانے کو کہا تو رضا اسے دیکھنے لگے۔

''آؤ شفق۔'' کرن فوراً اٹھ گئی۔

''نہیں۔ میں تو دبا کر ہی جاؤں گی۔ پپا تیل ڈال دوں آپ کے سر میں۔'' وہ کسی بات کی پرواہ کیے بغیر پوچھ رہی تھی۔ حیدر کباب ہو رہا تھا۔

''ہاں چوری کھانے کے لیے مزدوری تو کرنی پڑتی ہے نا۔'' رضا بالکل نہیں سمجھے تھے کہ

اس کی اس بات کا کیا مطلب ہے مگر شفق خوب اچھی طرح سمجھ گئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''فکر کی پرواز کو ذرا بلند کرلو حیدر۔'' وہ پپا کے سامنے بس یہ ہی کہہ سکی۔

''مشورے کا شکریہ۔'' حیدر نے گھور کر اسے دیکھا۔

''حیدر بیٹے' کیا بات ہے؟ ناراضگی چل رہی ہے شفق سے کیا؟'' رضا نے ان دونوں میں تلخی کم کرنے کے لیے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں پپا۔ اس کے قابل بھی کوئی کوئی ہوتا ہے۔'' اس کا زہریلا تیر شفق کے دل میں پیوست ہو چکا تھا۔ کسک تو رضا نے بھی محسوس کی لیکن وہ خاموش رہے۔

''شفق۔ بیٹا تم جاؤ اچھی سی کافی بنا کر لاؤ۔'' وہ سمجھ گئی کہ رضا نے اسے کس لیے یہاں سے جانے کو کہا تھا۔ مگر وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی' وہ وہاں سے آگئی۔

''جی دھانسو میاں' یہ تم ہر کسی سے کیوں لڑتے رہتے ہو؟'' اس کے جانے کے بعد رضا نے حیدر کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم سوری پپا۔ اس رات مجھ سے گستاخی ہوگئی۔'' حیدر نے باقاعدہ ہاتھ باندھ کر معافی مانگی تو رضا نے جان سے عزیز بیٹے کو سینے سے لگالیا

''کوئی بات نہیں میری جان۔ لیکن انسان کو ان باتوں اور ان اعمال سے پرہیز ہی کرنا چاہیے جن سے دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہو۔'' رضا نے حیدر کو چھپے ہوئے الفاظ میں جو سمجھانا چاہا تھا اس کو وہ بخوبی سمجھ گیا تھا۔

صدیقہ بیگم کو رضا کی علالت کی خبر ملی تو وہ فوراً پہنچ گئی۔

''ہائے میں صدقے' میں قربان' میرا بھائی میرا چاند بیمار پڑ گیا اور کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بہنوں کو خبر ہی کر دے۔'' وہ رضا کو ساتھ لگا کر پیار کر رہی تھیں۔

''خدا نہ کرے آپی' ایسی کوئی بات نہیں تھی' کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ بس ذرا معمولی سی طبیعت خراب تھی۔ اب تو خدا کا احسان ہے۔'' شیریں کو صدیقہ کا یہ انداز قطعی پسند نہ آیا تھا۔

''ہاں' بات تو نہیں تھی تمہارے لیے' ہم بہنوں سے ذرا پوچھو کیسے کلیجے کو ہاتھ پڑا تھا جب حیدر نے بتایا تھا اس کے بارے میں۔''

''جی۔ جی آپی' مجھے پورا احساس ہے' آپ آرام سے بیٹھیں' میں اب خدا کے فضل اور آپ کی دُعاؤں سے بہتر ہوں' ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی' بچے ذرا گھبرا گئے تھے۔ اس لیے آپ کو بھی پریشان کر دیا۔'' رضا جلدی سے بول پڑے مبادا آپی اپنے عمدہ اخلاق کے پھولوں میں شیریں کو مزید راکھ نہ کر دیں۔

''اللہ سلامت رکھے' میرے چاند اپنا خیال رکھا کرو۔ ماشاء اللہ بچوں کی ذمہ داریاں ہیں

تم پر۔'' صدیقہ بیگم نے تیکھی نگاہوں سے شیریں کو دیکھا جو مہر بہ لب بیٹھی تھیں۔

''جی بہتر آپی۔ آپ سنائیں' اتنے دنوں بعد کیوں آئیں ہیں؟''

''ارے چھوڑو بھیا۔ بس یہ منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔ کبھی دونوں بھائیوں میں سے کسی کو اتنی توفیق ہوئی کہ خبر ہی کرلیں۔ جیتی ہے کہ مرتی ہے بہن' دروازے کے ساتھ ذرا دروازہ ہے مگر مجال ہے جو کبھی جھانک لیا ہو۔ ہاں یہ ساری بہاریں تو ماں باپ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ ہی نہ رہیں تو بھائی بھاوج کہاں پوچھتے ہیں۔''

صدیقہ بیگم سدا سے بھائی بھابیوں سے ناراض رہتیں۔ کبھی جو یہ لوگ چلے جاتے تو سیدھے منہ بات نہ کرتیں۔ شاہین بھابی سے پھر بھی بات کرلیتیں مگر شیریں سے تو ان کو اللہ واسطے کا بیر تھا وہ جاتیں تو جہاں بیٹھتیں وہاں سے اٹھ کر چل دیتیں۔ صدیقہ بیگم ملازم کے ہاتھ چائے پانی کا پوچھ لیتیں۔ تب ایسے میں شیریں دل میں ٹیسوں کو دبائے واپس آجاتیں۔ اور اب نہ آنے کا شکوہ کررہی ہیں۔ مگر شیریں کا ظرف اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ وہ منہ پر بات دے مارتیں۔ بس خاموشی سے سنتی رہی تھیں۔

''یہ لیجیے پپا۔ ہاف بوائل انڈا اور گرین ٹی۔ میں نے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔'' شفق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے جیتی رہے میری بیٹی۔ تمہارے خاص ہاتھوں کی بات ہی کیا ہے۔''

''شفق کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ پھپھو کو سلام کس نے کرنا ہے۔'' شیریں نے شفق کو سلام کرنے پر ٹوکا۔

''سوری۔ آداب پھپھو۔'' شفق نے فوراً آداب کہا مگر انہوں نے منہ بنا کر دوسری جانب کرلیا۔

''پھپھو تو میں جن کی ہوں۔ انہی کی ہوں۔ مگر یہ ارم' کرن کہاں ہیں؟ رضا' تمہاری خدمت کے واسطے ان کو ہونا چاہیے۔ کرن۔ ارم۔'' صدیقہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے شیریں اور شفق کو گھورا اور کرن' ارم کو آوازیں دیتی باہر نکل گئیں۔

''ارے میری پھپھو۔ پھپھو جان کب آئیں آپ؟'' حیدر صدیقہ بیگم کو دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

''جیتا رہے میرا چاند۔ کیسا ہے تو۔''

''بالکل رات جیسا۔ رات ہی تو آپ سے مل کر آیا ہوں۔''

''یہ ارم اور کرن کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں ہیں آپ کو کوئی کام ہے کیا؟''

''مجھے کیا کام ہونا ہے۔ باپ کے پاس نہیں رہ سکتیں۔ بس رضا کو تنہا چھوڑا ہوا ہے خ

بھانجی کے پاس۔ تاکہ وہ اسے اچھی طرح اپنے جال میں پھانس لیں اور قابض ہو جائیں ہر چیز پر۔ دیکھ لینا یہ عورت ساری جائداد کا وارث اس موئی شفق کو ہی بنوائے گی' اسی لیے تو دونوں رضا کے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ اس عورت نے کیسے قبضہ کیا ہے رضا پر اور پھر اکیلی نہیں آئی' بھانجی کو بھی اٹھا لائی۔''

''آپ فکر نہ کریں پھپھو' ان دونوں کو میں خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ دیکھتا ہوں میں بھی کہ یہ مسز رضا کیا کرتی ہیں۔ اور وہ تو چیونٹی ہے مسل کر رکھ دوں گا منٹوں میں۔ اور کرن' اشعر کی تو آپ بات ہی نہ کریں۔ دیوانے ہیں اپنی مما کے اور شفق کے۔ لیکن آخر کب تک۔ لے آؤں گا ان کو بھی لائن پر۔''

''بس بیٹا' اپنی ماں کی اس دشمن کو چین سے نہ بیٹھنے دینا۔ ارے سارا کیسی ہو بیٹی؟'' بات کرتے کرتے سارا سامنے آگئی تو صدیقہ اس کی طرف بڑھیں۔

''آداب۔ ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟ اور آپ پلیز مجھے بیٹی نہ کہا کریں۔ میں کوئی آپ کی بیٹی ہوں آپی جان۔'' سارا کا لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔

''بیٹی نہیں تو کیا چھوٹی بہن تو ہونا۔''

''چھوٹی بہن' چھوٹی بہن ہوتی ہے۔ بیٹی نہیں بن سکتی۔'' سارا کا لہجہ' بات کرنے کا انداز بڑا اکڑا ہوا تھا۔

''ارے سارا پھپھو۔ بڑی پھپھو سے آپ کس لہجے میں بات کررہی ہیں؟'' حیدر نے حیرانی سے سارا کو دیکھا۔

''ہونہہ۔ یہ سارے لہجے' یہ سارے رویے ان ہی کے عطا کردہ ہیں۔ میرے پاس۔ ان کو کبھی فرصت ہو تو پوچھنا۔'' سارا حیدر کو الجھا کر آگے بڑھ گئی۔

''یہ آج سارا پھپھو کو کیا ہوگیا ہے؟''

''رہنے دو بیٹا۔ ناراض ہے مجھ سے۔ منا لوں گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ اصل میں یہ سب بہن بھائیوں میں چھوٹی ہے نا تو لاڈ بھی دکھاتی ہے۔'' صدیقہ نے جلدی سے بات بنائی۔

''لاڈ۔ اور آپ میرے دیکھیں۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔'' آج اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

''سارا پھپھو۔ یہ کیا ہوگیا ہے آپ کو؟'' حیدر سخت حیران تھا کہ سارا پھپھو کو آج کیا ہوگیا ہے جو صدیقہ پھپھو سے اس انداز میں بات کررہی تھیں۔

''مجھے کیا ہوا ہے' یہ بھی ان ہی کو معلوم ہے۔'' سارا نے تیکھی نگاہوں سے صدیقہ کو دیکھا اور آگے بڑھ گئیں۔

''پھپھو۔ آپ میرے کمرے میں آئیں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں میں نے آپ سے۔''

حیدر، صدیقہ بیگم کو اپنے کمرے میں لے آیا۔

''پھپھو۔ آج کل مجھے امی بے حد یاد آرہی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کہیں سے وہ آجائیں تو میں ان سے لپٹ کر اتنا روؤں کہ۔ کہ۔'' صدیقہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر حیدر رو سا دیا۔

''ہائے حیدر بیٹے۔ کیا چیز تھی تمہاری ماں بھی۔ تم میں تو گویا اس کی جان تھی مگر نہیں سکون لینے دیا اس عورت نے اسے۔ ترستی رہی وہ شوہر کے پیار کو مگر اس نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ رضا کو عفت کی طرف نہیں بڑھنے دے گی۔ کیا کیا بتاؤں بیٹے' عفت کس قدر دکھی تھی اس شیریں کے ہاتھوں' اس نے ایسے قبضے میں کیا تھا رضا کو کہ حاصل کر کے ہی چھوڑا۔ اور پھر نہ صرف خود آئی بلکہ بھانجی کو بھی اٹھا لائی۔ ہائے بے چاری عفت' بچوں کی بہاریں بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئیں۔'' صدیقہ بیگم نے روتی آواز میں کہا تو حیدر مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔

''آپ فکر نہ کریں پھپھو' میرے بھی دل پر لکھی ہیں تمام باتیں۔ میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ ان دونوں کو۔ سمجھ کیا رکھا ہے؟ حیدر نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''دیکھا تم نے کس طرح اس بندریا کو آگے کر رکھا ہے۔ پپا۔ یہ کھالیں۔ پپا میں سر دبادوں۔ شانے دبادوں میں کہتی ہوں جو کام ارم کرن کے کرنے والے ہیں' وہ کیوں کرتی ہے۔ اسی طرح تو کرتی ہیں ایسی عورتیں۔ ہتھیالیتی ہیں سب کچھ۔ میں سب جانتی ہوں شیریں نے رضا سے شادی کیوں کی؟ ورنہ کیا ضرورت تھی اتنا انتظار کرنے کی۔ وہ تو دن رات دعائیں کرتی ہوگی کہ عفت جان سے جائے اور وہ سب کچھ سنبھال لے۔''

''اندھی لگی ہے نا جیسے۔ بس آپ دیکھتی رہیں پھپھو کس طرح سیدھا کرتا ہوں دونوں خالہ بھانجی کو۔''

''پھپھو۔ وہ نومی بھائی آئے ہیں۔'' یاسر نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

''تو مٹھائی بانٹوں کیا؟'' صدیقہ بیگم نے منہ بنا کر کہا۔

''مٹھائی تو آپ خیر کیا بانٹیں گی۔ مگر اتنی گزارش ہے کہ براہ کرم چابیاں دے آیا کریں جب کہیں جانے کا پروگرام ہو۔ میں سارے گھر کی چابیوں کی بات نہیں کر رہا صرف باہر کے دروازے کی بات کر رہا ہوں۔ تاکہ باہر سے جو تھکا ہارا آئے تو کم از کم اپنی چھت کے نیچے تو بیٹھ سکے۔ گزشتہ دو گھنٹوں سے باہر انتظار کرتا رہا۔ مگر۔'' یاسر کے پیچھے ہی نومی بھی آگیا اس نے چبھتی نگاہوں سے صدیقہ بیگم اور حیدر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو اس میں اتنی لمبی چوڑی تقریر کی کیا ضرورت تھی۔ صاف کہہ دو چابی چاہیے۔ یہ لو۔'' صدیقہ بیگم نے چابی اس کی طرف اچھال دی جسے یاسر نے پکڑ کر نومی کو دی۔

''یہ تو باہر کے دروازے کی ہوگی۔ اگر کچن کی چابی بھی دے دیں تو عنایت ہوگی' مہربانی

ہوگی کیونکہ چار بج رہے ہیں اور میں نے کھانا نہیں کھایا۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کوئی چیز ادھر ادھر نہیں ہوگی۔'' بات کرتے ہوئے نومی کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔

''چابی لے کر کیا کرو گے۔ کھانا تو میں نے بنایا ہی نہیں۔'' صدیقہ بیگم نے ایسے کہا گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔ خود تو چلی آئیں مگر یہ نہ سوچا کہ بچے کیا کھائیں گے۔

''آداب نومی بھیا! آپ کب آئے؟'' سارا ہاتھ میں چائے لیے ہوئے اندر آئی تو نومی پر نظر پڑی۔

''ہیلو۔ ابھی کچھ دیر قبل آیا ہوں۔ اور سناؤ' تم کیسی ہو؟''

''جی ٹھیک ہوں۔ آپ تو آفس سے آئے ہوں گے۔ آپی تو صبح سے یہاں ہیں۔ آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔'' نومی کیا بولتا' بس خاموش رہا۔

''چلیے آئیے۔ میں آپ کو اچھا سا کھانا کھلاؤں۔ میں نے آج کوفتے بنائے ہیں۔ اچھا ہوا جو آپ آگئے ورنہ میں آپی کے ہاتھ آپ کے لیے ضرور بجھواتی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو بہت پسند ہیں کوفتے۔'' سارا ساری بات سن چکی تھی' اس لیے وہ کھانے پر اصرار کر رہی تھی۔

''بہت بہت شکریہ سارا۔ لیکن کوئی خاص بھوک نہیں۔'' نومی کی بھوک تو کوفتوں کا سن کر ہی چمک اٹھی تھی' مگر پھر بھی انکار کر دیا۔

''آپ پر جھوٹ نہیں جچتا نومی بھائی۔ آئیے میں کھانا گرم کرتی ہوں۔'' سارا نے مسکرا کہا تو نومی جھینپتا ہوا سارا کے پیچھے باہر آگیا۔ یاسر بھی ساتھ ہی آگیا۔

''دیکھا۔ یہ تو حال ہے میرے اپنوں کا کہ میرے دشمنوں کو اتنی عزت دی جاتی ہے ان سے دوستیاں کی جاتی ہیں۔'' صدیقہ بیگم کو سارا کا نومی کے ساتھ یوں اچھے انداز میں پیش آنا قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

''چھوڑیں پھپھو۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ ویسے مجھے نومی کا آپ کے ساتھ اس انداز میں بات کرنا پسند نہیں آیا۔ اگر آپ کا خیال نہ ہوتا تو بتیسی ہاتھ میں پکڑا دیتا۔ بدتمیز۔ بدتہذیب'' حیدر کو نومی کے رویے پر غصے آئے جا رہا تھا۔

''حیدر کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ تمہارا رویہ ممانی جان کے ساتھ کیسا ہے۔ اس وقت تمہاری تہذیب و تمدن کہاں جاتا ہے؟'' یاسر جو کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا حیدر کے جواب میں بولا تو حیدر اور صدیقہ بیگم ایک ساتھ اسے گھورنے لگے۔

کوئی ہوتا ہی اس رویئے کے قابل ہے۔ میری پھپھو تو سارے جہاں سے اچھی ہیں۔ کوئی ان کی انسلٹ کیوں کرے۔ یاسر کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا مگر حیدر کی پھپھو اس کی خالہ تھیں اس لیے وہ کہہ نہ سکا۔

آپ چلیں گی کہ میں جاؤں۔؟'' صدیقہ بیگم سے نومی پوچھ رہا تھا۔

"تو تمہیں اب تک انتظار کرنے کو کس نے کہا تھا، تم جاؤ میں اپنے حیدر کے ساتھ آجاؤں گی شام کو۔" صدیقہ بیگم کا یہ انداز، یہ کاٹ دار لہجہ جو رگوں کو چیرتا ہوا گزر جاتا، نومی، روفی کے لیے تو کوئی نئی بات نہیں تھی مگر جب وہ دوسروں کے سامنے اس طرح انسلٹ کردیتیں تو نومی کا کچھ کرگزرنے کو جی چاہتا مگر وہ لوگ اپنے باپ کی طرف سے پابند تھے جن کا حکم تھا" صدیقہ بیگم تمہاری ماں کی جگہ آئی ہے اور اس کا اسی طرح احترام کرنا ہے۔" نومی دوسری بات سنے بغیر وہاں سے نکل آیا۔

"نومی بھائی۔ میں معذرت چاہتی ہوں ان کی طرف سے۔" سارا کو صدیقہ بیگم کا رویہ نومی کے ساتھ انتہائی برا لگا۔

"ارے سارا بی بی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اب تو عادی ہو گئے ہیں، تم کیوں اداس ہوتی ہو۔ اوکے خدا حافظ۔" نومی بائیک اڑاتا چلا گیا۔

"چلو حیدر بیٹے۔ مجھے بھی چھوڑ آؤ۔ کھانا بنانا ہے رات کا ورنہ یہ دونوں بھائی تو سارے زمانے کو سنانے لگتے ہیں کہ مر گئے بھوکے۔" صدیقہ بیگم اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اٹھیں تو سارا صرف ان کو دیکھ کر رہ گئی۔

"سارا۔ تم ہی آجایا کرو کبھی بہن کے پاس۔ لوگوں کی چھوٹی بہنیں کتنا کتنا عرصہ انکے ہاں رہتی ہیں مگر تم۔" صدیقہ بیگم نے سارا سے شکوہ کیا۔

"بس سمجھ لیں کہ یہ ہی فرق ہے مجھ میں اور لوگوں کی بہنوں میں۔ اور پھر آپ خود جو آجاتی ہیں۔"

"چلیں پھپھو۔ آج تو سارا پھپھو آپ کی کسی بات کا درست جواب نہیں دیں گی۔ لگتا ہے موڈ زیادہ ہی خراب ہے۔" حیدر، صدیقہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہوا بولا۔

"موڈ خراب ہونے کی بات نہیں حیدر، اندر کی محرومیاں جب بہت زیادہ مچلتی اور شور مچاتی ہیں نا تو زبان آپ ہی آپ تلخ ہو جاتی ہے۔ سوری آپی، آج میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئی تھی شاید۔"

سارا کو واقعی افسوس ہو رہا تھا مگر وہ خود نہیں جانتی تھی کہ اس سے یہ سب کیسے ہوا۔

"کوئی بات نہیں بیٹی۔ میرا مطلب ہے سارا، اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ۔"

"پھپھو جانی۔ جلدی کریں۔ مجھے واپس بھی آنا ہے۔"

"اچھا بیٹے۔ خدا حافظ۔"

حیدر پھپھو کو چھوڑ کر آیا تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ مگر کرن اور شفق ابھی تک بیڈ منٹن کھیل رہی تھیں۔ حیدر کچھ دیر دونوں کو کھیلتا دیکھتا رہا پھر جانے کیا بات ذہن میں آئی کہ کرن کے پاس پہنچ گیا۔

"لاؤ کرن۔ میں کھیلوں گا۔" وہ ریکٹ پکڑ کر انداز سے ایکشن میں کھڑا ہو گیا کہ ابھی

شٹل آئے گی۔ مگر شفق بھی الگ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ حیدر نے اسے دیکھا اور آہستگی سے چلتا ہوا اس کے قریب آکر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"بس اتنی ہمت تھی کہ کھلاڑی کو دیکھتے ہی اناڑی نے میدان چھوڑ دیا۔ کیوں ہار سے اتنا خوف آتا ہے۔" وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جس کے رخسار زیادہ کھیلنے کے باعث سرخی مائل ہو رہے تھے۔ شفق نے اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نہ اناڑی ہوں اور نہ ہار سے ڈرتی ہوں۔ میں صرف تمہارے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتی۔ آؤ کرن ہم کھیلیں۔" شفق آگے بڑھ گئی تو حیدر تلملا کر اٹھا اور اس نے شفق کے ہاتھ سے ریکٹ چھین کر دو ٹکڑے کر دیا۔

"اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی میری ناپسندیدہ بات کرے سمجھیں" وہ لفظوں کو اپنے مضبوط دانتوں تلے پیستا ہوا بولا اور آگے بڑھ گیا۔ شفق کا جی چاہا، یہ ٹوٹا ہوا ریکٹ اس کے سر پر دے مارے۔

"آئی ایم سوری شفق۔ پتا نہیں یہ بھیا۔" کرن شرمندہ ہو رہی تھی حیدر کے رویے پر۔

"آؤ اندر چلیں۔" شفق کرن کا ہاتھ پکڑے ہال کمرے میں آگئی۔ جہاں سب ہی اپنی اپنی ذات میں گم تھے۔ حیدر صوفے پر میز پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے شفق کو دیکھا جس کے چہرے پر ابھی تک برہمی کے تاثرات تھے۔ وہ زیرلب مسکرا دیا۔

"آؤ شفق، کیرم کھیلیں۔" کرن کیرم لے کر بیٹھ گئی تو اسے بھی بیٹھنا پڑا مگر سامنے ہی حیدر دھیمی سی مسکراہٹ لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا وہ اس کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی۔ اور وہ اس کی حرکت سمجھ گیا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر بالکل ہی اس کے سامنے اسی انداز میں بیٹھ گیا۔ اب شفق نے اسے یوں اگنور کر دیا گویا وہ یہاں ہے ہی نہیں۔

"ہائے کرن۔ اب سمجھ لو کہ کوئن میری ہوئی۔" شفق کوئن کو کور کر کے ایسے خوش ہوئی کہ کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ اور جیسے ہی وہ دوسری گوٹ ڈالنے لگی تاکہ کوئن کی صحیح حقدار بن جائے۔ حیدر نے بڑھ کر ساری گوٹیں گڈمڈ کر دیں اور سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں کسی جیت کو تمہارے نام نہیں ہونے دوں گا شفق صاحبہ۔" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"اور تم بھی جب زندگی کی تمام بازیاں ہار جاؤ تو میرے پاس چلے آنا۔ میں معاف کرنے کا ظرف رکھتی ہوں۔" شفق نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور اٹھ کر باہر آگئی۔

"ہونہہ۔ پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو۔"

"شہزادی۔" جانے کس کونے سے آواز آئی مگر وہ یکساں طور پر سب کو گھورتا ہوا اپنی جگہ پر آبیٹھا۔

''حیدر۔ تمہیں چچا جان بلا رہے ہیں۔''

''ہونہہ۔ لگا دی ہوگی شکایت' شکایتی ٹٹو نے اور آتا ہی کیا ہے ان دونوں خالہ بھانجی کو۔'' وہ شفق کو کوستا ہوا آرہا تھا۔

''جی پپا۔ کوئی کام تھا کیا؟'' وہ اب ڈانٹ کا منتظر تھا۔

''بیٹھو بیٹا۔ کیا میں صرف کام کے لیے ہی بلا سکتا ہوں۔ بس ایسے ہی تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ سو بلا لیا۔ اب پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''جی' بس ٹھیک ہے۔'' ان کی اتنی ڈھیر ساری باتوں کے جواب میں اس نے مختصر سا جواب دیا۔

پھر کتنی ہی دیر رضا اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے مگر وہ ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا رضا دکھ کر رہ گئے۔ وقت نے کتنا دور کر دیا تھا ان کو ان کے بچوں سے۔ دونوں باپ بیٹا آمنے سامنے بیٹھے تھے مگر درمیان میں صدیوں کا فاصلہ حائل تھا۔ حیدر تو ہر وقت ہی اپنے ابو سے ناراض رہتا ہے اور یہ ہی احساس رضا کو تڑپا تا رہتا۔

''میں جاؤں پپا۔'' وہ اٹھ کر اجازت لے رہا تھا جانے کی۔ رضا نے دکھ سے اسے دیکھا وہ کتنا بے گانہ اور ناراض سا تھا۔ انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''جاؤ بیٹا۔ خوش رہو۔'' وہ ٹیسوں کو دبا کر مسکرائے۔ وہ اٹھ کر آ گیا۔

''سارا۔ ایک کپ گرم گرم چائے مل جائے گی۔''

''ضرور ملے گی۔'' سارا اٹھ کر باہر نکل گئی۔

''فہیم بھائی۔ آج ایک بات تو بتائیں' آپ سارا پھپھو کو پھپھو کیوں نہیں کہتے؟''

''جی فہیم بھیا۔ ہم بھی یہ جاننا چاہتے ہیں۔'' حیدر نے بات چھیڑی تو سب ہی فہیم کے سر ہو گئے تو وہ دامن نہ بچا سکا۔

''بھئی اس لیے کہ وہ۔''

فہیم شوخ سے انداز میں مسکرا کر خاموش ہو گیا تو سب نے پھر اصرار کیا۔

''اس لیے کہ میں ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا۔ کیا۔ فہیم بھائی۔ آپ کو معلوم نہیں کہ مذاق میں بھی ایسی بات سے گناہ ہوتا ہے۔'' لڑکوں کے منہ کھلے رہ گئے اور لڑکیاں چیخ پڑیں۔

''فہیم بھیا۔ مانا کہ پھپھو آپ سے چھوٹی ہیں مگر ہیں تو پھپھو۔'' حیدر کو یہ بات بہت بُری لگی تھی فہیم کی۔

''یہ ہی تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ سارا نہ صرف میری بلکہ تم میں سے کسی کی پھپھو نہیں۔''

فہیم نے ان سب کو مسکرا کر دیکھا جو اسے ایسے دیکھ رہے تھے گویا تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے یا ان کے حواس جاتے رہے ہیں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ سارا پھپھو ان سب کی اتنی پیاری پھپھو ان کی پھپھو نہیں بلکہ کزن ہیں۔

''بھئی۔ تم سب کو سکتہ تو ایسے ہو گیا ہے گویا میں نے کوئی بات ہی ناممکن یا انہونی بات کہہ دی ہو۔ یقین جانو سارا ہم سب کی کزن ہے' پھپھو نہیں۔'' فہیم نے حیدر کے گال تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''لیکن کیسے؟ ہمیں یقین نہیں آ رہا۔'' سب کورس میں بولے۔ ان سب کے چہروں پر ایسے تاثرات تھے جو کہ سارا کو کزن ماننے کو تیار نہیں تھے۔

''بھئی ایسے کہ سارا ہماری بڑی پھپھو کی بیٹی ہے۔''

''نہیں۔'' وہ سب چلائے۔

''نہیں بھئی۔ یہ کیا بات ہوئی؟ مجھ پر اعتبار نہیں۔ امی سے' ابو سے' چچی جان سے یا چچا جان سے پوچھ لو۔ یا پھر سارا ہی سے پوچھ لو۔'' فہیم کے لیے یہ حقیقت نئی نہیں تھی۔ وہ بچپن ہی سے جانتا تھا کہ سارا ان۔ کی کزن ہے۔ مگر ان کے لیے تو یہ بالکل ہی نئی اور اچھوتی حقیقت تھی جس سے ان سب کو کوئی خاص شاک تو نہیں لگا تھا البتہ اس حقیقت پر حیران ضرور تھے۔

''سارا پھپھو یہ۔ یہ۔ کیا؟'' سامنے سے آتی سارا کو دیکھ کر حیدر اس کی طرف لپکا۔

''فہیم ٹھیک کہہ رہے ہیں حیدر۔'' سارا بے دم سی ہو کر صوفے پر گر سی گئی تو سب کو جو معمولی سا شبہ تھا۔ وہ بھی دور ہو گیا۔ سب ہی سارا کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

''سارا پھپھو۔'' حیدر اور وقاص سارا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''نہیں ہوں میں تم لوگوں کی پھپھو۔ مت کہو مجھے پھپھو۔'' سارا جیسے ایک دم پھٹ پڑیں

وہ لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ سارا بری طرح روتی رہی۔

''سارا پھپھو۔ پلیز مت روئیں۔ ہمیں بھی رونا آرہا ہے۔'' بینا اور شینا اپنی پیاری پھپھو کو روتا دیکھ کر رونے والی ہوگئیں۔

''کاش۔ کاش یہ حقیقت محض افسانہ ہوتی۔ اور میں پوری سچائی کے ساتھ چلاتی۔ نہیں فہیم جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں تم لوگوں کی پھپھو ہوں۔ اصلی والی۔ سگی والی پھپھو۔ مگر بدقسمتی سے میں اس عورت کی بیٹی ہوں جسے قدرت نے ماں تو بنا دیا مگر اس کے دل کی پتھریلی زمین پر ممتا کی کوئی کلی نہیں کھلائی۔

مجھے نہیں معلوم کہ ماں کی ممتا کیا چیز ہوتی ہے' ماؤں کے دل اولاد کے لیے کس طرح تڑپتے ہیں۔ اولاد کی خوشی کی خاطر وہ کیا قربانی دیتی ہے میں کیا جانوں یہ سب۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں درخت کا وہ ستم رسیدہ پتہ ہوں جس کا کوئی پتا نہیں ہوتا وہ کس شاخ سے ٹوٹا ہے یا کسی گلشن میں کھلے پھول کی پتی ہوں۔ میں۔ میں تو ماں اور باپ دونوں کے پیار کو ترسا ہوا وہ صحرا ہوں جس کی ریت والدین کی محبت کی بارش کو ترستی رہتی ہے۔ پھر۔ میں۔'' لفظ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ یوں لفظوں کی تلوار اس کے زخموں کو چھیل رہی ہو۔ اب وہ بری طرح رو رہی تھی۔ محبتوں کی چھاؤں کو ترسی ہوئی۔

''سارا پھپھو۔ پلیز مت روئیں نا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے آپ ہماری پھپھو ہیں یا کزن ہمارے لیے تو یہ بات ہی بہت ہے کہ آپ جو بھی ہیں ہماری اپنی ہیں۔ ہمیں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔'' اسد اور وقاص آگے بڑھے۔ وحید نے سارا کے ہاتھ تھام لیے۔

''تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ وقاص' فرق تو مجھے پڑا ہے نا' مجھے معلوم ہے نا کہ صدیقہ بیگم کی بیٹی سے تم لوگوں کی پھپھو بننے تک کی مسافت میں نے کس طرح کاٹی ہے۔ زیست کی پُرخار وادی میں آبلہ پا چلی ہوں'' سارا نڈھال ہو چکی تھی۔ سب ہی اس کی دل جوئی کر رہے تھے۔

''لیکن پھپھو نے ایسا کیوں کیا؟ اگر آپ ان کی بیٹی تھیں تو ان کو کیا ضرورت تھی چھپانے کی؟'' جانے کیوں حیدر کو اپنی پھپھو کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آرہی تھی دوسرے لفظوں میں ان باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''اس لیے کہ جس شخص سے ان کی شادی ہوئی وہ انتہائی شریف انسان تھا مگر ان کو پسند نہ تھا اور میں اسی ناپسندیدہ انسان کی بیٹی ہوں۔ پھر وہ مجھے کیوں اپنی بیٹی کہیں۔'' سارا زہرخند لہجے میں بول رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر شاہین کے پاس آگیا جو چاول چن رہی تھیں۔

''آؤ حیدر بیٹے۔ کیا بات ہے؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' شاہین اس کے چہرے پر الجھاؤ دیکھ کر بولیں۔

''ممانی جان۔ ایک بات پوچھنی ہے۔'' وہ قالین پر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ضرور پوچھو بیٹا۔ لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔ کیا پھر شفق سے؟''

''نہیں تائی جان' مجھے یہ بتائیں کہ بڑی پھپھو کی یہ دوسری شادی ہے۔'' شاہین نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور چاولوں والی ڈش ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بچوں کو ساری بات پتا چل چکی ہے اور ان کو بھی یہ بات معلوم تھی کہ یہ بات فہیم کے علاوہ کوئی نہیں بتا سکتا۔

''ہاں۔'' انہوں نے گہرے سانس کے ساتھ ہاں کی۔

''اور سارا پھپھو بڑی پھپھو کی۔''

''ہاں بیٹے۔ سارا صدیقہ کی بیٹی ہے۔''

''وہ۔ میرا مطلب ہے سارا پھپھو کے ابو کیسے آدمی تھے۔؟'' وہ جانے کیوں آج سارے راز کرید نا چاہتا تھا۔

''بیٹے' خدا کو جان دینی ہے۔ اس میں جھوٹ ہے نہ مبالغہ آرائی۔ صغیر بے حد اچھے اور شریف انسان تھے۔ صدیقہ کے سسرال والوں نے اسے پھول کی طرح رکھا ہوا تھا۔ مگر صدیقہ چونکہ صغیر کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اور پسند تو۔ میرے خیال میں وہ اپنے علاوہ کسی کو بھی نہیں کرتی خیر ناپسندیدگی کے باعث اس نے کبھی صغیر کی بات نہیں مانی۔ جو وہ کہتا اس کے برعکس ہی کرتی۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ہم سے کچھ شکایت نہیں کی مگر پھر بھی صدیقہ نباہ نہ کر سکی اور جب سارا ایک سال کی تھی زبردستی طلاق لے کر آگئی۔ تو اس بات کا تمہارے دادا جان کو بے حد دکھ ہوا۔ انہوں نے سارا کو بیٹی بنا لیا اور سب کو یہ ہی بتاتے کہ یہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سارا پر اس کے والدین کی زندگی کا سایہ پڑے اور وہ کسی قسم کی احساس کمتری کا شکار ہو۔

اور دوسرے صدیقہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں سارا کو اپنی بیٹی ظاہر نہیں کروں گی میں ابھی کم عمر ہوں اس کو بیٹی بتایا تو بڑی عمر کی عورت لگوں گی چنانچہ ابا جان اور امی جان نے بھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ سارا صدیقہ کی بیٹی ہے۔ فہیم چونکہ بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ اسے جانے یہ بات کیسے معلوم ہوگئی کہ اس نے سارا کو بھی بتا دیا۔ مگر تب وہ بچی تھی اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا اور ویسے بھی صدیقہ کے علاوہ باقی سب ہی سارا کو انفرادی توجہ دیتے تھے اس لیے وہ پرسکون رہی۔ لیکن پرسکون سمندر کی گہرائیوں میں کبھی کبھی جوار بھاٹا ہم محسوس کرتے ہیں مگر آفرین ہے اس لڑکی پر کہ اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔''

شاہین نے مختصراً سب کچھ کہہ ڈالا تو اس تمام کہانی کو سن کر اسے واقعی سارا پر ترس آ گیا لیکن وہ اپنی پھپھو کے لیے کوئی بھی منفی خیال دل میں نہ لا سکا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی خامی اس شخص میں ضرور ہوگی جب ہی تو پھپھو نباہ نہ کر سکیں وہ اٹھا اور پھر اس کی بائیک پھپھو کے گھر کے فاصلے نگلنے لگی۔

''امی۔'' رونی کتنی دیر سے صدیقہ بیگم سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ یہ جانتے ہوئے بھی اسے اگنور کر رہی تھیں۔

''چھوٹی امی پلیز میری بات تو سنیے۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولا۔

''سناؤ۔ کیا ضروری ہے کہ تمہاری بات سننے کے لیے تمہاری شکل بھی دیکھی جائے۔ کہو کیا کہنا ہے؟'' صدیقہ بیگم کی پیشانی پر ناگوار سی سلوٹیں ابھر آئیں۔ تو رونی کی غیرت نے سوچا کہ وہ بات ہی نہ کرے مگر مجبوری تھی اس کی بھی۔

''وہ مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ ہمارا کالج اسٹڈی ٹور پر جا رہا ہے اس لیے۔''

''کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔'' کرخت آواز میں کہا گیا۔

''میری مجبوری ہے امی۔ اسٹڈی ٹور ہے۔ تفریحی ہوتا تو میں خود۔''

''نہیں ہیں میرے پاس پیسے۔ نہیں آئے ابھی باہر سے تمہارے باپ کے پیسے۔''

''لیکن مجھے جانا ہے اور کل پیسے ہر حال میں جمع کرانے ہیں۔''

''تو میں کیا کروں؟'' وہ لاپرواہی سے اٹھ گئیں تو رونی تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔

''اتنے پیسوں سے کام ہو جائے گا؟'' نومی نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ حیرانگی سے کبھی نوٹوں کو اور کبھی بھائی کو دیکھنے لگا۔

''بھیا۔ یہ تو میری ضرورت سے بہت زیادہ ہیں۔ مگر آپ کے پاس کہاں سے آئے؟ تنخواہ تو ساری وہ لے لیتی ہے۔''

''زندگی پر تو میرا اور تمہارا حق بھی ہے نا۔ بس اسی لیے اوور ٹائم لگاتا ہوں تاکہ اپنی اور تمہاری کم از کم چھوٹی چھوٹی خواہشات تو۔''

''پھپھو کہاں ہیں؟'' حیدر نے اندر جھانک کر پوچھا تو دونوں نے ایک ساتھ اسے

دیکھا۔

''اپنے کمرے میں۔'' نومی نے مختصر سا جواب دیا۔

''پھپھو۔ پھپھو جان' کہاں ہیں آپ؟''

''ارے حیدر۔ میرا چاند۔ میرا حیدر بیٹا۔ آؤ۔ آؤ۔'' صدیقہ بیگم حیدر کو ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

''ادھر بیٹھو بیٹا' میں تمہارے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔'' صدیقہ حیدر سے کہہ رہی تھیں مگر نومی کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی' کچھ دیر قبل ہی تو اس نے چائے کے لیے کہا تو انہوں نے کہا تھا کہ دودھ نہیں ہے۔ اب حیدر کو دودھ دیا جا رہا تھا۔

''نہیں پھپھو۔ ابھی کچھ نہیں۔ میں سارا پھپھو کے بارے میں بات کرنا آیا ہوں۔''

''سارا کے بارے میں۔ کیوں کیا ہوا سارا کو؟'' وہ کچھ فکر مندسی ہو گئیں۔

''انکو تو کچھ نہیں ہوا۔ بس یہ پتا چلا ہے کہ وہ ہماری پھپھو نہیں کزن ہیں۔ آپ کی بیٹی ہیں۔''

''کیا۔ کیا۔؟'' صدیقہ بیگم کے اندر تو گویا دھماکے ہونے لگے۔

''جی پھپھو' ہمیں سب کچھ پتا چل گیا ہے۔'' پھر حیدر نے ساری بات ان کے گوش گزار دی۔

''تو کیا سارا کو بھی پتا چل گیا ہے۔'' وہ تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔

''جی۔ ان کو تو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا۔''

''ہوں۔ تو اسی لیے اس روز وہ اس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔'' صدیقہ بیگم بات کی تہہ تک پہنچ گئی انہوں نے کچھ دیر کے لیے سوچا۔

''یہ بات سچ ہے نا پھپھو۔'' حیدر کو ابھی بھی اس سچ کی صداقت پر شبہ تھا۔

''ہاں بیٹے' اصل میں میرے سسرال والے اور سارا کا باپ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے روز روز کی مار پیٹ سے تنگ آ کر میں ماں باپ کے گھر آ گئی تو پیچھے سے انہوں نے طلاق بھیج دی۔ میں اسی وقت چونکہ بہت کم عمر تھی اس لیے بابا جان نے سارا کو اپنی بیٹی بنا لیا۔ اور یوں سارا مجھے اپنی بڑی بہن کی حیثیت سے پہچاننے لگی۔'' وہ بڑے سکون سے بول رہی تھیں۔ یوں جیسے کوئی خاص بات نہ ہوئی ہو۔ ایک ہی موضوع پر دو مختلف کہانیاں سن کر حیدر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس پر اعتبار کرے مگر ظاہر ہے جو اس کی پھپھو کہہ رہی تھیں وہ ہی درست ہو سکتا تھا اس کے لیے۔

''اچھا تو بیٹے۔ سارا کے کیا تاثرات تھے جب اسے معلوم ہوا کہ وہ میری بیٹی ہے؟'' یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کن سوئیاں لینے کی تمہیں بہت عادت ہے'' بات کرتے کرتے صدیقہ

نے روفی کو جھاڑ دیا۔ جو آہستگی سے آیا تھا اور فرج سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر دونوں کو دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا اور سیدھا نومی کے کمرے میں آیا۔

''بھائی پتا ہے۔ وہ جو سارا ہے نا۔''

''ہاں ہے پھر؟'' نومی کتاب پر نظریں جمائے بولا۔

''وہ نا۔ ان کی چھوٹی امی کی بیٹی ہیں۔''

''کیا مطلب!' اب نومی کتاب بند کر کے حیرانی سے روفی کو دیکھ رہا تھا۔

''جی۔ یہ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ لگتا ہے حیدر لوگوں کو بھی آج ہی معلوم ہوا ہے۔'' روفی نے جو آخری وقت میں سنا تھا۔ وہ بھائی کو آ بتلایا۔

''نہیں یار' میں یقین کر ہی نہیں سکتا۔ وہ لڑکی جو کلیوں کی مانند نازک' خوشبو سے لہجے میں بات کرنے والی' ہر کسی کی خوشی کا خیال کرنے والی لڑکی' ان کی بیٹی نہیں ہو سکتی۔ جو شاید دنیا میں آئی ہی دکھ دینے اور دل توڑنے ہیں۔'' نومی نے اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا۔

''نہیں بھائی۔ وہ خود پوچھ رہی تھیں حیدر سے کہ سارا کے کیا تاثرات تھے جب اسے معلوم ہوا کہ وہ میری بیٹی ہے۔'' روفی نے بھی چونکہ اپنے کانوں سے سنا تھا اس لیے یقین آ گیا تھا مگر نومی کو نہیں آ رہا تھا۔

''اگر سارا ان کی بیٹی ہے تو اتنی اچھی کیوں ہے؟ بس سارا کی اچھائی کی وجہ سے' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ صدیقہ بیگم جیسی عورت کی بیٹی ہے۔

''اس نئے انکشاف پر کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی یہ حقیقت صدمہ انگیز تھی کہ کسی کو دکھ ہوتا۔ سارا پھپھو تھی یا کزن ان کے لیے یہی بات بہت تھی کہ ان کی اپنی ہے۔ یوں زندگی کے سمندر کی سطح پر معمولی سے ارتعاش کے بعد پھر سکون مسکرانے لگا۔

''ویسے سارا پھپھو۔ اب آپ کو سارا پھپھو ہی کہا جائے یا سارا باجی۔ کیونکہ آپ ہیں تو سارا باجی ہی۔'' حیدر اس کے قریب آتا ہوا بولا۔ تو سارا چپ رہی مگر عین اسی وقت صدیقہ بیگم نمودار ہوئیں تو سارا نے ایک گہرا سانس لیا۔

''ہرگز نہیں۔ میں صرف پھپھو کہلانا ہی پسند کروں گی۔ میں اس رشتے کو ہرگز قبول نہیں کروں گی جس کو ناپسندیدگی اور کم عمری کی چادر میں چھپا دیا گیا ہو۔'' وہ کٹیلے لہجے میں بولتی وہاں سے اٹھ گئی۔

''سارا بیٹی۔ ناراض ہو؟'' صدیقہ اس کی طرف بڑھیں۔

''جی نہیں۔ میں کیوں ناراض ہونے لگی اور پلیز میں نے کتنی بار کہا ہے مجھے بیٹی نہ کہا کریں جس رشتے کو آپ نے تسلیم نہیں کیا۔ اسے پکارتی کیوں ہیں۔ میں آپ کی بیٹی کہلانے سے کہیں زیادہ رضا بھائی اور ضیاء بھائی کی بہن کہلانے میں خوشی محسوس کرتی ہوں۔'' سارا۔

تلخ لہجہ میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گئیں۔

''ارے صدیقہ' کب آئیں؟ آؤ بیٹھو۔ شاہین نے اپنے ساتھ ہی صدیقہ کے لیے جگہ بنائی۔

''مجھے نہیں بیٹھنا۔ آپ سب نے تو سوچ رکھا ہے نا مجھے خوار کرنے کا۔ اب تو خوش ہیں نا آپ لوگ کہ بیٹی' ماں کی بے عزتی کرنے لگی ہے۔'' وہ بڑی بھابھی پر برس پڑیں۔

''تم نے اسے بیٹی سمجھا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔''

''جی آپی' بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ سارا کے ساتھ زیادتی ہے کہ آپ نے اسے کبھی بیٹی سمجھا ہی نہیں۔''

''تم کون ہوتی ہو ہمارے ذاتی۔ وہ بھی میرے معاملے میں بولنے والی۔'' صدیقہ شیریں کو کاٹ کھانے کو دوڑیں جو اپنا حق سمجھتی ہوئی بول پڑی تھیں۔

''میں بھی اس گھر کی ایک فرد ہوں آپی۔'' شیریں کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

''ہونہہ۔ صرف رضا کے لیے۔'' صدیقہ بیگم نے نخوت سے ان کو دیکھا اور چلی گئیں۔

''میں تو مر کر بھی شاید اس گھر میں کوئی حیثیت حاصل نہ کر سکوں۔'' جانے کیسے یہ جملہ شیریں کی زبان سے پھسل گیا ورنہ تو وہ بہت احتیاط کرتی تھیں ہر ستم دوسرے کا ظرف سمجھ کر قبول کر لیتی تھیں۔

''شیریں کیسی باتیں کرتی ہو۔ صدیقہ کی تو عادت ہی ایسی ہے۔''

پھر کتنی ہی دیر شاہین شیریں کو سمجھاتی رہی اور وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے دکھ سے مسکراتی ہوئی اٹھ گئیں۔

اس انکشاف کے بعد کچھ بچوں نے سارا کو باجی کہنا شروع کر دیا تھا باوجود اس کے منع کرنے پر مگر حیدر اس کو باجی کہنے پر تیار نہ تھا۔

''بھئی' میں ان کو کزن کیوں مانوں؟''

''کیوں مانوں۔ کیا مطلب؟'' اسد نے گھورا۔

''بھئی اس لیے کہ ان کے کزن ہونے کا فائدہ صرف فہیم بھیا کو ہو سکتا ہے' ہمیں تو نہیں۔ ہاں اگر مجھ سے چھوٹی ہوتیں۔ تو سب سے پہلے میں ان کو کزن تسلیم کرتا کیونکہ تب سجن بننے کے چانسز زیادہ تھے مگر اب تو۔ ہائے رہی قسمت۔'' حیدر نے شوخی سے فہیم اور سارا کو دیکھا۔

''بکومت۔ ویسے گھر میں تمہارے سائز کی بھی کزنز ہیں۔'' سارا نے مسکرا کر شفق کو دیکھا جو اس موقع پر اکیلی ہی موجود تھی اور ان باتوں سے بے نیاز نٹنگ کر رہی تھی۔

''اوّل۔ تو پھپھو' میں اسے کزنز تسلیم ہی نہیں کرتا اور بقول آپ کے کر بھی لیا جائے تو

اپنے قابل نہیں سمجھتا۔'' حیدر نے بطور خاص شیریں کو سنانے کے لیے بلند آواز میں کہا اس کی بات پر شفق بھی زہر میں بجھا ہوا تیر اچھالنا چاہتی تھی مگر ضبط کر گئی۔

''حیدر۔ واقعی تم اپنے نام کے ایک ہی۔''

''بدتمیز ہو۔'' شفق نے وقاص کی ادھوری بات دانت پیس کر مکمل کی تو وہ آہستگی سے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اور اس کے ہاتھ سے اون کی سلائیاں نکال کر سوئیٹر ادھیڑ ڈالا۔

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ وہ بدتمیزی ہے جس کی سند ابھی تم نے مجھے دی ہے کیونکہ میں مفروضوں کا قائل نہیں۔ ثبوت پیش کر دیا کرتا ہوں۔''

شفق کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ کیونکہ یہ نمونہ اس نے کئی روز کی محنت کے بعد سیکھا تھا اور اب رضا کا سوئیٹر بنا رہی تھی۔

''دنیا کی ڈکشنری میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے تمہاری بدتمیزی اور ذلالت کو بیان کیا جا سکے۔''

باجود کوشش کے شفق اپنی آواز کی لرزش کو چھپا نہ سکی وہ تو سدا کا بدتمیز تھا ہی مگر اس وقت سوئٹر کے ادھڑ جانے کا دکھ ہو رہا تھا۔

''میری وجاہت کو تو بیان کرنے کے لیے ہوں گے الفاظ۔'' وہ بدتمیزی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تو شفق کا شدت سے جی چاہا ایک زوردار تھپڑ اس کے خوبصورت چہرے پر جڑ دے۔

''لعنت ہے ایسی وجاہت پر جو ہر وقت دوسروں کا دل دکھاتی رہے۔'' وہ اون اور سلائیاں اٹھا کر باہر نکل گئی۔

''حیدر بہت بدتمیز ہو' کیوں تنگ کرتے رہتے ہو شفق کو۔ اتنی اچھی لڑکی ہے سب کا خیال رکھتی ہے۔'' فہیم اور سارا نے مشترکہ طور پر اس کو ڈانٹا۔

''کیوں نہ خیال رکھے' تربیت جو دی گئی ہے۔ مقاصد بھی تو بڑے ہیں۔'' حیدر کڑوا سا منہ بنا کر بولا۔

''چھوڑو یار۔ فہیم بھیا' پتا ہے ہم لوگوں کو ٹریٹ دے رہے ہیں۔'' وقاص اس کا موڈ درست کرنے کی غرض سے بولا۔

''ویسے آج کا اخبار تو میں نے سارا پڑھا تھا مگر ایسی کوئی خبر میری نظروں سے نہیں گزری کہ میں تم لوگوں کو ٹریٹ دے رہا ہوں اور کس خوشی میں دے رہا ہوں۔'' فہیم نے کشن گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ ہمیں سارا پھپھو کے مل جانے کی خوشی میں ٹریٹ دے رہے ہیں۔'' بینا' سارا کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اگر ایسی بات ہے تو واضح کر دوں کہ ابھی یہ مجھے نہیں ملی۔ اور جب مل جائے گی تو ٹریٹ بھی دے دوں گا۔'' فہیم نے شوخ اور گہری نظروں سے سارا کو دیکھا جس کی پلکیں لرز کر جھک گئیں۔

''اچھا یہ بات ہے تو پھر آپ کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ آپ کو معلوم تھا کہ سارا پھپھو ہماری کزن ہیں مگر آپ نے اتنا لیٹ ہمیں بتایا اس لیے اب آپ دونوں کو یہ بات چھپانے کے جرم میں چائنیز لے جانے کی سزا دی جاتی ہے۔ سزا میں ترمیم یا توسیع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سزا پر آج ہی عمل درآمد کیا جائے گا کیوں ساتھیو؟'' حیدر نے سب کی طرف دیکھا تو سب نے خوب شور مچایا کہ فہیم اور سارا کو مانتے ہی بنی۔

''اچھا بابا منظور ہے یہ سزا' جاؤ ثنا تم لڑکیوں کو کہو تیار ہو جائیں۔ کرن تم جاؤ شفق کو بھی بلا لو۔''

فہیم ہار مانتا ہوا بولا تو سب ہی خوش ہو گئے۔

''نہیں کرن' تم فہیم بھیا اور سارا پھپھو سے معذرت کر لو میری طرف سے۔ میں نہیں جا سکتی۔'' شفق نے گذشتہ واقعات کی وجہ سے انکار کر دیا۔

''شفق۔ یہ میری پہلی خوشی ہے۔ تم اس میں بھی شریک نہیں ہو گی۔ مجھے معلوم ہے حیدر کی وجہ سے۔'' سارا کو معلوم تھا اس لیے وہ خود ہی اسے منانے چلی آئی۔

''آپ ہمیشہ خوش رہیں سارا پھپھو صرف آپ کی خاطر میں تیار ہوں۔'' شفق سارا کو دیکھ کر بولی کیونکہ گزرے وقتوں میں سارا اس کے لیے بارہا کڑی دھوپ میں سایا بنی تھی۔ اس لیے اس نے سیاہ کاٹن کا پرنٹڈ سوٹ نکالا اور تیار ہونے لگی۔ سب ہی تیار ہو کر باہر نکل چکے تھے۔ بس وہ ہی رہ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلائے۔ ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک لگائی دراز بالوں کو ڈھیلی سی چوٹی کی صورت میں پشت پر ڈالا اور تیزی سے نیچے آ گئی۔ جہاں سب ہی اس کے منتظر تھے۔

''میچنگ اچھی چیز ہے مگر میں ایسی میچنگ کے خلاف ہوں کہ انسان کپڑے بھی اپنے چہرے کے ساتھ میچ کر کے پہنے کیوں ایاز۔'' حیدر نے پہلے شفق کو دیکھا جس کی شہابی رنگت کالے رنگ میں بہت کھل رہی تھی پھر اس نے ایاز سے اپنی رائے کی تصدیق چاہی۔

''تمہاری تو کھوپڑی ہی الٹی فٹ ہوئی ہے۔ تمہارا کیا ہے؟'' ایاز اسے گھورتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''چلو لڑکیو۔'' آؤ پہلے تم لوگوں کو لوڈ کیا جائے۔'' وقاص نے سب لڑکیوں کو گاڑی میں لوڈ کرتے ہوئے کہا۔

''بھیا۔ میں آپ کے ساتھ آپ کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔؟'' ثنا ہمیشہ ہی بڑے بھائی کی

بے توجہی کا شکار رہی تھی مگر جانے کیوں اپنا اکھڑ سا یہ بھیا اسے اسی قدر اچھا بھی لگتا وہ اسے چپکے چپکے جب وہ سو رہا ہوتا کتنی دیر دیکھا کرتی تھی جیسے ہی اس کی پلکوں میں جنبش ہوتی وہاں سے ہٹ جاتی۔

اور آج بھی نیلی جین اور سفید شرٹ میں اسے اپنے بھیاء پر پیار آرہا تھا تو اس کے ساتھ بیٹھنے کی خواہش ظاہر کردی تو حیدر نے گھور کر اسے دیکھا جیسے اس سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔

''کوئی ضرورت نہیں۔ وہاں جا کر بیٹھو اپنی کزن کے ساتھ۔'' حیدر کے لہجے کی آگ میں ثناء کی معصوم سی خواہش راکھ ہو کر رہ گئی۔ وہ اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو نہ روک سکی اور واپس آ گئی۔

''قسم سے بڑے ظالم ہو ثناء۔ ثناء اِدھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' وقاص اور اسد نے اسے آوازیں دیں مگر وہ اندر آ گئی۔

''ثناء۔ کیا ہوا بیٹا؟۔ تم نہیں گئیں؟۔ کیوں رو رہی ہو؟۔'' شیریں نے اس کا تر چہرہ اٹھایا مگر وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

''ثنا بیٹے۔ کیا بات ہے؟ ارے بھئی سب جا رہے ہیں ارے ہمارا بیٹا رو کیوں رہا ہے؟ کسی نے کچھ کہہ دیا؟'' رضا بھی شیریں اور ثناء کی آواز سن کر وہیں آ گئے مگر ثناء نے کچھ نہیں بتایا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا رضا۔ آپ اندر جائیں۔ سرد ہوا چل رہی ہے میں ابھی اسے چھوڑ کر آتی ہوں یہ تو نازک مزاج ہی اتنی ہے کہ ذرا سی کسی کی بات برداشت نہیں ہوتی اس سے اور کوئی اس کا دشمن ہے جو اس کو کہے گا سب ہی پیار کرتے ہیں۔'' شیریں' ثناء کو لیے آ گئیں۔

''اشعر بیٹے ثناء کو کیا ہوا ہے؟''

''اشعر سے کیا پوچھتی ہیں۔ میں نے ڈانٹا ہے اسے۔ مجھے لٹکا دیجیے سولی پر۔'' شیریں سن سی اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئیں گو یہ کہ نئی بات یہاں ہوئی تھی حیدر تو ہر وقت ان کی طرف انگارے اچھالتا رہا تھا۔ مگر وہ اس وقت شاید تیار نہیں تھیں۔

''حیدر۔ شرم کیا کرو۔ آپی نے تو تمہیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔'' سارا نے حیدر کو ڈانٹا۔''

''جب بھی کہیں جانا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی فساد کھڑا ہو جاتا ہے۔'' ارم نے شفق کو گھورا جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

''ارے سارا' کوئی بات نہیں۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہ تھی۔ جاؤ تم لوگ۔ شاباش پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔'' شیریں نے ثناء کو سارا کے ساتھ بٹھا دیا اور خود اند آ گئیں۔ رضا کھڑکی میں کھڑے تھے۔ گو کہ ان کو آواز صاف سنائی نہ دے رہی تھی مگر حیدر کے بات کرنے کے انداز

سے پتا چل رہا تھا کہ اس نے کوئی غلط ہی بات کی ہوگی۔

''کیا کہہ رہا تھا حیدر؟'' رضا شیریں کی طرف مڑے۔

''کوئی نئی بات نہیں کی اس نے رضا۔' شیریں نے آہستگی سے کہا اور بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''محبت اور نفرت کی اس جنگ میں اگر میرا اخلوص ہار گیا۔ اگر میری بے لوث محبت ہار گئی تو رضا۔ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' شیریں رو پڑیں۔

''لگتا ہے اب آپی سے کھل کر بات کرنی پڑے گی۔ یہ سب کیا دھرا ان ہی کا ہے انہوں نے ہی میرے بچوں کی رگوں میں زہر بھرا ہے اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ نہ وہ لوگ خود چین سے رہیں اور نہ تمہیں رہنے دیں۔ ثنا کو تو بچوں نے قبول ہی نہیں کیا۔ میں دیکھتا رہتا ہوں وہ بچی سہمی سی رہتی ہے آپی کا تو جانے میں نے کیا بگاڑا ہے کہ انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ مجھے چین سے نہیں رہنے دیں گی۔ نہیں میں اب تنگ آ گیا ہوں اب میں ان سے پوچھ کر ہی رہوں گا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہیں؟''

رضا واقعی اب تھک گئے تھے اور اب وہ چاہتے تھے کہ صدیقہ سے بات کر کے اس قصہ کو ختم کریں اس طرح تو بچے بھی ان کے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے خصوصاً تو حیدر تو گستاخ ہوتا جا رہا تھا۔

''آپ خود عقل مند ہیں رضا۔ اس طرح بات کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ صدیقہ آپی' حیدر کو مزید بھڑکائیں گی۔ حیدر کا ذہن ابھی کچا ہے اور اس کی سوچ پر پھپھو کا اثر بھی ہے تو حیدر بجائے سنورنے کے مزید بگڑ جائے گا وہ مزید انتقامی کاروائی پر اتر آئے گا تو اس سے بہتر نہیں کہ وقت کا انتظار کیا جائے نفرت کو نفرت سے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ نفرت کی آگ کو محبت کی پھوار سے بجھا دیا جاتا ہے۔'' شیریں رضا کو ساون رت میں بارش کے بعد جیسے بھیگے بھیگے نرم لہجے میں سمجھاتی ہوئی بولیں۔

''شیریں' تم افسانوی باتیں کرتی ہو اگر محبت ہی کی بات ہوتی۔ تم پر تو خیر سوتیلی ماں ہونے کا لیبل ہے مگر میں تو باپ ہوں۔ ان کا سگا باپ ہوں۔ میری محبت میں تو کوئی کھوٹ نہیں ہے پھر بچے مجھ سے متنفر کیوں ہیں۔ کیوں دور ہیں مجھ سے؟ کیوں تڑپاتے ہیں مجھے؟'' بولتے بولتے رضا ایک دم سنجیدہ ہو گئے تو شیریں گھبرا گئیں۔

''رضا۔ پلیز سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کیوں سوچتے ہیں ایسا؟ خدا کے گھر سے ناامید نہیں ہونا چاہیے آپ کی محبت اور میرے خلوص کے شجر پر کونپلیں ضرور کھلیں گی انشاء اللہ۔'' پھر کتنی ہی دیر ان سے اور دوسرے موضوعات پر باتیں کرتی رہیں تا کہ وہ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں۔

جب گھر سے چلے تھے تو حیدر کا موڈ بہت آف تھا۔ اس نے کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ثناء کو بار بار گھورتا رہا۔ باقی سب بھی سنجیدہ تھے۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ تم لوگ کہ کسی کے سوئم میں جا رہے ہو، جو اس طرح رونی صورتیں بنا رکھی ہیں۔" فہیم نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے سب کو دیکھا تو سب حیدر کو گھورنے لگے، معصوم سی ثناء اپنی جگہ مجرم سی بنی بیٹھی تھی۔ کہ نہ وہ روتی ہوئی اندر جاتی اور نہ یہ سب ہوتا اب سب حیدر کو گھور رہے تھے اس نے خاموش نگاہوں سے سب کو دیکھا پھر اس کا بلند ترین قہقہہ گاڑی کی چھت میں شگاف ڈالتا ہوا آزاد فضا میں بکھر گیا۔ تو سب ہی مسکرا دیئے۔ کیونکہ صرف ایک اس کی وجہ سے ماحول بوجھل تھا۔

"قسم سے بڑے کمینے ہو تم حیدر۔"

"کیا کروں یار، تمہارا کزن نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔" حیدر نے شرارت سے وقاص کو دیکھا۔

"اچھا۔ بھی پروگرام یہ ہے کہ آج صرف چائنیز ہی ہوگا کیونکہ وقت کم ہے۔" فہیم نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر گاڑی یہاں ہی روک دیں فہیم بھائی۔" حیدر نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تو سب ڈر گئے کہ بس گھوم گیا اس کا میٹر بھی۔

"اور میں نے جو کوہ قاف میں پری کو ٹائم دے رکھا ہے۔" وہ بے ساختگی سے بولا تو سب ہنس پڑے۔

"دیکھا۔ سب کو ہنسا دیا۔" وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔

"جوکر کا اور کام بھی کیا ہوتا ہے۔" شفق کی زبان پر بھی جو جملہ آجاتا، پھسل کر باہر آجاتا۔

"یار اسد۔ یہ زنگ آلود سی آواز کہاں سے آئی ہے؟ یوں جیسے کسی زنگ آلود برتن کو ریگ مال سے کھرچا جا رہا ہو۔" حیدر اور شفق کو بخش دے۔ بھلا یہ کس کتاب میں لکھا تھا۔

"اچھا بس خاموش رہو تم سب۔" ہنگامے کے خوف سے سارا نے شفق اور حیدر کے ساتھ سب کو خاموش کرا دیا۔

"خاموش رہنا تو مشکل ہے پھپھو۔"

"کیوں بھلا؟" سارا نے حیدر کو دیکھا۔

"سکاچ ٹیپ جو گھر بھول آئے ہیں۔"

"اب تم سے بحث ہی فضول ہے۔" سارا پیار سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

"یہاں تمیز کا استعمال کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔" فہیم بھیا نے تنبیہاً سب کو کہا۔

"فہیم بھیا جو چیز انسان کے پاس ہوتی ہے، استعمال بھی تو اسی کو کیا جاتا ہے نا۔ اور جو چیز ہو ہی نہ۔"

"ٹھیک کہا تم نے شفق، میں متفق ہوں تم سے۔" حیدر نے بڑے سکون سے آرام سے کہا تو سب ہی اس انقلاب پر اسے دیکھنے لگے۔

"بھی دیکھو نا۔ تمہارے پاس عقل ہوتی تو تم اس کا استعمال کرتیں اور دیکھتیں کہ ایک پیر میں بلیک اور دوسرے میں سبز جوتا پہن لیا ہے مگر وہ بات کہ عقل۔" حیدر کی بات پر سب کے ساتھ شفق نے بھی جلدی سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا حیدر درست کہہ رہا تھا اس کے دائیں پیر میں کالا اور بائیں پاؤں میں سبز شوز تھا یہ کیسے ہوگیا؟ سب ہی دیکھ رہے تھے اور تیاری کے وقت انہوں نے جلدی جلدی بھی تو لگائی ہوئی تھی۔ جلدی میں اسے دھیان ہی نہیں رہا جب بھی وہ اندر آ رہی تھی تو لوگ مسکرا رہے تھے۔ اب اس کے کپڑوں میں سبز رنگ بھی نہیں پایا جاتا تھا کہ میچنگ کا کریز سمجھ کر معاف کر دیا جاتا اب وہ کھسیانی سی بیٹھی تھی۔

"تم نے یہ کب دیکھا تھا۔" وقاص نے حیدر سے پوچھا۔

"میں نے گھر پر ہی دیکھ لیا تھا۔ جب محترمہ بن ٹھن کر نیچے اتری تھیں۔" حیدر نے بن ٹھن پر زیادہ ہی زور دیا۔

"تو تم نے وہیں کیوں نہ بتا دیا۔" سارا نے سرزنش کی۔

"دیکھیے سارا پھپھو، اگر میں بتا دیتا تو یہ ہو جاتی تمیز۔ اب میں ٹھہرا بدتمیز۔ تو بدتمیزی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ہے نا فہیم بھائی۔" حیدر نے تصدیق کے لیے فہیم کو دیکھا جو ویٹر کو آرڈر دے رہے تھے۔

"صائمہ۔ وہ دیکھو، وہ جو سامنے کپل بیٹھا ہے اس آدمی کے بال کتنے اچھے ہیں حالانکہ اس عمر میں مرد عموماً فارغ البال ہوتے ہیں۔" صائمہ عین اپنے سامنے بیٹھے ادھیڑ عمر جوڑے کو

دکھارہی تھی اس بندے کے بال واقعی اچھے تھے۔سیاہ چمکدار۔

''وگ ہے جاہلو' اتنا بھی نہیں پتا کہ اتنے بوڑھے بندے کے بال اتنے اچھے ہو سکتے ہیں۔'' اسد بھی شاید ان کو ہی دیکھ رہا تھا وہ شریک بحث ہوگیا۔

''خیر ایسی بھی اندھی نہیں لگی' ہمیں جیسے پتا نہیں اس کے اپنے بال ہیں۔''

لڑکیاں مصر تھیں کہ اس کے اپنے بال ہیں جبکہ لڑکوں کا اصرار تھا کہ وگ ہے۔

''یار کیا سلسلہ درپیش ہے تم لوگوں کو۔''

''اچھا حیدر بھائی۔آپ بتائیں وہ جو سامنے جوڑا بیٹھا ہے۔اس بندے کے اپنے بال ہیں یا وِگ ہے۔'' ثناء نے حیدر کو ثالث بنایا تو وہ آنکھوں کی دوربین بنا کر دیکھنے لگا۔

''تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی پتا کر کے آتا ہوں دوسرے لفظوں میں ابھی ثبوت پیش کرتا ہوں۔''

''اپنی جگہ پر بیٹھے رہو حیدر۔ کسی بدتمیزی کی ضرورت نہیں۔'' فہیم اسے اٹھتا دیکھ کر بولا۔

''اچھا جی۔'' وہ سعادت مند بچوں کی طرح بیٹھ گیا۔

اور پھر یہ دعوت بغیر کسی لڑائی کے جو شفق اور حیدر کے درمیان ضروری تھی اختتام کو پہنچی۔

''اچھا چلو' اب ہم دونوں کا شکریہ ادا کرو۔'' فہیم بل ادا کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایسے ہی شکریہ ادا کردیں خوامخواہ میں۔'' سب ایک ساتھ بولے۔

''بڑے شکریہ حرام لوگ ہو سب۔'' فہیم' سارا مسکرائے۔

''ارے فہیم بھائی۔ دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے بار بار ایسے مواقع فراہم کیے تو سوچیں گے شکریہ ادا کرنے کے بارے میں۔'' حیدر اب ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتا ہوا بولا۔

جب سے سارا کی حیثیت گھر میں کلیئر ہوئی تھی' بڑوں کو کم اور چھوٹوں کو زیادہ اس کی شادی کی فکر لگ گئی تھی اور سب کا اصرار تھا کہ اب فہیم اور سارا کی شادی کی جائے تا کہ گھر میں کچھ تو تبدیلی ہو۔

''بس تائی جان۔آپ جلدی سے شادی کا علان کردیں۔''

''جی امی۔ حیدر درست کہہ رہا ہے۔'' وقاص اور حیدر ہی کا خیال ہی نہیں تھا سب کی خواہش تھی کہ شادی جلدی ہو۔

''ارے دیوانو' تم لوگ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے درپے ہوں۔'' شاہین نے مسکرا کر ان لوگوں کو دیکھا۔

''واہ تائی جان۔ کمال کرتی ہیں آپ۔لڑکا لڑکی پچاس سال کے ہو گئے ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں ابھی جلدی ہے۔''

''ارے پگلے۔ پچاس سال تو ابھی تیرے باپ کی۔بھی عمر نہیں۔ خیر سوچتے ہیں اب۔'' شاہین نے پیار سے حیدر کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

آپ نے یاد دلایا تو ہمیں یاد آیا والی بات ہوئی کہ بچوں نے واویلا مچایا تو بڑے بھی اس معاملے میں سنجیدہ ہو گئے۔

''ویسے واقعی اب اس نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' کیوں شیریں؟'' ضیاء نے شیریں کی طرف دیکھا۔

''آپ لوگ بڑے ہیں ضیاء بھائی۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ صدیقہ آپی سے اس سلسلے میں بات ضرور کرلیں۔ کیونکہ سارا بہر حال ان کی بیٹی ہے۔''

''نہیں شیریں۔ سارا ہماری بہن بن کر رہی ہے۔خود آپی نے کہا تھا کہ اب سارا سے میرا کوئی تعلق نہیں' یہ آپ لوگوں کی ہے اور جب ہماری ہے تو ہم نے پالا ہے تو وہ کسی قسم کا احسان جتانے والی کون ہیں؟''

رضا کا دل اب صدیقہ سے خراب ہو گیا تھا۔

''رضا۔ شیریں درست کہہ رہی ہے۔ٹھیک ہے سارا کو ہم نے پالا ہے مگر بہر حال سارا اس کی بیٹی ہے۔'' وہ اعتراض کرسکتی ہے۔اور بھائیوں' بھاوجوں اور انکے بچوں' بچوں سے تو خیر ہمارے ہی خدا واسطے کا بیر ہے۔ رضا کے بچوں میں تو اس کی جان ہے۔'' شاہین کی بھی یہی رائے تھی۔

''اچھا تو ٹھیک ہے' بات کرلیں گے۔ میرے خیال میں صدیقہ کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے رضا کیا خیال ہے ابھی چلیں صدیقہ کی طرف۔''

''جیسے آپ کا حکم بھائی جان۔'' رضا بھی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''حیدر۔ چلو بیٹے گاڑی نکالو۔'' ضیاء نے حیدر کو ساتھ لے جانے کے لیے اس لیے منتخب کیا تھا کہ صدیقہ بیگم صرف حیدر کو ہی دیکھ کر خوش ہوتی تھیں وہ ہی ان کا منظورِ نظر تھا۔

''آداب آپی۔'' رضا صدیقہ کے سامنے ذرا سا جھک گئے۔

''جیتے رہو۔'' آج کیسے خیال آ گیا بھائیوں کو میرا۔'' صدیقہ نے ان کے جھکے شانے پر ہاتھ پھیرا۔

''بھئی صدیقہ۔ اب روز روز تو بھائی بہنوں کے گھر آتے اچھے نہیں لگتے۔ جب تک کوئی خاص بات نہ ہو۔'' اظفر کب آرہے ہیں؟'' ضیاء صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''فی الحال تو انکا میرے خیال میں کوئی پروگرام نہیں۔ لیکن آپ سنائیں کس خاص کام سے آئے ہیں؟''

صدیقہ بیگم کے بولنے کا انداز ایسا ہوتا کہ خلوص کی چاشنی کی ذرا بھی رمق نہ ہوتی ان کے

لہجے میں۔

''کام کیا آپی۔ بچے جوان ہو گئے ہیں تو اب سوچنا چاہیے ان کے بارے میں'' رضا بات کا آغاز کرتے ہوئے بولے۔

''اچھا تو میں کیا کروں۔ میری تو کوئی اولاد جوان۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے کچھ بولتے بولتے رک گئیں۔

''ہاں تو پھر کیا کیا جائے؟'' وہ گہرا سانس لے کر بولیں۔

رضا اور ضیاء نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ضیاء نے اشارے سے حیدر کو باہر جانے کو کہا۔

''بات یہ ہے کہ صدیقہ کہ ہم سارا اور فہیم کی بات طے کرنا چاہتے ہیں تمہارا کیا خیال ہے؟'' ضیاء نے صاف الفاظ میں بات کہہ ڈالی تو ایک ساتھ کئی طرح کے تاثرات ان کے چہرے پر ابھرے اور ڈوب گئے۔

''آپ نے سارا کے متعلق اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور مجھے یوں اطلاع دے رہے ہیں جیسے میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔'' اب وہ اس کی حقدار بن بیٹھی تھیں۔

''حق ہے تب ہی تو آپ سے پوچھ رہے ہیں آپی۔ ورنہ تو آپ سارا سے لاتعلقی کا اعلان بہت پہلے کر چکی تھیں۔ رضا کو صدیقہ کی بات پر غصہ آ گیا مگر پھر بھی سنبھل کر بولے۔

''کیسی لاتعلقی؟ سارا بہرحال میری بیٹی ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف مجھے ہے اور میں فہیم کو سارا کے لیے مناسب نہیں سمجھتی۔'' صدیقہ نے کچھ ایسی بدلحاظی سے کہا کہ ضیاء کو غصہ آ گیا۔

''تم کبھی بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں صدیقہ۔ اب تم اس بیٹی کی حقدار بن رہی ہو جس کو ایک عرصہ پہلے ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب یہ آپ کی ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا ہم نے اپنی اولاد سے بڑھ کر اس کی پرورش کی اب تمہیں میری ہی اولاد میں نقص نظر آ رہے ہیں بس سارا ہمارا بیٹی ہے ہماری بہو بنے گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ ضیاء کو غصہ آیا تو وہ بے تکان بولتے چلے گئے۔

''آپی۔ آپ کچھ تو خیال کریں۔ آپ نے بات کیا کی ہے۔ ٹھیک ہے سارا آپ کی بیٹی ہے مگر فہیم میں کیا کمی ہے جو آپ نے صاف انکار کر دیا ہے۔'' رضا کو بھی صدیقہ کی دوٹوک بات بُری لگی تھی۔

''اس میں برا ماننے والی کیا بات ہوئی ہے ہر کسی کو حق ہے کہ اپنی اولاد کے لیے بہتر سوچے ٹھیک ہے فہیم میں کوئی کمی نہیں ہے مگر مجھے سارا کے لیے پسند نہیں۔''

''آپ کی پسند اور ناپسند کا ڈسا ہوا تو تمام عمر تڑپتا رہتا ہے۔'' رضا دکھ سے سوچ کر رہ

گئے۔

''چلیے بھائی جان۔'' رضا اور ضیاء اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے ماموں جان' میں نے تو چائے بھی بنالی تھی آپ کے لیے'' روفی سگھڑ لڑکیوں کی طرح ٹرالی میں چائے سجائے لے آیا۔

''جیتے رہو بیٹا' لاؤ پی لیتے ہیں۔'' ضیاء اور رضا محض روفی کا دل رکھنے کے لیے گرم چائے سے جگر جلانے لگے۔

اس بات سے سب کو دکھ ہوا تھا مگر سارا جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

''پھپھو آخر ایسی کیوں ہیں۔''

''بے چارے فہیم بھیا اس قدر اداس ہیں کل سے۔''

''پتا نہیں پھپھو کو دوسروں کو دُکھ دے کر کیا ملتا ہے؟''

سب کے ملے جلے تاثرات تھے۔ صدیقہ بیگم کے اس اعلان کے بعد سارا اٹھ کر شیریں کے کمرے میں آ گئی۔

''سارا کیا بات ہے بیٹے' کیوں رو رہی ہو؟'' شیریں نے بڑھ کر اسے ساتھ لگا لیا۔

''روؤں نہ تو کیا کروں شیریں بھابھی' میں اس عورت کی بیٹی ہوں جس نے اپنے حسن اور کم عمری کے باعث مجھے چھوڑ دیا۔ ہر قسم کا تعلق ختم کر لیا میرا باپ مجھ سے چھین لیا۔ اپنی ممتا سے محروم کر دیا اور اب یہ۔ اب میری مالک۔ میری حقدار بن بیٹھیں۔ نہیں بھابھی۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ان کا مجھ پر کوئی حق نہیں۔ میں صرف ان کے حکم کے تابع ہوں جنہوں نے مجھے پالا۔ اپنے سچے خلوص اور پاکیزہ محبتوں کی چھاؤں تلے پروان چڑھایا۔ بھابھی کہہ دیجیے رضا بھائی اور ضیاء بھیا سے کہ مجھے ان کا ہر فیصلہ قبول ہے میں آپی کے احکام کی تابع نہیں ہوں اگر کوئی فیصلہ انہوں نے کیا اور آپ سب نے قبول کر لیا تو بھابھی آپ لوگوں کی یہ عمر بھر کی کمائی میں خود اپنے ہاتھوں ضائع کر دوں گی۔ مگر۔ مگر۔'' وہ بری طرح روئے جا رہی تھی۔

''سارا۔ سارا بیٹے۔'' رضا جو اندر آ گئے تھے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے تو سارا ان سے لپٹ گئی۔

''مت روؤ سارا' انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب وہی ہوگا جو ہم یا تم چاہتی ہو آپی کو اب ہماری بات ماننا ہوگی۔'' رضا فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

اگلے روز سارا اکیلی صدیقہ بیگم کے ہاں پہنچ گئی۔

''ارے سارا' آؤ بھئی' زہے نصیب آج کیسے راستہ بھول گئیں ہمارے گھر کا۔'' نومی کو اسے دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی۔

''اور آپ کو تو جیسے ہمارے گھر کا راستہ یاد ہے نا۔'' اس نے بھی مسکرا کر شکوہ کر ڈالا۔

''اچھا بیٹھو بتاؤ کیا نوش فرماؤ گی چائے' کافی یا۔''

''کچھ نہیں نومی بھائی۔'' وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

''ارے ماہر ہوں ڈر کیوں گئیں۔ بڑی اچھی چائے بناتا ہوں۔''

''نہیں نومی بھائی' اس وقت طلب ہی نہیں۔ آپی کہاں ہیں؟'' وہ باہر جھانکتے ہوئے بولی۔

''بازار گئی ہیں۔''

''تو پھر آپ مجھے چائے' کافی کی دعوت کیوں دے رہے ہیں؟ کچن پر تالا نہیں پڑا کیا۔؟'' سارا نے تلخ لہجے میں کہا۔

''نہیں آج وہ چابیاں گھر پر ہی بھول گئیں ہیں۔'' نومی بھی دکھ سے مسکرایا۔

''تو پھر فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چلیے میں بناتی ہوں آج دودھ پتی۔'' سارا خود کچن میں آ گئی اور دودھ پتی بنا لائی۔

''تمہارے ارادے کیا ہیں سارا بی بی۔ سارا دودھ ختم کر دیا ہے گھر سے نکلوانا ہے کیا؟'' نومی مگ پکڑتا ہوا بولا۔

''ڈرنا چھوڑ دیں نومی بھائی۔''

''سارا میں نے ایک بات سنی ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ ایک حقیقت آشکار ہوئی ہے۔'' نومی کئی بار اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا مگر پھر جانے کیا سوچ کر نہ پوچھی۔

''کیوں۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے کیا؟'' سارا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''ہاں سارا۔ اس لیے کہ شعلہ بھلا شبنم کو کیسے جنم دے سکتا ہے۔ تم نے مائنڈ تو نہیں کیا۔'' نومی کی بات تیر کی مانند سارا کی رگوں کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے ایک نظر نومی کو دیکھا پھر مگ میز پر رکھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

''سوری سارا۔ مجھے واقعی یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔'' نومی کو زبان سے پھسل جانے والی تلخ بات کا احساس ہوا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

''نہیں نومی بھائی' میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ انسان کتنا بدنصیب ہوتا ہے جس کے کاسے میں نفرت کے کھوٹے سکے ہی گرتے ہیں محبت کی ایک پائی بھی اس کاسے میں نہیں گرتی۔ خیر آپی آپ کو بتا کر تو نہیں گئی ہوں گی کہ کب آئیں گی؟'' سارا واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ صدیقہ آ گئیں۔

''ارے سارا تم۔ آج میرے گھر کی قسمت کیسے جاگ گئی۔ کب آئیں تم؟'' صدیقہ بیگم سارا کی طرف بڑھیں۔

''آداب آپی۔ میں کچھ دیر پہلے ہی آئی۔'' سارا سرد مہری سے بولی۔

''تو بیٹھو نا۔ اٹھ کیوں گئیں۔''

''جی نہیں۔ میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی تھی کہ۔ کہ۔'' سارا بولتے بولتے رک کر صدیقہ بیگم کو دیکھنے لگی جن کو امی کہنے کو اس کے لب کتنے مچلا کرتے تھے کتنا دل چاہتا تھا وہ ان کو کہے۔ وہ اس کے بال سنواریں اس کا کام کریں۔ اس کے کپڑے خود سئیں وہ بیمار ہو تو اپنی ممتا سے اس کے ہر درد کو مٹا دیں۔ اس کے زخموں پر اپنی محبت کے پھاہے رکھیں وہ کتنا تڑپا کرتی تھی انکی گود میں جانے کو مگر وہ جب گئی انہوں نے دھتکار دیا کیسی تھیں کتنا پتھر سنگلاخ دل تھا ان کا کہ ممتا کا ایک پھول بھی نہیں کھلا۔ پھر اس پتھریلی زمین سے وہ کوئی واسطہ کیوں رکھتی۔ یہ سب سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں دھند اتر آئی۔

''ہاں تو میں آپ سے کہنے آئی تھی کہ پلیز مجھے میری زندگی گزارنے دیں۔ میرے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف مجھے ہے یا پھر ان لوگوں کو جنہوں نے بے لوث محبتوں کے گہوارے میں پروان چڑھایا ہے۔''

وہ بھیگی آواز میں سخت اور سرد لہجے میں بولتی آگے بڑھی۔'' اور ہاں۔ یہ دودھ پتی میں نے بنائی ہے۔ نومی بھائی کو کچھ نہ کہا جائے۔'' وہ جاتے جاتے پلٹ کو بولی۔ اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ صدیقہ بیگم نے گھور کر ہلتے پردے کو دیکھا۔ پھر نومی کو اور پھر اپنے کمرے میں آ گئیں۔

سارا اور فہیم کی شادی کی بات جس طرح گرم ہوئی تھی اسی طرح سرد پڑ گئی کیونکہ عطیہ بیگم کا مشورہ تھا کہ فی الحال بات کو یہیں رہنے دیا جائے بعد میں دیکھی جائے گی۔

حیدر اپنے نام کا ایک ہی ضدی تھا۔ آج کل اسپورٹس کار اس کی ضد بنی ہوئی تھی اور رضا اسے لے کر دینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ گاڑی چلاتا نہیں اڑاتا تھا اور کئی بار اس کے چھوٹے موٹے ایکسڈنٹ بھی ہوئے تھے اسی وجہ سے وہ لے کر نہیں دینا چاہتے تھے مگر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شیریں نے رضا کو منع کیا ہے کہ گاڑی نہ لے کر دی جائے۔ جبکہ وہ کئی بار رضا سے کہہ چکی تھیں۔

''رضا۔ خدا پر بھروسا رکھیں۔ بچہ ہے ضد کر رہا ہے۔ لے دیں۔''

''شیریں۔ ضروری تو نہیں کہ بچے کی ہر جا و بے جا ضد مان لی جائے۔''

''رضا۔ آپ اس سے وعدہ لیں کہ وہ تیز رفتاری سے پرہیز کرے گا۔''

''کیا بچوں والی بات کرتی ہوں شیریں۔ لڑکے کبھی وعدے ایفا نہیں کر سکتے۔ جب میں محسوس کروں گا وہ سنجیدہ ہو گیا ہے' لے دوں گا۔'' رضا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

''کرن' ارم پلیز' تم لوگ ہی پپا سے کہونا کہ مجھے اسپورٹس کار دلا دیں۔'' وہ کرن ارم کو کہہ رہا تھا۔

''بھیا۔ آپ مما سے کہیں پھر پپا آپ کو گاڑی لے دیں گے۔'' کرن نے جلدی سے مشورہ دیا۔

''ہونہہ مما۔ انکے توسط سے تو زندگی بھی ملے تو نہ لوں۔'' حیدر نے قریب سے گزرتی ہوئی شیریں کو دیکھ کر زیادہ دانت پیس کر کہا تو وہ ہونٹ کاٹ کر بمشکل ٹیسوں کو دبا پائیں۔

''خدا جانے میں کب تم لوگوں کی محبت کو جیت پاؤں گی اور کیا خبر جیت بھی پاؤں گی یا ہمیشہ کے لیے ہار جاؤں گی۔'' وہ دکھ سے سوچتی اپنے کمرے میں آ گئیں اسی وقت صدیقہ بیگم بھی آ گئیں حیدر کا منہ بنا دیکھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔

''آداب پھپھو۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''جیتا رہے میرا چاند' کیا بات ہے؟ کیوں اداس ہے؟''

''پھپھو' مجھے اسپورٹس کار چاہیے مگر پپا مان کر نہیں دے رہے۔'' وہ منہ پھلائے بول رہا تھا۔

''ارے بیٹے کیسے لے کر دے' کس طرح وہ تم لوگوں پر دھیان دے بیٹے' اس پر تو چڑیلوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ تم لوگ بیٹھے ہی رہ جاؤ گے اور وہ لوگ ساری جائیداد پر قابض ہو جائیں گے مگر بیٹے تم ہوش کی دوا نہ لینا۔''

''پھپھو بتائیں پھر میں کیا کروں۔''

''ارے چندا۔ حساب کتاب رکھا کرو۔ ہر بات کا' یہ بزنس' یہ اتنی جائیداد صرف رضا نے خود تو نہیں بنائی اور نہ ہی اسے ابا جی کی طرف سے ملی ہے۔ یہ جائیداد تمہارے نانا جی کی ہے جو انہوں نے تم چاروں بہن بھائیوں کے نام کی تھی۔ ہائے ری عفت کچھ نہ دیکھا اولاد کا نہ جائیداد کا۔''

''اچھا پھپھو' یہ سب نانا جان کا ہے مگر اس سے پہلے تو مجھے نہیں بتایا کسی نے پپا نے تو کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔'' حیدر کو حیرانی ہو رہی تھی اس نئے انکشاف پر۔

''ارے میرے بھولے بچے۔ تجھے بتاتا کون۔ رضا اب اپنے پیروں پر کلہاڑی ماریں گے کیا۔ اور اوپر سے شیریں چڑیل کا ساتھ' وہ کب چاہے گی کہ تم لوگ مالک بنو۔ جائیداد کے۔ تمہیں بھی تو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ بزنس کو دیکھو۔ پتا چلے کہ ہوا کس رخ کی ہے۔''

''مگر پھپھو پپا خود ہی سنبھالتے ہیں میں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ کبھی انہوں نے مجھے بزنس سنبھالنے کو کہا۔ اور ویسے ہی پپا ہمارے لیے ہی کر رہے ہیں' ہمارے دشمن تو نہیں۔''

''پپا دشمن نہیں مگر وہ تو دشمن ہے نا جسے تمہارا پپا رگِ جان بنا کر رکھتا ہے۔''

''اچھا تو پھپھو میں کیا کروں؟'' وہ زچ ہو کر بولا۔

''کرنا کیا ہے چاند۔' بزنس کا خیال رکھا کرو۔ رضا سے کہو تم لوگوں کے حصے تم لوگوں کو دے دے بس اس طرح یہ بھی پتا چل جائے گا کہ ان تینوں کا کتنا حصہ نکلتا ہے۔'' صدیقہ بیگم تو مشورہ دے کر چلی گئیں حیدر سوچتا رہ گیا۔ پھپھو کا مشورہ قابل عمل بھی لگ رہا تھا اور فائدہ مند بھی۔

لیکن اگر پپا ناراض ہو گئے تو۔ لیکن پھپھو تو کہہ رہی تھیں کہ اس معاملے میں پپا کی ناراضگی کا بھی خیال نہیں کرنا چاہیے ورنہ ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ ہمارے نانا کی جائیداد پر ہمارا حق ہے کسی اور کا نہیں۔ یہ سب کچھ سوچ کو وہ رضا کے روبرو آ گیا۔

''پپا۔ ہمارا بزنس کیسا جا رہا ہے؟'' اس کی بات پر رضا نے یوں چونک کر اسے دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

''بہت اچھا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' رضا سمجھ رہے تھے کہ صدیقہ بیگم کا سبق دہرایا جا رہا ہے۔

''بس یونہی' ہمیں بھی تو خبر ہونی چاہیے۔''

''بزنس میرا ہیڈک ہے۔ مجھے ہی ڈیل کرنے دو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ پڑھائی کرو اور مستقبل بناؤ۔'' رضا نے سختی سے کہا اور فائل پر جھک گئے۔

''پپا۔ ہمارے نانا جان کی ساری جائیداد بھی تو ہمارے نام ہے نا۔''

''ہاں۔ ہاں۔ پھر۔؟'' اب رضا کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا اور تیزی سے ہونے لگا۔ وہ فائل پھینک کر کھڑے ہو گئے۔

''پھر یہ کہ پپا۔ ہمارے حصے ہمیں کب ملیں گے؟''

''جب۔ جب میں مر جاؤں گا۔'' رضا دل پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف جھک گئے۔

❤❤❤

رضا پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور وہ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھے آکسیجن لگی ہوئی تھی ان کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات تھے یوں جیسے بہت اذیت میں ہوں۔ گھر کے کچھ افراد ہسپتال میں تھے اور جو گھر پر تھے وہ بھی جان کنی کی سی کیفیت میں تھے۔

ارم اور کرن کا رو رو کر برا حال تھا۔ شیریں برانڈے کے سرد فرش پر خدا کے حضور سجدہ ریز تھیں۔ گھر میں جان لیوا خاموشی تھی۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک کے ساتھ سب کے دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرز رہے تھے اور کسی بھی اچھی' بری خبر کے لیے خود کو تیار کر رہے تھے۔

سارا اور شاہین بار بار فون کر رہی تھیں ہسپتال میں۔ ضیاء پریشانی میں ٹہل رہے تھے۔

''خدایا۔ میرے گناہ معاف فرما۔ مجھے میرا ساتھی لوٹا دے۔ میں تیری رحمتوں کا شمار نہ کر سکنے والی گناہگار ہوں۔ مجھ پر ہمیشہ کی طرح اپنی رحمتوں کا نزول فرما۔ بخش دے میرا ساتھی۔'' شیریں سجدے میں گڑگڑا رہی تھیں۔

کسی بھی انجانی صورتحال کے لیے وہ خوفزدہ تھیں اور شاید ذہنی طور پر تیار نہ تھیں۔

''اندر آؤ شیریں۔ خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔ دُعا تو ہر جگہ کی جا سکتی ہے باہر بہت ٹھنڈ ہے۔''

''نہیں ضیاء بھائی' میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ خدا جانے۔'' وہ ستون سے ٹیک لگائے پھر رو پڑیں۔

''اللہ میاں سے اچھی امید رکھنی چاہیے شیریں۔ وہ اپنے در سے مایوس نہیں لوٹاتا۔ ادھر بیٹھو' اللہ تعالیٰ رحم کرے گا۔'' ضیاء نے شیریں کو بینچ پر بٹھایا اور قریب ہی خود بیٹھ گئے۔ ''شیریں یہ تو مجھے معلوم ہے کہ اسے دل کی تکلیف رہتی تھی اسے تو شروع ہی سے ایسے حالات ملے تھے کہ۔ خیر میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخری بات کیا ہوئی تھی۔ جس کا اس نے اس قدر اثر لیا۔ آخر

کیا سوچا تھا اس نے؟''

''مجھے کچھ خبر نہیں ضیاء بھائی' میں تو ہمیشہ ان کی خاطر ہر بات کو' ہر ستم کو پیاسے صحرا کی طرح جذب کرتی رہی ہوں۔ میں رضا کے لیے سوپ لے کر آ رہی تھی کہ اندر سے حیدر اور رضا کی آوازیں آ رہی تھیں۔'' میں تو صرف یہ سنا تھا کہ حیدر کہہ رہا تھا کہ ہمارا حصہ کب ملے گا؟ تو انہوں نے'' اس سے آگے شیریں ایک لفظ ادا نہ کر سکیں مگر ضیاء سب کچھ سمجھ گئے۔

''یہ سارا کیا دھرا صدیقہ ہی کا ہے۔ بگاڑ کر رکھ دیا ہے اس نے بچوں کو۔''

''آپ تو یہ کہہ سکتے ہیں ضیاء بھائی' میں تو اسی خوف سے بھاپ بھی منہ سے نہیں نکالتی پھر بھی۔ پھر بھی۔'' وہ پھر سے بے قرار ہو کر رو پڑیں۔

''ضیاء آپ ہیں؟'' نرس نے آ کر پوچھا۔

''جی۔ جی۔ میں ہوں ضیاء۔'' ضیاء نرس کو دیکھ کر بے قراری سے اٹھ گئے۔ شیریں نے دل تھام لیا۔

''آپ کا فون ہے گھر سے۔''

شیریں کا اٹھا ہوا سانس بحال ہوا۔ ضیا فون سننے گئے اور کچھ دیر بعد پلٹ آئے۔

''سارا کا فون تھا۔ رضا کا پوچھ رہی تھی۔''

''ڈاکٹر۔ شیریں اور ضیاء' رضا کے کمرے سے نکلنے والے ڈاکٹر کی طرف لپکے۔

''ڈاکٹر۔ امید کا دیا تو جلائیں کہ۔ کہ نراس کے ماروں کا۔'' ضیاء بے قراری سے بولے۔

''آس تو سانس تک ہوتی ہے ضیاء صاحب خدا سے دُعا کیجئے۔ فی الحال کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔''

ڈاکٹر آس اور نراس میں ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ شیریں بے دم سی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''حیدر۔ ارے حیدر کہاں ہے؟ ارے کوئی اس نامراد کی خبر لو' کہاں ہے وہ؟'' شاہین کو اچانک ہی حیدر کا خیال آیا جو اس وقت سے غائب تھا۔

''ہاں بھائی حیدر تو نظر ہی نہیں آیا۔ وقاص۔ ایاز۔ کہاں ہو تم لوگ؟'' شیریں وقاص ایاز کو آواز دیتیں باہر آ گئیں۔

''یاسر۔ تم دیکھو' حیدر کہاں ہے؟ جب سے بھیا کو اٹیک ہوا ہے وہ جانے کہاں ہے؟'' سارا نے پریشانی سے کہا۔

''بڑی پھپھو کے ہاں ہوگا جانا کہاں ہے اس نے۔ نہ پھپھو کو چین' نہ اسے قرار۔ انہوں نے تو ہی آج یہ دن دکھایا ہے۔''

''یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں یاسر۔ فوراً جاؤ۔ اس کی خبر لاؤ۔ جانے کہاں ہے' کس حال میں ہے؟''

اب رضا کے ساتھ حیدر کی پریشانی بھی شامل ہوگئی۔

''خدایا۔ خیر کرنا۔''

فون کی گھنٹی پر سارا فوراً فون کی طرف بڑھی۔

''ہیلو'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہاں۔ سارا' میں ہوں فہیم۔

فہیم۔ آپ ہیں۔'' کیسے ہیں رضا بھائی؟ انکو ہوش آیا۔'' وہ بے قراری سے پوچھنے لگی۔

''ہاں۔ ہاں کچھ ہوش میں ہیں۔'' فہیم نے صرف ان لوگوں کی تسلی کے لیے کہا۔

''سنیے فہیم۔ حیدر وہاں تو نہیں؟'' سارا نے بے چینی سے پوچھا۔

''حیدر۔ میں تو اسی کے بارے میں کہنے والا تھا کہ اسے ہسپتال میں بھیج دو۔ چچا جان مکمل ہوش میں آنے کے بعد اگر اسے نہ پائیں گے تو ان کو دکھ ہوگا۔ کہاں ہے وہ؟''

''ہم لوگ بھی اس کے بارے میں پریشان ہیں۔ یاسر کو بھیجا ہے معلوم کرنے۔''

''یہ صدیقہ پھپھو اور حیدر کو تو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ ادھر چچا جان کی جان کے لالے پڑے ہیں ادھر وہ موصوف غائب ہیں۔ اچھا گھر آجائے تو فون کر دینا مجھے۔'' فہیم فون کر کے ہٹا تو شیریں بے حال سی پاس کھڑی تھی۔

''چچی جان۔ کیا بات ہے؟ یہاں بیٹھیں آپ' اللہ تعالیٰ کرم کرے گا۔'' فہیم نے شیریں کو کرسی پر بٹھا دیا۔

''فہیم۔ ڈاکٹر بہت کم پرامید ہیں۔ فہیم اگر۔ اگر تمہارے چچا کو کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی۔''

چچی جان۔ خدا پر بھروسہ رکھیں۔ کچھ نہیں ہوگا ہمارے چچا جان کو۔ ڈاکٹرز بھی تو انسان ہے آخر۔ وہ موت یا زندگی کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتے۔'' پھر فہیم ان کو کتنی ہی دیر سمجھاتا رہا۔

♥♥♥

یاسر' صدیقہ کے گھر جا رہا تھا کہ گھر کے قریب ہی اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اسے گھاس پر پڑے دیکھا۔ یخ بستہ ہوا میں وہ ایک ہی شرٹ میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ یاسر فوراً اس کے قریب آ گیا۔ حالانکہ وہ محض شک کی بنیاد پر آیا تھا مگر یہاں سے اس حالت میں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

''حیدر۔ حیدر یہ۔ یہ کیا ہوا ہے؟۔ کس نے زخمی کیا ہے تمہیں؟'' یاسر اس کی پیشانی اور ہاتھوں پر زخم دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ زخموں سے خون رس رس کر خشک ہو چکا تھا۔ مگر جیسے ہی یاسر نے چھوا۔ خون پھر بہنے لگا۔ وہ بے ہوش پڑا تھا یاسر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کس نے زخمی کیا ہے اور اب کیا کیا جائے۔ اس نے مدد کے لیے چند لوگوں کو بلایا۔

''نہ بابا نہ۔ یہ تو زخمی ہے خدا جانے کیا معاملہ ہے؟ کون ہے؟ کس نے مارا ہے؟ ہمارے ذمے نہ لگ جائے۔''

''یہ۔ یہ میرا بھائی ہے۔ کوئی معاملہ نہیں۔ یہ گھر سے ناراض ہو کر آ گیا ہے اور خود کو زخمی کر لیا ہے۔

آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ میرے ساتھ اسے ہسپتال لے چلیں۔'' یاسر انکے غیر انسانی رویے پر دکھ کرتا منت سے جھوٹ بولتا ہوا بولا۔ تو دو نوجوان آگے بڑھ ہی آئے۔ تو یاسر ان کی مدد سے حیدر کو گھر لے جانے کے بجائے ہسپتال لے آیا۔

''خدایا خیر۔ ضیاء بھائی یہ تو یاسر لگ رہا ہے مگر یہ لڑکوں نے اٹھا کسے رکھا ہے؟'' شیریں نے دھندلی آنکھوں سے دیکھا تو فہیم اور ضیاء برق رفتاری سے یاسر کی طرف بڑھے۔

''یاسر۔ یہ کیا ہوا حیدر کو۔ یہاں تو باپ پہلے ہی موت سے لڑ رہا ہے اور یہ۔''

''ابو۔ ابھی کچھ نہ پوچھیں بس ڈاکٹر کو بلائیں۔ آپ لوگوں کا بہت شکریہ۔ دکھ میں کسی

کے کام آنا انسانیت ہے۔" یاسر نے اُن لڑکوں کا شکریہ ادا کیا تو وہ لوگ چلے گئے۔

"یہ تو خاصے زخمی ہیں۔ لیکن یہ زخم کیسے آئے؟" ڈاکٹر بے ہوش حیدر کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔

"بس ڈاکٹر صاحب' جھگڑا ہو گیا تھا چند لڑکوں سے۔" پھر یاسر کو ایک مختلف کہانی گھڑنی پڑی۔ اور وہ کہتا بھی کیا۔

"اچھا۔" ڈاکٹر نے ایسے کہا جیسے اسے یاسر کی بات کا یقین نہ آیا ہو' میرے خیال میں آپ ان کو گھر لے جائیے یہ ان کے لیے بھی بہتر ہے اور اُنکے والد کے لیے بھی۔ اُن کے بارے میں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ جب تک نیند میں رہیں بہتر ہے۔ ہوش میں آئیں تو یہ دوا دے دیں۔ گاڑی تو ہے غالباً ہے نا آپ کے پاس یا پھر ایمبولینس۔"

"جی نہیں ڈاکٹر صاحب شکریہ۔ گاڑی ہے فہیم تم ان لوگوں کے ساتھ جاؤ اور وقاص اور ایاز کو بھیج دینا اور اس کا دھیان رکھنا جنون میں جانے کیا کر بیٹھے۔"

"جی بہتر۔" یاسر اور فہیم حیدر کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

"کیسے لگی ہیں چوٹیں حیدر کو۔ زیادہ گہری تو نہیں ہیں؟" جیسے ہی ضیاء باہر نکلے شیریں بے چینی سے اُن کی طرف بڑھیں۔

"خدا جانے شیریں۔ یہ میرے بھائی کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کوئی خوشی کیوں نہیں ہے اس کی زندگی میں؟"

حیدر نے جنون میں آکر خود کو نقصان پہنچایا ہے۔ ظاہر ہے بہکائے میں آکر وہ بدتمیزی تو کر جاتا ہے باپ سے۔ بعد میں جب احساس ہوتا ہے تو۔" وہ فکر مند سے لہجے میں بولے۔"

"اللہ تعالیٰ دونوں باپ بیٹوں کو صحت اور زندگی دے۔" ضیاء نے دل کی گہرائیوں سے دُعا کی۔

سارا' ارم' کرن وغیرہ جو رضا کے لیے خدا کے حضور سجدہ ریز تھیں۔ حیدر کو دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔

"کیا ہوا یاسر اسے؟" شاہین اس کی طرف بڑھیں۔

"بھیا۔" ارم اور کرن تڑپ گئیں۔ ثنا دور سے حیدر کو دیکھ کر روتی رہی۔

"فی الحال اسے آرام کرنے دیں۔ ہوش میں آئے گا تو پتا چلے گا یہ زخم کیسے آئے؟ ویسے اس کے ہاتھ سے یہ چاقو پکڑا تھا میں نے۔" یاسر نے چھوٹا سا ایک چاقو جو بہت تیز دھار والا لگ رہا تھا سب کو دکھایا۔

"میرے خدا۔ رحم فرما۔" سارا نے بڑھ کر حیدر کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگایا۔

"ارے صدیقہ کو تو بتا دو۔" فون ہی کر دو۔"

"نہیں شاہین بھابھی۔ انکو ہرگز نہیں بتائیے گا۔ یہ ساری آگ ان ہی کی تو لگائی ہوئی

ہے۔" سارا نے سختی سے منع کر دیا اور تیزی سے فون کی طرف بڑھی جس کی بیل پر سب کے دل اچھل کر حلق میں آ گئے تھے۔

"ہیلو ابو۔ خیریت؟ چچا جان کیسے ہیں؟" فہیم نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر بات کی۔

"وہ تو جیسا ہے ویسا ہی ہے' حیدر کیسا ہے؟" ضیاء اور شیریں حیدر کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

"وہ فی الحال بے ہوش ہے یا شاید انجکشن کا اثر ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ چچا جان کو دیکھیں۔"

آزمائش کی یہ کون سی گھڑی تھی اور کیا چاہتی تھی کہ ایک طرف باپ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا تو دوسری طرف بیٹا بے سدھ پڑا تھا اور ان کے متعلقین ان دونوں سے محبت کی سزا پا رہے تھے سب ہی تو مجبور تھے۔

رات کا تیسرا پہر تھا مگر نیند سب کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' سر سجدہ ریز تھے اور دھڑکنیں دعا گو تھیں۔

دو پیارے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ نظریں اگر حیدر پر تھیں تو کان فون کی گھنٹی پر تھے۔ سارا اور شفق ارم' کرن اور ثنا کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ جنہوں نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے ہوں گے کہ حیدر چیخ پڑا۔

"پپا۔ پپا۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"حیدر۔ حیدر۔ لیٹ جاؤ۔ چچا جان گھر ہی ہیں۔" یاسر نے پھر لٹانا چاہا۔

"یاسر۔ میں نے پپا سے گستاخی کی ہے یاسر' وہ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں ناں۔" وہ وحشت زدہ انداز میں سب کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ اس وقت وہ آرام کر رہے ہیں۔ تم بھی لیٹ جاؤ۔"

"جھوٹ مت بولو یاسر۔ مجھے معلوم ہے پپا کو اٹیک ہوا ہے اور میری وجہ سے۔ میری گستاخی سے۔ میں۔ میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں۔ میری وجہ سے اٹیک ہوا ہے پپا کو۔ میں مجرم ہوں۔ پپا۔ پپا۔" وہ ہیجانی انداز میں چیخ کر بول رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کی سفید پٹیوں سے خون جھلکنے لگا تھا۔

"بے وقوفی کی بات نہ کرو حیدر۔ کچھ نہیں ہوا ہے بھیا کو۔ وہ ٹھیک ہیں بس ذرا۔" سارا اسے سمجھانے لگی۔ خود پر قابو نہ رکھ سکی تو باہر نکل گئی۔

"تائی جان آپ بتائیے ناں' میرا کیا قصور ہے؟ میں گستاخ نہیں ہوں۔ بڑی پھپھو نے کہا وہ عورت جس کا نام شیریں ہے' اس نے میری مما کو مارا ہے تو کیا مجھے اس سے نفرت نہیں

ہونی چاہیے۔ مجھے اپنی مما سے بہت پیار تھا وہ مجھے بے حد یاد آتی ہیں۔ تائی جان' میں دولت کا بھوکا نہیں مگر۔ مگر اس عورت کی وجہ سے۔ تائی جان' بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' وہ تائی جان کی گود میں سر رکھے تڑپ رہا تھا۔

میں جانتی ہوں چاند۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ قصور جس کا ہے وہ تو بے خبر خوش بیٹھی ہے ناں' اپنے گھر میں۔'' شاہین نے اس کا تر چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تائی جان۔ اگر میری وجہ سے میرے پپا جان کو کچھ ہوا تو۔ تو۔''

اسی وقت فون کی بیل ہوئی اور وہ پاگلوں کی طرح فون پر جھپٹا۔

''ہیلو۔ جلدی بتائیے کہ میرے پپا کیسے ہیں۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

''مبارک ہو سب کو۔ رضا کو ہوش آ گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ اب حالت خطرے سے باہر ہے۔'' حیدر کو لگا جیسے جلتی آگ پر کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ وہ فوراً یاسر کو ریسیور پکڑا کر پرسکون ہو کر بیٹھ گیا۔ سب کے دلوں کی دھڑکنیں تھم گئیں۔

''ہیلو ابو۔ یہ کیا بات ہے؟ خیریت ہے ناں؟'' یاسر گھبراہٹ میں بول رہا تھا۔

''ارے ابھی تو بتایا ہے' رضا ہوش میں آ گیا ہے اور خطرے سے باہر ہے۔ حیدر کی طبیعت کیسی ہے؟''

''مبارک ہو' چچا جان کو ہوش آ گیا ہے۔'' یاسر نے پہلے سب کو خوش خبری سنائی تو زندگی ذرا مسکرانے لگی۔ سب خدا کا شکر بجالانے لگے۔

''ہیلو ابو۔ ابھی حیدر ہی نے تو بات کی تھی۔ پہلے تو جذباتی ہو رہا تھا مگر اب ٹھیک ہے فکر نہ کریں۔''

''حیدر چلو بیٹے۔ بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ اور یہ بتاؤ کہ یہ زخم کیسے آئے ہیں؟''

شاہین اسے پکڑ کر بیڈ پر لے آئیں تو اس نے سر جھکا کر بتایا کہ پپا سے بدتمیزی کرنے کے بعد جب ان کو تکلیف ہوئی تو اس نے خود سے انتقام لے ڈالا۔

''ہر معاملے میں جذباتی ہو۔ دل سے سوچتے ہو' کبھی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔ یہ لو دودھ پی لو اب۔''

سارا نے پیار سے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''سارا پھپھو' میں پپا کو ابھی اور اسی وقت دیکھنا چاہتا ہوں۔ یاسر پلیز لے چلو۔'' وہ یاسر کی منت کرتا ہوا بولا۔

''پھر وہی جذباتی پن' کوئی کام ڈھنگ کا نہیں کر سکتے' نہ کسی کی مانتے ہو۔ یہ کوئی وقت ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ چچا جان اب خطرے سے باہر ہیں اور دوسرے اپنی حالت دیکھی ہے۔ یہ پٹیوں میں جکڑا ہوا بوتھا لے کر جاؤ گے تو ان کے بیمار دل پر کیا گزرے گی' تم میں

تو ویسے ہی ان کی جان ہے خبردار جو نام لیا۔ جب تک تمہاری پٹیاں نہیں اتر جاتیں۔ ہرگز تم ان کے سامنے نہیں جاؤ گے بہت دکھ دیتے ہو سب کو۔''

''یاسر۔ میں ان کو کھڑکی سے دیکھ کر آ جاؤں گا۔ وعدہ۔'' وہ بچوں کی طرح مچل رہا تھا۔

''اچھا بابا۔ دن تو ہونے دو۔ چلو اب آرام کرو۔ یہ دوا کھا مرلو۔ مصیبت میں ڈال دیا ہے سب کو؟''

یاسر نے اسے ڈانٹا تو اس نے اچھے بچوں کی طرح دوا کھائی۔

''بھیا۔ اب آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' ارم اور کرن دونوں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''ہاں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ اور پتا ہے پپا بھی ٹھیک ہیں۔'' بات کرتے کرتے اس کی نظر ثناء پر پڑی جو بڑی حسرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ جانے کیوں اسے ڈھیر سا پیار آ گیا اس معصوم سی لڑکی پر جو شفق کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔

''یہاں آؤ میرے پاس۔'' اس نے ثناء کو بلایا تو وہ سہمی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر شفق کا ہاتھ پکڑ کر روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''دیکھا آپ نے پھپھو۔ پھر آپ لوگ مجھے کہتی ہیں کہ میں اسے۔'' اس نے شاکی نگاہوں سے سارا کو دیکھا۔

''بچی ہے حیدر' تمہارے پچھلے رویے کی ڈسی ہوئی ہے بے چاری کو کیا خبر کہ غصے کے دیوتا کو آج اس پر پیار آ گیا ہے' فکر نہ کرو' اسی طرح اسے پیار سے بلاتے رہے تو ضرور آئے گی۔'' سارا نے پیار سے اسے سمجھایا۔

''حضور۔ اگر اجازت دیں تو یہ خادم اور کنیزیں بھی ذرا کمر سیدھی کر لیں؟'' یاسر نے سر کو خم کر کے مسکرا کر حیدر سے پوچھا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

♥♥♥

ایک دن اور ایک رات کی کتنی اذیت ناک گھڑیوں کی چکی میں پسے تھے یہ لوگ۔ رضا مکمل ہوش میں آچکے تھے۔ شیریں کے پاس' شکر خداوندی کے لیے بھی الفاظ نہیں رہے تھے۔ رضا نے ہوش میں آتے ہی حیدر کے بارے میں پوچھا تھا۔

''رضا صاحب' حیدر کو ہم نے خود گھر بھیجا ہے پریشان ہو رہا تھا آپ فکر نہ کریں۔''

ضیاء اور شیریں سے پہلے ڈاکٹر نے کہہ دیا تو وہ دونوں پرسکون ہو گئے۔

''وہ تو ٹھیک ہے نا ڈاکٹر۔؟'' رضا بہت نحیف انداز میں بولے۔

''کیوں؟ اسے کیا ہونا تھا؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے رضا کو دیکھا۔

''وہ مجھ سے ناراض جو تھا۔'' رضا کے ذہن پر اس لمحے کا اثر اب بھی باقی تھا۔

''مسز رضا۔ سنبھالیے اپنے شوہر نامدار کو اور تسلی کرائیے کہ حیدر ٹھیک ہے ہمیں تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے آپ کے شوہر نے۔ او کے ضیاء صاحب میرے خیال میں تو اب آپ لوگ بھی آرام کر لیں۔ رضا اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ٹھیک ہیں اور اب رضا صاحب آپ فی الحال زیادہ باتیں نہ کریں تو بہتر ہے۔'' ڈاکٹر صاحب ان سب کو ہدایت دیتے ہوئے باہر چلے گئے۔

''شیریں۔ تم گھر چلی جاؤ اور تھوڑا آرام کر لو۔ میں یہاں ہوں نا۔''

''نہیں ضیاء بھائی۔ میرا آرام' میرا سکون ان سے وابستہ ہے۔ میں ٹھیک ہوں آپ چلے جائیں تو بہتر ہے۔ ان کی مزید حالت بہلے گی تو میں آرام کر لوں گی۔ آپ گھر جا کر بچوں وغیرہ کو تسلی دیں۔ لڑکیاں تو بے حال ہو گئی ہوں گی۔''

پھر تھوڑی دیر میں فہیم اور سارا آ گئے تو ضیاء گھر چلے گئے۔

''سارا۔ حیدر کیسا ہے؟ کیسے زخمی ہوا تھا؟ اب تو ٹھیک ہے نا؟'' شیریں حیدر کے بارے

میں مسلسل پوچھ رہی تھیں۔'' بہت پریشان تھیں۔

''آپ کو پتا ہے بھابھی' جنونی تو وہ ہے ہی۔ رضا بھیا سے کہیں بدتمیزی کی اور بعد میں جب بھیا کو دورہ پڑ گیا تو اس نے خود کو بھی فگار کر ڈالا۔ ویسے اب تو ٹھیک ہے بھیا کے بارے میں ڈاکٹر مزید کیا کہہ رہے ہیں؟''

رضا شاید سو رہے تھے اس لیے وہ دونوں آہستگی سے باتیں کر رہی تھیں۔

''سارا۔ خدا کا شکر ہے اب ڈاکٹرز مطمئن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کیا ہے ورنہ تو کوئی امید ہی نہیں تھی۔''

شیریں بے سدھ پڑے رضا کو دیکھ رہی تھیں۔

حیدر رات بھر سو نہیں سکا تھا آنکھوں کے سامنے اس روز والا واقعہ گردش کر رہا تھا وہ بار بار خود کو کوس رہا تھا وہ تو کبھی بھی دولت جائیداد کی پروا کرنے والا نہیں تھا پھر اس روز جانے کیا ہو گیا تھا اسے؟

''آئی ایم سوری پپا۔ میں بہت گستاخ بیٹا ہوں آپ کا۔'' اس کے خاموش آنسو تکیے کی نرمی میں جذب ہو گئے۔

اگلے روز حسبِ وعدہ یاسر اسے ہسپتال لے گیا۔

''حیدر۔ حیدر بیٹے' کیسے ہو تم؟ کیوں تم نے ایسا کیا؟'' شیریں بے چینی سے اس کی طرف بڑھیں تو وہ انکی طرف نفرت سے دیکھتا رہا۔

''میری مرضی۔ میں جو مرضی کروں۔ آپ سے مطلب؟'' وہ اپنے اسی اکھڑ لہجے میں بولا تو یاسر کی نظریں جھک گئیں۔

''تم انتہائی ذلیل ہو۔''

''ہاں ہوں پھر؟'' وہ پٹڑی سے اتر چکا تھا۔

''تم سے الجھنے سے تو بہتر ہے بندہ دیوار سے سر پھوڑ لے۔'' یاسر کو غصہ آ گیا تو وہ واپس چلا گیا۔

حیدر آہستگی سے رضا کے کمرے میں آ گیا۔ رضا غنودگی میں تھے وہ دھندلی آنکھوں سے ان کو دیکھتا رہا۔

''سوری پپا۔ سوری۔'' وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا کر روتا رہا۔

اسی وقت ڈاکٹر آ گئے۔ شیریں خاموش کسی تصویر کی مانند کھڑی تھیں ان کو ڈر تھا کہ اگر رضا کو ہوش آ گیا تو حیدر کو یوں پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر برداشت نہ کر پائیں گے مگر وہ اس کو کچھ بھی کہنے کا حق نہیں رکھتی تھیں۔'' اس لیے چپ تھیں تو ڈاکٹر آ گئے۔

''حیدر بیٹے' آپ پڑھے لکھے تو جوان ہیں اور آپ کو علم ہونا چاہیے دل کے مریض کے

سامنے اس قسم کے جذباتی اظہار کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے اور پھر جبکہ آپ خود شدید زخمی ہیں ابھی رضا جاگ جائیں گے تو آپ کو دیکھ کر ان کے بیمار دل کی حالت پھر بگڑ سکتی ہے' اس لیے آپ گھر جا کر آرام کریں۔'' ڈاکٹر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تو وہ خاموشی سے اٹھ گیا اور سیدھا صدیقہ کے گھر چلا گیا۔

''حیدر۔ میرے چاند' میرے بچے' یہ کیا ہوا تمہیں؟'' ''میں صدقے'' صدیقہ حیدر کو پٹیوں میں دیکھ کر تڑپ کر اس کی طرف بڑھیں تو حیدر اپنی پھپھو کے گلے لگ کر بچوں کی طرح رو پڑا۔

''ہائے میں واری۔ کیا بات ہے میرے بیٹے؟'' وہ پریشان ہو گئیں۔

''پھپھو۔ پپا۔''

''کیا ہوا رضا کو؟'' صدیقہ پریشان ہو اٹھیں۔

''ہارٹ اٹیک ہوا پھپھو ان کو'' وہ بمشکل بتا پایا۔

''اب کیسا ہے میرا بھائی؟ وہ چڑیل جو چمٹ گئی ہے نا' وہ نہیں چھوڑے گی۔ رضا کو کھا جائے گی کلموہی' ارے اسے کچھ کیوں نہیں ہوتا۔ سب عذاب میرے ہی بھائی پر ٹوٹتے ہیں۔ چار دن ہو گئے ہیں اور مجھ بدنصیب کو خبر ہی نہیں کی ان ظالموں نے۔''

صدیقہ اسی وقت حیدر کے ساتھ اسپتال پہنچ گئیں اور رونا شروع کر دیا۔

''ہائے میرا بھائی۔ چڑیلوں کے ہتھے چڑھ گیا میرا بھائی۔''

''آپی۔ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ بدشگونی ہوتی ہے۔ رضا اب ٹھیک ہیں۔'' شیریں کو ان کا رونا دھونا قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

''ارے پیچھے ہٹ' میں دیکھ تو لوں اپنے چاند سے بھائی کو'' وہ رضا کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

''آپی۔ رضا کی حالت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے زیادہ باتوں اور ملاقاتوں سے منع کر رکھا ہے پلیز۔'' شیریں نے ڈرتے ڈرتے منع کیا۔

''ہاں۔ ہاں' ہم تو صرف ملاقاتی ہیں۔ ایک سگی ہمدرد تو تم ہی رہ گئی ہو۔ تم ہر وقت اس کے ساتھ رہو۔

اور ہم کبھی آکر بھائی کی صورت نہ دیکھیں۔'' وہ نخوت سے شیریں کو دیکھ رہی تھیں۔

''پھپھو۔ چچی جان درست کہہ رہی ہیں۔ چچا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر ملنے کی اجازت نہیں دے رہے'' فہیم نے ڈرتے ڈرتے شیریں کی حمایت کی۔

''ارے ہٹو۔ میں سب سمجھتی ہوں' تم سب کو جیسی چچی' ویسے تم۔ میں تو رضا کو دیکھے بغیر نہیں جاؤں گی۔ بہن ہوں میں اس کی بڑی۔'' وہ رضا پر اپنا حق جتاتی ہوئی بولیں۔

''کاش تم نے کبھی ہمیں بھائی بھی سمجھا ہوتا۔'' ضیاء جو ابھی آئے تھے وہ بولے تو وہ ان کی طرف گھوم گئیں۔

''میں آپ کے تو منہ لگنا ہی پسند نہیں کرتی۔''

ان کی بات پر ضیاء بڑی مشکل سے غصہ ضبط کر پائے۔ اب اسپتال میں تماشا تو لگوانا نہیں تھا'' اس لیے خاموش رہے۔

''چلیے پھپھو۔ میں آپ کو چھوڑ آؤں۔'' حیدر صدیقہ کا بازو پکڑ کر باہر لاتا ہوا بولا۔

''ہاں بیٹے۔ چھوڑ آؤ۔ میرا دل محبت میں پگھل جاتا ہے ورنہ میں سب جانتی ہوں ان کو جو میری عزت ہے۔ ان بھائیوں نے مجھے آج تک اپنی بہن نہیں سمجھا۔'' صدیقہ آنسو صاف کرتی ہوئی بولیں۔ تو کوئی ان سے یہ نہ پوچھ سکا کہ آپ نے ان کو بھائی نہیں سمجھا یا انہوں نے آپ کو بہن نہیں سمجھا۔ مگر کوئی ان سے کچھ نہ کہہ پایا۔

''حیدر بیٹے۔ تمہاری پہلے ہی طبیعت خراب ہے گاڑی ڈرائیو نہ کرنا۔ کوئی اور چھوڑ آئے گا۔'' شیریں نے لاکھ سوچا کہ نہ بولیں گی مگر یہ بچے خصوصاً حیدر اپنی تمام تر نفرتوں کے ساتھ ان کو بے حد عزیز تھا اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ اسی طرح تڑپتی تھیں جس طرح ثناء کی تکلیف پر' اس لیے کہ وہ جانتی تھیں کہ حیدر بے قصور ہے۔

''اس قسم کے چونچلے صرف پپا کے سامنے ہی کیا کریں۔'' وہ ان کی محبت کے کنول کو نفرت کی بھٹی میں اچھالتا آگے بڑھ گیا تو وہ ٹیس دباتی اندر آگئیں۔ رضا جاگ چکے تھے۔

''شیریں۔ حیدر نہیں آیا؟'' رضا آنکھیں کھولتے ہی حیدر کو دیکھنا چاہتے تھے مگر اتنے زور سے وہ اسے ایک بار بھی نہیں دیکھ پائے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔

اتفاق کی بات ہے رضا' حیدر ابھی ابھی آپ کے پاؤں دبا کر گیا ہے اور پتا ہے رضا' آپ کی بیماری کا یہ فائدہ ہوا کہ حیدر مجھے مما کہنے لگا ہے ابھی کہہ گیا ہے۔'' مما۔ میں پھر آؤں گا آپ پپا کا خیال رکھیں۔''

اپنے الفاظ کے کھوکھلے اور بودے پن کی وجہ سے شیریں رضا سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھیں جو سب کچھ سمجھ رہے تھے۔

''میرے دل کے زخموں کو جھوٹ سے بھرنے کی کوشش نہ کرو شیریں' پتا نہیں میری زندگی میں وہ دن آئے گا کہ نہیں کہ جب۔ جب۔'' رضا کی سانسیں بوجھل ہونے لگیں۔ شیریں نے گھبرا کر فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔

''مسز رضا۔ ارادے کیا ہیں آپ لوگوں کے؟ کیوں مریض کے سامنے جذباتی باتیں کرتی ہیں جن سے انکو نقصان پہنچ رہا ہے۔''

اب وہ ڈاکٹر کو کیا بتاتیں کہ وہ تو اس مریض کی خاطر جان بھی دے سکتی ہیں۔ اسی لیے تو

جھوٹ بھی بولتی ہیں۔ مگر...... مگر ان کا اختیار صرف اپنی ذات تک ہے۔ دوسروں پر نہیں۔

ڈاکٹر دوا دے کر جا چکے تھے۔ ضیاء فہیم اور شیریں انکے پاس تھے۔

"شیریں۔ ضیاء بھائی۔" رضا بہت کمزور اور نحیف آواز میں بولے۔

"رضا۔ کیا بات ہے میرے بھائی' میں پاس ہوں۔" ضیاء نے انکے ہاتھ تھام لیے۔

"صرف یہ کہنا ہے کہ ضیاء بھائی کہ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر میں نہ رہوں تو۔"

خدا کے لیے آگے کچھ مت کہیے گا رضا۔" شیریں تڑپ اٹھیں۔

"تو ضیاء۔ صدیقہ آپی کو میرے جنازے پر نہیں آنے دینا۔ مجھے اس بہن نے بہت دکھ دیے ہیں۔"

رضا کی حالت پھر بگڑ گئی۔

ڈاکٹرز نے شیریں کو گھر بھیج دیا اس بار حالت زیادہ خراب نہ ہوئی تھی رضا پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے سب کی دُعاؤں کے ثمر میں وہ اسپتال سے گھر آگئے۔ سارا اور شاہین نے گھر میں قرآن خوانی اور میلاد کرایا۔ صدقہ خیرات وغیرہ دی گئی۔ رضا آہستہ آہستہ روبصحت تھے۔ کرن' ارم اور ثناء ہر وقت ان کے ساتھ باتیں کرتی رہتیں تو وہ ہنستے رہتے۔

"بھئی۔ یہ شفق بیٹی ناراض ہے کیا ہم سے؟"

"شفق کو شیریں نے دانستہ طور پر ان کے قریب جانے سے روکا تھا تاکہ ان کی اپنی بیٹیاں قریب رہیں مبادا پھر کوئی ہنگامہ ہو۔ وہ بے چاری تو جانے کے لیے مچلتی رہی تھی مگر شیریں نے منع کر دیا۔

"پپا۔ میں بلا کر لاؤں شفق باجی کو۔" ثناء فوراً کھڑی ہوگئی۔

"ضرور بیٹے ضرور۔ پتا چلے وہ ناراض کیوں ہے؟" شفق کو رضا نے جیسے ہی بلایا وہ شیریں کی اجازت سے بھاگی چلی آئی۔

"پپا۔ آپ کیسے ہیں؟ اب کیسا محسوس کرتے ہیں؟ بالکل ٹھیک ہیں نا؟" وہ ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گئی۔

"بس بیٹیوں کی دُعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاپا کو لوٹا دیا ہے پہلے یہ بتاؤ' اتنے دنوں سے پاپا کا خیال نہیں آیا؟ ناراض تھیں کیا؟"

"نہیں پپا۔ وہ پتا ہے میرے ایگزام ہو رہے ہیں۔" وہ صاف جھوٹ بول گئی مگر رضا بھی سب سمجھتے تھے۔

"ارم' کرن تم لوگوں کی دوستیں آئی ہیں۔ جاؤ بیٹھو۔ ثناء تم جاؤ اور بہنوں کی دوستوں کے

لیے اچھی سی چائے بنا کر بھیجو۔" شیریں نے آکر کہا تو ارم' کرن کے ساتھ ثناء بھی اٹھ گئی۔

"پپا۔ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کروں۔ آپ کے پاؤں دباؤں' سر دبا دوں یا کوئی چیز بنا کر لاؤں کھانے کے لیے۔" شفق بڑے پیار سے رضا سے پوچھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔ بس میری بیٹی میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرے۔ خدمت کے لیے ہم نے یہ ملازمہ جو رکھ چھوڑی ہے۔" رضا نے مسکرا کر شیریں کو دیکھا جو ان کی طرف سوپ بڑھا رہی تھیں۔

"سرکار۔ آپ سلامت رہیں۔ ملازمہ ہمہ وقت خدمت کے لیے تیار ہے۔" شیریں نے بھی اسی طرح مسکرا کر جواب دیا تو رضا ہنس دیئے آج وہ بہت بہتر محسوس کر رہے تھے۔ شفق بھی ان کے شانے دباتی ہوئی ہنس رہی تھی کہ صدیقہ اور حیدر اندر آگئے۔ صدیقہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ رضا بھی ان کو دیکھ کر سنجیدہ ہو گئے۔

"کیسے ہو رضا اب؟"

"جی بہتر ہوں۔"

جس طرح روکھے پھیکے انداز میں بہن نے حال پوچھا' بھائی نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ پھر وہ کچھ دیر بیٹھی رہیں۔ رضا کی طبیعت کے باعث کچھ بولیں تو نہیں مگر اندر سے جلتی رہیں بار بار شفق اور شیریں کو گھور رہی تھیں۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رضا نے بھی بیٹھنے کو نہیں کہا۔ شیریں نے بڑھ کر روکنا چاہا تو وہ ہونہہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ حیدر بھی ان کے ساتھ بڑھا۔

"حیدر۔" رضا کی آواز پر حیدر پلٹ کر ان کو دیکھنے لگا۔ وہ اندر سے بہت نادم تھا۔ پپا سے نگاہیں نہیں ملا پاتا تھا۔ "ادھر آؤ بیٹے میرے پاس بیٹھو۔" وہ شفقت سے بولے۔

رضا جانتے تھے کہ وہ بے قصور ہے اور جو کچھ کر رہا ہے وہ صدیقہ کی ایما پر کر رہا ہے اس لیے وہ اس سے قطعی ناراض نہیں تھے۔ وہ آہستگی سے چلتا ان کے قریب آبیٹھا۔ رضا اس کے ہاتھ تھام کر خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔ آج کتنے عرصے بعد انہوں نے حیدر کو دیکھا' اپنے ہوش وحواس میں۔

"یہ۔ یہ کس زخم کے نشان ہیں۔" کیا ہوا تھا؟" وہ ایک دم ہی بے قرار ہو اٹھے۔

"کچھ نہیں پپا۔ بس ذرا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بائیک پر سے پھسل گیا تھا تو۔" وہ ان سے نگاہیں چرا گیا۔

"احتیاط سے۔ احتیاط سے ڈرائیونگ کیا کرو بیٹے۔"

اب پتا نہیں رضا کو حیدر کی باتوں پر اعتبار آیا تھا کہ نہیں وہ اسے سمجھا رہے تھے اور وہ سر جھکائے سن رہا تھا وقفے وقفے سے وہ شیریں اور شفق پر بھی نظر ڈال کر دیکھ لیتا تھا۔ جانے

کیوں اندر ایک الاؤ سا دہک رہا تھا شفق اور شیریں کے مسکراتے چہرے زہر لگ رہے تھے۔ اس سے قبل کہ اس کے منہ سے کوئی شعلہ نکلے اور صرف اس کے پپا ہی جھلس جائیں وہ چلا جانا چاہتا تھا۔

''پپا۔ میں جاؤں؟'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''جاؤ بیٹے۔'' رضا نے دکھ سے اسے دیکھا اور گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ شیریں نے کمبل ان پر درست کر دیا۔

رضا کی بیماری نے گھر بھر کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں اب جب سے وہ صحت یاب ہو کر آفس جانے لگے تھے تو سب کو سکون آ گیا تھا۔ حیدر نے پپا کی صحت یابی کی خوشی میں ایک چھوٹی سی پارٹی ارینج کر ڈالی تو سب ہی اس میں خوشی سے شریک ہوئے۔ پارٹی چونکہ خالصتاً گھریلو تھی۔ اس لیے اس میں کسی دوست کو نہیں بلایا گیا۔ حیدر تو روفی اور نومی کو بھی بلانے کے حق میں نہیں تھا مگر وقاص وغیرہ نے انکو بھی دعوت دی۔ نومی نے تو اپنی مصروفیت کا کہہ کر معذرت کر لی۔ البتہ روفی ضرور صدیقہ کے ساتھ چلا آیا۔

اس موقع پر رضا نے خود ہی اپنی خوشی سے سارا سمیت تمام لڑکیوں کے کپڑے ایک رنگ کے بنائے تھے۔ گہرے سبز جھلملاتے کپڑوں میں سب بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ اس موقع پر لڑکوں کو بھی اپنے بدلے اتارنے کا موقع مل گیا تھا۔ جب ہی تو ایاز نے شینا کی چوٹی اس زور سے کھینچی کہ اس کے آنسو نکل آئے۔

''اوہو۔ تو یہ تم تھیں۔ یقین جانو' میرا نشانہ تم قطعی نہیں تھیں۔ میں سمجھا کہ ارم ہے۔ اس روز اس نے مجھے کنکر مارا تھا ناں' تو میں نے سوچا اس سے انتقام ہی لے لیا جائے۔'' ایاز نے جھٹ جھوٹ گھڑا۔

''انتقام میں آپ اتنے دیوانے ہوگئے ہیں کہ یہ یاد ہی نہیں رہا کہ ارم کی چٹیا نہیں ہے' شولڈر کٹ بال ہیں۔''

''اوہ اچھا چھوٹے بال۔ بھولپن دیکھو میرا کہ پتا ہی نہیں کہ گھر کی لڑکیوں کے بال کیسے ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولتا آگے بڑھ گیا۔

ایاز نے تو خیر دانستہ ایسا کیا مگر حیدر کے ساتھ تو واقعی دھوکا ہوگیا۔ اس نے سوچا سارا اور فہیم کو تھوڑا سا تنگ کیا جائے اسی غرض سے اس نے پیچھے سے آ کر سارا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''کون ہے چھوڑو۔'' وہ چلائی۔

''سارا پھپھو۔ آپ؟'' حیرت سے حیدر کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''پھر یہ کون ہے؟'' اس نے ہاتھ ہٹا کر دیکھا تو شفق اس کو گھور رہی تھی۔ باقی سب ہنس

پڑے' کچھ کو معنی خیز کھانسی آ گئی۔ حیدر بے چارا کھسیانا سا سب کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی سارا پھپھو کے کپڑے پہننے کی۔'' وہ اپنی خجالت مٹاتا شفق کو ڈانٹتا ہوا بولا۔

''غلط بات نہ کیا کرو سب کے کپڑے چچا جان نے ایک جیسے بنوائے ہیں۔'' وقاص شفق کی طرف داری کرتا ہوا بولا۔

''ویسے کیا واقعی تم شفق کو سارا پھپھو ہی سمجھے تھے؟'' یاسر شوخ نگاہوں سے حیدر سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' حیدر دھاڑا۔

''اب اگر مطلب بھی بتا دیا نا تو۔ جانے دو بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے اپنے جذبوں کی تشہیر پسند نہیں کرتے۔'' ایاز بھی اسے چھیڑ رہا تھا مگر کسی بڑی بات کے خوف سے چپ ہوگیا۔ شفق کچھ بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ بات کیا ہے؟ البتہ دل ضرور زور سے دھڑکا تھا۔

رضا بہت خوش تھے' آج ایک عرصے کے بعد گھر میں خوشی دیکھنے کو ملی تھی۔ سب ہی خوش تھے اور دل میں...... دعا کر رہے تھے کہ کوئی بات کسی کی طرف ایسی نہ ہو کہ رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔

کھانے کے بعد انہوں نے حیدر کو اپنے پاس بلا لیا۔

''جی پپا۔'' وہ فرمانبرداری سے سر خم کیے کھڑا رہا۔

''تھینک یو بیٹے۔'' رضا نے پیار سے اسے دیکھا۔

''کس بات کا پپا'' وہ حیرانی سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

''بھئی۔ میرا یہ جشنِ صحت منانے کا' مجھے یہ خوشی دینے کا۔''

''یہ آپ پر احسان تو نہیں پپا۔ آپ کی صحت اور زندگی سے ہماری خوشیاں وابستہ ہیں پپا۔''

جیتے رہو بیٹے' میری خوشیاں تم لوگوں سے وابستہ ہیں۔ بس خوش رہو' آباد رہو۔'' رضا نے پیار سے حیدر کے شانے سہلائے۔

''ارے بھئی' باپ بیٹا ایک دوسرے کو خوشیاں بانٹتے رہیں گے یا ہماری بھی سنیں گے۔''

''آپ بھی سنائیے' کیا چاہتی ہیں؟'' رضا نے مسکرا کر شیریں کی طرف دیکھا۔

'''' جناب۔ آپ حیدر بیٹے کو کچھ دینے والے ہیں۔'' شیریں نے یاد دلایا۔

''اوہ ہاں۔ خوب یاد دلایا۔ چلو تم خود دے دو اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو۔'' رضا نے ان پر ذمہ داری ڈال دی تو۔ ایک لمحہ کے لیے شیریں کے ہاتھ لرز گئے۔ حیدر حیران تھا کہ آخر کون سی ایسی چیز ہے؟

"یہ لو بیٹے تمہاری اسپورٹس کار کی چابیاں۔" مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا لیکن چونکہ چابیاں شیریں کے ہاتھ میں تھیں اس لیے خوشی کا شعلہ دھیما پڑ گیا۔ آنکھوں کی چمک بھی پھیکی پڑ گئی۔ رضا اور شیریں ہی محسوس کر رہے تھے۔

حیدر نے بے دلی سے چابیاں لے کر جیب میں ڈال لیں یوں جیسے بے معنی سی چیز ہو۔

"شکریہ ادا نہیں کرو گے اپنی مما کا بیٹے۔ اصل میں تو انہوں نے ہی مجھے مجبور کر دیا تھا کہ تمہیں یہ کار لے کر دی جائے۔"

"ہاں تاکہ ایکسیڈنٹ ہو اور ان کا رستہ صاف ہو جائے۔" صدیقہ کی تلخ بات پر رضا کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ شیریں فوراً ان کو اندر لے گئیں باقی سب زہریلی نگاہوں سے ان کو گھور رہے تھے۔

"آپ نے کیوں قسم کھا رکھی ہے کہ اس گھر کو کوئی خوشی نصیب نہیں ہونے دینی۔" سارا چیخ پڑی۔

"بخش دو صدیقہ اب تو ہماری خطا معاف کرو۔ پہلے ہی رضا موت کے منہ سے لوٹے ہیں۔ کیسی بہن ہو تم؟" شاہین بھی برداشت نہ کر سکیں تو سخت لہجے میں بول پڑیں۔

کچھ دیر قبل سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اب سب افسردہ کونوں سے جا لگے تھے۔

حیدر بھی بوجھل قدموں سے آکر بستر پر لیٹ گیا۔ پتا نہیں پھپھو کو ایسی بات کہنی چاہیے تھی یا نہیں۔

پتا نہیں اس کا پپا پر کیا اثر ہوا ہوگا وہ ابھی تو۔ بیماری سے اٹھتے ہیں۔ پھپھو کو ایسی بات کم از کم پپا کے سامنے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اس بات کو سوچتا رہا۔ پھر اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چابیوں پر پڑی۔ آج اس کی زندگی کی کتنی بڑی خواہش کتنے چپکے سے پوری ہوگئی تھی۔ مگر دل اسی قدر بجھا ہوا تھا کیا ہی اچھا ہوتا کہ پپا خود ہی اپنے ہاتھوں سے دیتے۔ ان سے کیوں دلوائی چابی' کاش۔ کاش۔ یہ چابیاں میری تیری اپنی مما دیتیں تو میں ان کے ہاتھ چوم لیتا۔ لیکن آہ میری مما۔

رات جانے کتنی دیر سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ رات بھر اسے پپا کی فکر ستاتی رہی۔ صبح چھ بجے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تو کافی عرصے کے بعد اس نے نماز ادا کی۔ پپا کی صحت کی دعا کی۔ ان کی خیریت معلوم کرنے ان کے کمرے میں آیا۔ اسے وہم سا ہو گیا تھا اور کچھ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ پپا کے لیے ذرا سی بات بھی نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ رضا تو کمرے میں نہیں تھے البتہ شیریں تلاوت کر رہی تھیں۔ سفید دوپٹے میں لپٹی شیریں کو جانے کیوں حیدر کچھ دیر خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ شیریں کو احساس ہوا تو وہ مڑ کر دیکھنے لگیں۔

"ارے حیدر بیٹا' کیا بات ہے؟ اندر آؤ۔" ان کے شیریں لہجے میں مٹھاس اور چہرے پر اتنا تقدس اور ملاحت تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ جانے کیوں نگاہیں جھک سی گئیں۔

"حیدر بیٹے پریشان ہو' کیا بات ہے؟" شیریں نے قرآن پاک کو بوسہ دے کر الماری میں رکھا اور حیدر کے قریب آگئیں۔

"جی کچھ نہیں' پپا کہاں ہیں؟ ان کی طبیعت کیسی ہے؟" یہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اس نے اتنی نرمی سے شیریں سے بات کی تھی۔

"تمہارے پپا لان میں ہوں گے اور بالکل ٹھیک ہیں۔ کیوں کوئی خواب دیکھ لیا تھا بیٹے نے۔" وہ ہی پھوار کی سی ٹھنڈک والا لہجہ حیدر نے ایک نظر ان پر ڈالی۔

"جی نہیں بس ایسے ہی۔" وہ آہستگی سے کہتا باہر نکل گیا۔ ورنہ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ان کی محبت کے جواب میں نفرت کے تیر ان پر اچھالتا آگے بڑھ جاتا۔ مگر آج تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شیریں بھی حیرانی سے اس کی پشت کو دیکھتی رہیں۔

"میں تیری رحمت سے مایوس نہیں ہوں پاک رب عظیم مجھے امید ہے نفرت اور محبت کی اس جنگ میں فتح محبت ہی کو نصیب ہوگی۔ انشاء اللہ۔"

آج ایک مدت کے بعد ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کسی جھروکے سے اندر آیا تھا۔ انہوں نے تشکر سے آنکھیں موند لیں انہوں نے آتے ہی رضا کو یہ بات بتائی تو وہ بھی آسودگی سے مسکرا دیئے۔

"آج آپ نے یہ نہیں کہا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"اس لیے شیریں کہ آج تم واقعی سچ کہہ رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر چمکتی سحر ہی تمہاری سچائی کا ثبوت ہے۔ میرے بچے بہت اچھے ہیں شیریں۔ وہ تو۔ کیا کہوں اب بڑی بہن ہے ورنہ۔"

"میں جانتی ہوں جناب' ہمارے بچے بہت اچھے ہیں' اس لیے تو مجھے کسی سے گلہ نہیں۔ میں تو اپنے خلوص کو پرکھ رہی ہوں۔"

"خدا کرے شیریں تم اپنی اس آزمائش میں کامیاب ہو جاؤ۔" رضا کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلی۔

"آمین۔" شیریں نے صدق دل سے آمین کہا۔

صدیقہ جب سے ناراض ہو کر گئی تھیں پھر نہیں آئیں اور نہ ہی حیدر گیا اور یہ بات وہ کیونکر برداشت کر سکتی تھیں کہ حیدر ان کو اگنور کرے۔ بس وہ اس کے آنے کی ہی منتظر تھیں اور وہ جو ہر وقت اپنی نئی کار میں اڑتا پھرتا۔

اس نے اپنی گاڑی میں سب کو ہی سیر کرائی تھی خوش بھی بہت تھا وہ اسپورٹس کار پا کر۔

اس روز ثناء کی کسی دوست کی سالگرہ تھی اور وہ تیار ہو کر گفٹ پیک پکڑ کر انتظار کر رہی تھی کہ کوئی آئے تو اس کو لے جائے۔ مگر اتفاق سے کوئی بھی گھر پر نہ تھا۔ اسی وقت حیدر چابیاں گھماتا' سیٹی بجاتا آ گیا تو اس پر نظر پڑی۔ پہلے تو بڑھنے لگا۔ جانے کس خیال کے تحت پلٹ آیا۔ ثناء سہم گئی کہ اب جانے کیا کہہ ڈالے۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ بولتا بھی تو اس سے ایسا ہی تھا جیسے وہ کوئی غیر ہو یا اس کی دشمن۔

''جی وہ۔ میری دوست کی برتھ ڈے ہے وہاں جانا ہے۔'' وہ ڈرتے ڈرتے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو جا کیوں نہیں رہیں؟''

''جی بھیا۔ وہ اشعر بھیا نے کہا تھا لے جانے کو مگر وہ تو۔''

''وہ تو میچ کھیلنے گیا ہوا ہے۔'' اس نے اطلاع فراہم کی۔

''اچھا۔ پھر نہیں جاتی۔'' ثناء بری طرح مایوس ہو گئی۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی آخر اس کی بڑی اچھی دوست کی برتھ ڈے تھی اور کتنا اصرار کیا تھا اس نے آنے کو۔ حیدر نے اسے دیکھا تو جانے کیوں اسے وہ اس وقت بہت اچھی لگی۔ ڈھیر سارا پیار آ گیا اس پر۔

''ثناء۔'' وہ اسے پکار اٹھا۔

''جی بھیا۔'' وہ فوراً پلٹی۔

''آؤ۔ میں چھوڑ آؤں۔''

''جی۔ جی آپ۔'' مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''نہیں بھیا' رہنے دیں۔ میں جاتی ہی نہیں۔'' کسی خیال کے تحت اس نے انکار کر دیا تو حیدر نے گھور کر اسے دیکھا۔

''جب میں نے کہا ہے آؤ چھوڑ آؤں تو یہ انکار کیا مطلب رکھتا ہے۔ احترام نہیں تمہیں بڑے بھائی کا۔''

ثنا پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے خود حیدر کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کو کبھی بہن نہ تسلیم کرنے والا خود بڑا بھائی بن رہا تھا اس وقت ثنا کا جی چاہا کہ وہ اس خوبرو سے بھیاء پر جان قربان کر دے۔ حیدر نے اس کو بہن مان لیا' یہ اس کے لیے بہت بڑی بات تھی۔

''چلیں بھیا۔'' ثناء بے پایاں خوشی کو چھپاتی ہوئی آ گئی۔ اپنے کمرے میں کھڑے شیریں اور رضا اس خوشگوار منظر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

''خدایا۔ تیری رحمت سے مجھے یہی امید تھی۔ رضا آپ نے دیکھا' نفرت کے بادل چھٹ گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے محبت کی سحر بھی جلد ہی طلوع ہو گی۔''

''انشاءاللہ۔'' رضا بھی اس دُعا میں شریک ہو گئے۔

سحر ہونے میں ابھی شاید کچھ دیر باقی تھی جب ہی تو صدیقہ نے حیدر اور ثناء کو دیکھ لیا تھا جب وہ پارٹی سے واپس آ رہے تھے۔

''آداب پھپھو۔ آپ اتنے دنوں بعد آئیں۔ کیا حال ہیں آپ کے؟'' حیدر لپک کر پھپھو کی جانب بڑھا تو انہوں نے بڑا سا منہ بنا لیا۔

''تمہیں کیا۔ پھپھو جیے یا مرے اتنا نہ ہوا کہ خیر خبر ہی لے آتے پھپھو کی۔ رہنے دو یہ منہ دیکھنے کی محبتیں۔''

''اوہو۔ میری پھپھو ناراض ہو گئیں۔ سوری پھپھو۔ سوری۔ پتا ہے ناں۔ آپ کو میں نے کار لی ہے تو بس اس میں سب غریب غرباء کو جنہوں نے کبھی کار نہیں دیکھی ان سب کو سیر کراتا رہا اسی لیے۔'' حیدر نے باقی سب کو دیکھ کر شرارت سے کہا۔

''چلیے۔ اب آپ کی باری ہے۔ آیئے آج آپ کو گاڑی۔''

''رہنے دو میں تو قدم نہ رکھوں اس کار میں۔ میں سب جانتی ہوں۔ وہ اب تم پر جال پھینکنے والی ہے۔

تم کمرے میں آؤ اور میری بات سنو۔''

صدیقہ کسی اور کے پاس ٹھہرنے کے بجائے سیدھی حیدر کے کمرے میں چلی گئیں۔

''وہ تم نے پھر بات کی جائیداد کی؟''

''نہیں پھپھو۔ میری توبہ' جو آئندہ میں ایسی بات بھی کروں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے پھپھو' میرے پپا سلامت رہیں۔ یہ بھی بہت ہے میرے لیے۔'' صدیقہ کی بات پر حیدر اندر تک کانپ گیا۔ اس روز والے مناظر گھوم گئے تو وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا بولا۔

''اپنے لیے نہ سہی۔ مگر اپنے بہن بھائیوں کا تو خیال کرو۔ اشعر کو تو اس نے بچپن ہی سے قبضے میں کر رکھا ہے مگر بہنوں کا سوچ بیٹے' آخر ان کی شادیاں ہونی ہیں تو ان کو کیا دو گے؟'' صدیقہ یوں کہہ رہی تھی کہ گویا بہنوں کی ذمہ داری اسی پر ہے۔

''یہ میرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں پھپھو۔ پپا کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔''

''اور پپا تو وہ ہی کرے گا جو اس کی بیگم کہے گی۔'' صدیقہ کی باتوں کی گرد سے حیدر کا شفاف ذہن پھر دھندلانے لگا اور پھپھو تو درست کہہ رہی تھیں۔ اگر واقعی پپا نے شیریں کے کہنے پر عمل کیا تو کیا بنے گا۔ اس کی بہنیں تو واقعی محروم رہ جائیں گی ہر چیز سے لیکن پپا سے بات بھی تو نہیں کی جا سکتی۔ اتنی خطرناک بیماری جو لگ گئی ہے۔

''پھپھو۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں میں؟'' وہ بے بس ہو جایا کرتا تھا

پھپھو کی باتوں کے سامنے۔

''وقت آنے دو۔ میں خود ہی بتا دوں گی کہ کیا کرنا چاہیے تمہیں؟''

وہ اسے ذہنی الجھنوں کے جال میں پھنسا کر چلی جاتیں اور وہ ان سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہ جاتا۔

صدیقہ اس گھر کا ایسا کردار تھیں جو ان لوگوں میں شمار ہوتی تھیں جو دوسروں کو ہنستا کھیلتا نہیں دیکھ سکتے۔ بلاوجہ کی نفرت سے دوسروں کو جلا کر راکھ کر دیتیں۔ اور ایسے لوگ کتنے خسارے میں رہتے ہیں اگر جان لیں تو شاید ایسا نہ کریں۔ اسی طرز عمل سے صدیقہ کے اپنے ان کے خلاف ہو گئے تھے' وہ جب آتیں سب ایک ہنگامے کے خوف سے لرز جاتے۔ خود ان کی اپنی بیٹی ان سے نالاں تھی تو دوسروں کی بات ہی کیا تھی۔

''اب تو کوئی ہنگامہ ہونا چاہیے گھر میں۔''

''اپنی بڑی پھپھو کو بلا لاؤ۔ ہو جائے گا ہنگامہ۔'' سارا نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہماری مراد خوشگوار ہنگامے سے ہے سارا پھپھو۔ آپ دونوں کی شادی منگنی چاہتے ہیں ہم لوگ۔''

یاسر کشن گود میں رکھ کر بولا۔

''یاسر۔ میرے اور تمہارے خیالات کیوں ملنے لگے ہیں؟'' وقاص نے حیرت سے یاسر کو دیکھا۔

''ہاں۔ بڑے لوگوں کے خیالات سے مماثلت تم جیسے فقراء کی عادت جو بنتی جا رہی ہے۔'' یاسر نے مسکرا کر کہا تو وقاص نے اسے مکا جڑ دیا۔

''بس کچھ بھی ہو۔ اب تو ہم گھر خوشگوار ہنگامہ کر کے ہی دم لیں گے۔'' ارم' شینا ایک ساتھ بولیں۔

''لیکن اس ہنگامے کے لیے تم لوگوں کو پھر اسی چیک پوسٹ سے اجازت لینا ہو گی۔'' جو مجھے قطعی پسند نہیں کرتی۔'' فہیم کا اشارہ صدیقہ کی جانب تھا۔

''آپ چپ رہیں بدشگونی کی باتیں منہ سے نہ نکالیں' ان کو ضرور ماننا پڑے گا آخر ان کو اعتراض کیا ہے؟ جب۔''

''جب لڑکا' لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟'' ایاز نے مسکرا کر کہا تو سارا شرما گئیں فہیم کی نگاہیں بھی شوخ ہو گئیں۔

''تمہیں کس نے کہہ دیا کہ۔ کہ۔'' سارا کچھ کہنے لگی تھی مگر پھر کہہ نہ سکی۔

''بس رہنے دیں پھپھو۔ ہم جان گئے' ہم پہچان گئے۔'' حیدر بھی شوخی سے بولا۔

''شفق باجی۔ آپ کا فون ہے۔ وہ رونی بھائی ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔'' ثناء کی آواز

پر شفق آہستگی سے اٹھ کر آ گئی۔ حیدر نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور پیچھے چلا آیا۔

''اب ہو گا کوئی تماشا۔''

یاسر کسی ممکنہ ہنگامے کے پیش نظر باہر آ گیا اسے معلوم تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرے گا جس سے شفق سے لڑائی ہو۔ کافی دنوں سے ان دونوں کے درمیان تکرار جو نہیں ہوئی تھی وہ فون پر بات کر رہی تھی اور اس نے آخر فل آواز میں ٹیپ ریکارڈ لگا دیا۔

''یاسر پلیز۔ ذرا آواز آہستہ کر دو۔'' شفق نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر یاسر سے کہا' یاسر آگے بڑھا تو حیدر نے اسے وہیں روک دیا۔

''ٹیپ ریکارڈ میں نے لگایا ہے یاسر آہستہ کرنے کا حق نہیں رکھتا ہمت ہے تو خود آ کر کر دو یا مجھ سے درخواست کرو۔'' وہ قالین پر ٹانگیں پسارے دانتوں میں ٹوتھ پک دبائے کہہ رہا تھا۔

''تم سے تو میں بات کرنا پسند نہیں کرتی تو درخواست تو بڑی دور کی بات ہے۔'' وہ بھی اسی انداز میں بولی تو وہ اٹھ کر آیا اور فون ڈس کنیکٹ کر دیا۔

''کیوں کرتا ہے وہ فون تمہیں؟'' کیا رشتہ ہے تمہارا اس سے؟'' وہ دھاڑا تو شفق سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

''تمہارا کیا رشتہ ہے مجھ سے جو اس انداز میں بات کرتے ہو؟'' شفق کی آنکھیں بھیگ گئیں آواز لرز گئی۔

''میرا تم سے رشتہ۔؟'' وہ کچھ کہنے لگا پھر خاموش ہو گیا۔ شفق اپنے کمرے میں آ گئی۔

''بدتمیز جنگلی۔ جانے خود کو سمجھتا کیا ہے۔ خدا کرے۔ خدا کرے۔''

پھر وہ کوئی بددعا دیتے دیتے رہ گئی۔ پتا نہیں کیوں دنیا جہاں سے بدتمیز اکھڑ سا شخص جس نے اس کی پیاری سی خالہ جانی اور منی سی ثناء کو ہمیشہ تنگ کیا' جلایا' ستایا' رلایا۔ مگر وہ کبھی اس کے لیے کوئی بددعا یا بدفال نہیں نکال سکی۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ کبھی بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا اپنے گھر چلی جائے۔ اپنا گھر' والدین' بہن بھائی سب ہی تو تھے اس کے۔ بہن بھائی تو بارہا اسے لینے آئے تھے اور حیدر کی بدتمیزی کی وجہ سے وہ تیار بھی ہو جاتی تھی مگر پھر شیریں کو اداس دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیتی۔ لیکن اب وہ واپس جانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی وہ کتنی ہی دیر روتی رہی۔

''قسم سے بڑے ذلیل آدمی ہو تم۔'' یاسر نے گھور کر حیدر کو دیکھا جواب بڑے سکون سے کسی گیت کی دھن پر آنکھیں موندے پاؤں ہلا رہا تھا۔

''کوئی نئی بات کرو خاص پرانی خبر ہے یہ تو۔'' وہ ویسے ہی آنکھیں موندے بولا تو یاسر کو غصہ آ گیا۔

''تمہیں کیا تکلیف پہنچتی ہے؟''

''کس بات سے؟'' اب وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''جب روفی شفق سے بات کرتا ہے یا وہ کرتی ہے۔''

''بس میں پسند نہیں کرتا کہ روفی اس سے بات کرے یا وہ اس سے کرے۔'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

''حیدر تم اتنے پھڈے باز کیوں ہو یار؟ جب تم خود جو اس لڑکی کو پسند نہیں کرتے تو تمہاری بلا سے کوئی اس سے بات کرے یا پسند کرے، تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔''

''تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں اسے پسند۔'' وہ کچھ دیر کو رکا اور لمبا سا سانس لیا اور کھڑکی کی طرف رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ یاسر مسکرانے لگا۔

''ہوں۔ تو گویا یہ بات ہے خیر یہ بات تو ہمیں معلوم تھی کہ تم اسے پسند کرتے ہو پھر اس ڈرامہ بازی کا کیا مطلب ہے؟'' یاسر اس کی ان کہی بات پر ہی اس کے سر ہو گیا۔

''میں نے کبھی کہا کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھے اس کی طرف مڑا۔

''اچھا تو یہ کیسی محبت کہ۔؟''

''میں نے یہ کب کہا کہ مجھے اس سے محبت ہے؟''

''حیدر۔ تم وہ سوال ہو جسے سمجھنا انتہائی مشکل ہے۔'' یاسر آگے بڑھنے لگا تو حیدر اس کے سامنے آ گیا۔

مجھے صرف اس لیے چڑ ہے کہ وہ اس خاتون کی منظور نظر ہے۔''

اس سے قبل کہ یاسر اسے اچھی خاصی سناتا۔ یاسر کو ضیاء نے بلا لیا۔ آج کل گھر میں پھر سے فہیم اور سارا کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ سب سے زیادہ رضا جلدی کر رہے تھے۔

''بھائی جان۔ اب ذرا بھی دیر نہیں ہونی چاہیے میں اب گھر میں خوشی دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ دیکھ نہیں سکتے کہ میرے دل پر کتنے زخم ہیں۔'' رضا نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

''اس میں مایوسی کی کیا بات ہے۔ تم جب کہو ہم شادیانے بجوا دیں گے مگر یہ صدیقہ پھر سے ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ اسی سے ڈر لگتا ہے ضیاء نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''اب کچھ بھی ہو بھائی جان۔ وہ کچھ بھی کہیں سارا ہماری بیٹی ہے۔ ہم اس کے لیے جو مناسب سمجھیں گے کریں گے اور فہیم سے بڑھ کر سارا کے قابل کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کو بیٹی تسلیم نہیں کرتیں تو اس کے رشتے بھی طے کیوں کرنے لگیں ہم اپنی مرضی کریں گے۔''

رضا کی سوچ اب باغیانہ ہوتی جا رہی تھی اور پھر انہوں نے تو انسانی برداشت سے باہر نامساعد حالات دیکھے اور برداشت کیے تھے وہ اس بہن کے ہاتھوں پل پل اذیت کی بھٹی میں

جلے تھے۔

''رضا ٹھیک کہہ رہا ہے ضیاء۔ اب ہم بس رسمی طور پر صدیقہ سے بات کریں گے اور وہ مانے یا نہ مانے تب بھی ہم فی الحال منگنی کر دیں گے اور کچھ عرصے بعد شادی بھی کر دیں گے۔ اب ماشاء اللہ بچوں کی عمر ہے شادی کی۔ وہ اگر ساری عمر نہ مانے گی ساری عمر سارا یونہی بیٹھی رہے گی۔''

اس بار شاہین اور شیریں بھی رضا' ضیاء کے ساتھ صدیقہ کے گھر گئیں تو حسب توقع انہوں نے شیریں کو دیکھ کر ایسا منہ بنایا کہ وہ۔۔۔۔ شرمندہ ہو گئیں البتہ روفی شیریں کے آنے سے بے حد خوش ہوا۔

''آنٹی۔ آپ ہمارے ہاں پہلی بار آئی ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ کی بہت خاطر کروں مگر۔''اس کے معصوم لہجے میں کیسی حسرتیں کتنی مجبوریاں تھیں۔ وہ محسوس کر رہی تھیں۔

''جیتے رہو بیٹا۔ میں سب جانتی ہوں۔ تمہاری یہ محبت ہی بہت ہے۔'' شیریں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔

''صدیقہ۔ اس سے قبل بھی ہم تم سے بات کر چکے ہیں کہ ہم سارا اور فہیم کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

ضیاء نے بات شروع کرتے ہوئے کہا تو صدیقہ کی تیوریوں پر بل گہرے ہو گئے۔

''ایک بات بتائیں کیا آپ کے لڑکے کو کوئی دوسری لڑکی نہیں مل سکتی یا سارا کے لیے لڑکوں کا کال پڑ گیا ہے جو دونوں کی شادی فرض ہو گئی۔ صدیقہ کی اس بات پر رضا غصے سے کھڑے ہو گئے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ حیدر بڑی جلدی میں آیا۔

''پپا۔ جلدی سے گھر چلیں۔ سارا پھپھو کے ابو آ گئے ہیں۔ گھر میں بیٹھے ہیں۔''

''صغیر احمد۔''

رضا اور ضیاء کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

صغیر احمد۔؟'' صدیقہ بھی جیسے خواب کی سی کیفیت میں بولیں۔'' کیوں آیا ہے وہ شخص؟'' اس کا کیا تعلق ہے اب میرے گھر سے؟

''صدیقہ۔ اول تو یہ ہے کہ وہ تمہارے نہیں' ہمارے گھر آیا ہے اور دوسرا وہ اس گھر میں آنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس گھر میں اس کا بہت بڑا سچا اور کھرا حوالہ ہے' واسطہ ہے' تعلق ہے' رشتہ ہے۔ سارا کی صورت میں۔'' ضیاء نے بڑے کٹیلے لہجے میں تیز نگاہوں سے صدیقہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سارا میری بیٹی ہے ضیا بھائی۔ اور میں آپ کو یہ حق نہیں دیتی کہ آپ میری بیٹی کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں یا وہ شخص جو برسوں بعد جانے کہاں سے خوار ہوتا ہوا آیا ہے وہ میری بیٹی کا حقدار بن جائے۔ یہ میں نہیں ہونے دوں گی۔ سن رکھیں آپ سب۔'' صدیقہ فیصلہ کن انداز میں بولتی اٹھ کھڑی ہوئیں تو سب بس ان کو دیکھ کر رہ گئے۔

''بھائی جان پلیز چلیے ہم لوگ یہاں ہیں۔ صغیر بھائی کیا خیال کریں گے۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔'' شیریں کو صغیر احمد کا خیال آ رہا تھا اس لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہونہہ۔ آ گئی تمہیں سے گھر والی۔ تم کم از کم میرے معاملے میں مت بولا کرو۔ میں نے جب تمہیں کسی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کیا تو؟''

''آپی۔'' رضا ہر لحاظ ہر ادب بالائے طاق رکھ کر پوری قوت سے چلائے۔

''آپی۔ شیریں میری بیوی ہے اور اس حیثیت سے آپ کی بھاوج ہے۔ اگر آپ کو اس کی حیثیت سے انکار ہے تو پھر آپ کو مجھ سے تعلق سے بھی انکار ہوگا؟''

برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جب حد ختم ہو جائے تو پھر انسان بے سوچے سمجھے بولے چلا جاتا ہے اور رضا وقت اور حالات کی چکی میں پس کر بے حس ہو گئے تھے کہ کہاں وہ

بڑی بہنوں کو جواب دینا گناہ سمجھتے تھے آج اتنی بڑی بات کر رہے تھے۔

''ہاں انکار ہے۔ پھر کر لو جو کرنا ہے۔ تم نے کب مجھے بڑی بہن سمجھا ہے؟'' وہ اور بھی بہت کچھ بولتی رہیں۔ مگر وہ سب لوگ اٹھ کر آ گئے۔ اور اب برسوں بعد صغیر احمد کے روبرو خاموش بیٹھے تھے۔

گزرے برسوں کے بدلتے موسموں نے کتنا بدل دیا تھا سب کو۔ چہرے کے خدوخال ہی اور ہو گئے تھے۔ سب خاموش بیٹھے ایک دوسرے کے بولنے کے منتظر تھے کیا بولیں اور کس موضوع پر بات کریں۔ کیا پوچھیں کہ اتنے برسوں بعد کیسے آنا ہوا؟

''صغیر صاحب۔ اتنے برسوں بعد آج کیسے یاد آ گئی آپ کو؟'' ضیاء ہی نے بات کرنے کی ابتداء کی تو صغیر احمد نے خاموش نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

''یادیں تلخ ہوں یا شیریں ضیاء صاحب! دونوں صورتوں میں تڑپاتی ہیں اور ماضی نے میرے دامن میں تلخ یادوں کی جو سوغات ڈالی تھی۔ میں۔ میں۔'' بولتے بولتے صغیر احمد رک گئے یوں جیسے کوئی مسافر میلوں کی مسافت کے بعد تھک کر کسی سایہ دار درخت کے نیچے دم لیتا ہے۔

''صغیر تو کیا تم نے دوسری۔''

''نہیں ضیاء بھائی' شادی ایک جوا ہوتا ہے جو ایک بار اس بازی میں ہار جاتا ہے میرے خیال میں دوسری بار وہ۔ وہی تجربہ کرنے کی حماقت نہیں کرتا۔ اور مجھے تو ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ۔ خیر اب زخموں کو کریدنے سے زخم ہی ہرے ہوں گے۔ حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ شاید آپ لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال ہو کہ میں کیوں آیا ہوں یا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا یا یہ کہ میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رہا تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بلاشبہ ظاہری طور پر تو میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرا اس گھر سے اٹوٹ تعلق ہے' گہرا رشتہ ہے اس وقت تک جب تک میری بیٹی سارا یہاں ہے۔ کیا آپ لوگ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں؟''

''نہیں صغیر۔'' اس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ سارا تمہاری بیٹی ہے اور تمہارا اس گھر سے تعلق ہمیشہ رہے گا۔ ہم بھلا کیوں کہنے لگے کہ تم کیوں آئے ہو' ہم جانتے ہیں ماضی میں جو کچھ بھی ہوا۔ اس میں بھی تمہارا قصور نہیں تھا۔ مگر کیا کیا جائے جو باتیں تقدیر میں لکھ دی جائیں ان کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔''

''ضیاء بھائی' کیا میں اپنی بیٹی سے نہیں مل سکتا؟ کیسی ہے میری بیٹی؟ وہ مجھے قبول بھی کرے گی یا نہیں؟'' ضیاء احمد بے قراری سے ایک ساتھ کئی سوال کر بیٹھے۔

''صغیر بھائی' ہم آپ کو آپ کی بیٹی سے ملا دیتے ہیں۔ باقی باتیں آپ خود ان سے پوچھ

لیں۔''

رضا اور شیریں اٹھ کر باہر آئے۔

''سارا بیٹے۔ جاؤ اندر اپنے ابو سے ملو۔'' رضا نے آہستگی سے سارا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے ان ابو سے ملنے کے لیے اٹھی جن سے ملنے کی خواہش اب کسک میں بدل گئی تھیں اور جن کے ملنے کی دعائیں ہر دھڑکن نے کی تھیں۔ آج جب اس کی دعائیں اس کے ابو کی صورت میں آن موجود ہوئی تھیں۔ تو وہ خدا کا شکر ادا کرتی صغیر احمد سے لپٹ گئی۔ مدتوں کے بچھڑے باپ بیٹی ملے تو ہر چیز اشکوں کی دھند میں دھندلا گئی۔

''میری بیٹی۔'' صغیر احمد نے اپنے ہاتھوں سے سارا کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ابو۔ آپ کہاں رہے اتنی مدت؟'' آپ کو اپنی بیٹی کی یاد نہیں آئی؟ میں آپ کے لیے کتنا تڑپا کرتی تھی۔ آپ کہاں تھے ابو؟'' سارا مچل مچل کر رو رہی تھی۔ اس نے تو ماں اور باپ دونوں کے پیار کی چھاؤں نہیں دیکھی تھی۔

''میری بیٹی' تمہاری یاد کے سہارے ہی تو اب تک زندہ رہا ہوں۔ تمہیں ملنے کی آس نے ہی تو زندگی کی ناؤ کو ساحل دیا ہے ورنہ بیٹے میری زندگی کا مقصد ہی کیا تھا۔ میرا دل تو ایسا ٹوٹا کہ۔''

دونوں بچھڑے ہوئے باپ بیٹی ملے رو رہے تھے باقی سب بھی آبدیدہ ہو گئے۔

''ابو۔ میں صرف آپ کے پیار سے محروم نہیں رہی۔ مجھے تو ماں کے پیار کی چھاؤں بھی نصیب نہیں ہوئی۔''

سارا آج سب کچھ اگل دینا چاہتی تھی۔ ضیاء نے رضا کی طرف دیکھا تو دونوں نے نادم ہو کر نگاہیں جھکا لیں ان لوگوں کی خوشیوں کی قاتل بہر حال اُن کی بہن تھی۔

''سارا بیٹے۔ مانا کہ تم ماں باپ کے پیار سے محروم رہی ہو مگر ہم لوگوں نے تو پوری کوشش کی ہے تمہیں کسی پیار کی کمی کا احساس نہ ہو مگر شاید پھر بھی کوئی کمی رہ گئی ہے۔'' ضیاء نے افسردگی سے سارا کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر ان کو دیکھا پھر رضا کو دیکھا تو وہ چونک گئی۔ جذباتی پن میں وہ جانے کیا کہہ گئی تھی جس نے ان پیاری ہستیوں کا دل دکھایا تھا۔ جن کے بے لوث پیار کی ٹھنڈی شبنم نے ہمیشہ ہی ماں اور باپ کے پیار کے پیاسے تڑپتے دل کو ٹھنڈک بخشی تھی۔

''نہیں ضیاء بھائی۔ یہ کیسے سوچا آپ نے؟ میری رگوں میں تو آپ لوگوں ہی کی محبت دوڑ رہی ہے۔

مجھے آپ لوگوں سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ بھیا۔ پلیز آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ آپ لوگوں نے تو میری طلب اور میری تمنا سے بڑھ کر مجھے محبت اور توجہ دی ہے کہ۔ کہ۔''

وہ اب ضیاء سے لپٹی رو رہی تھی۔

''ارے بھئی' میں تو مذاق کر رہا تھا بیٹے۔ اس لیے کہ تم دونوں کے رونے میں تھوڑا سا وقفہ آجائے اور بھلا ہم نہیں جانتے۔ اور یہ کیا کہ جب سے تمہیں ابو ملے ہیں' ان کو مسلسل رلائے جا رہی ہو۔ ان کی کوئی خاطر خدمت نہیں کرو گی؟'' ضیاء نے سارا کے چہرے پر چپکے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا تو شبنمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی ایک پرسکون اور آسودہ سی مسکراہٹ۔

''سارا جاؤ۔ اپنے ابو کے لیے اچھی سی چائے بناؤ۔ پتا ہے صغیر بھائی۔ ہم نے آپ کی بیٹی کو بہت سلیقہ مند بنایا ہے۔ اسے چائے بھی بنانی آتی ہے۔ اور انڈا بھی بوائل کر لیتی ہے۔'' رضا نے دل کو مزید بہتر بناتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''اچھا بھائی۔ میں تو اس وقت تک نہیں مان سکتا جب تک کہ اپنی بیٹی کا امتحان نہ لے لوں۔'' صغیر احمد بھی اب سنبھل گئے تھے۔

''رضا بھائی۔ سارا پیار اور شکوہ۔ بھری نگاہوں سے رضا کو دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ سارا تو تتلی بن گئی تھی اسے زندگی کی کتنی بڑی خوشی ملی تھی۔ یہ کوئی اس سے پوچھتا کاش باپ کے ملنے پر اسے ماں بھی مل جاتی۔ باپ کے پیار میں ماں کے پیار کی آبِ حیات بھی شامل ہو جاتی تو کیا بات ہوتی۔ لیکن شاید ماں کا پیار اس کی قسمت میں نہیں تھا۔

''سارا۔ سارا فہیم نے اسے ایک دو آوازیں دیں۔ مگر اس نے نہ سنیں۔

''بس فہیم بھائی۔ بھول جائیں کہ آپ کی کوئی سارا بھی تھی۔ ان کو ان کے ابو مل گئے ہیں اس لیے اب یہ آپ کو نہیں مل سکتیں۔'' حیدر نے شرارت سے سارا کو دیکھا جو اب حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

تو ٹھیک ہے نہ ملیں۔ نہیں ملتیں تو میں بھی کوئی تلاش کر لوں گا۔ اچھی سی خوبصورت سی لڑکی ڈھونڈ لوں گا۔ میں تو بس بزرگوں کی وجہ سے قربانی کا بکرا بن رہا تھا ورنہ میرا دل تو۔'' فہیم نے شوخ اور گہری نگاہوں سے سارا کو دیکھا۔

''جی فہیم بھیا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کہیں تو میں دکھاؤں آپ کو ایک آدھ اچھی سی لڑکی۔''

حیدر بھی شوخی سے بول رہا تھا۔

''میں تم دونوں کو ابھی آ کر دیکھ لیتی ہوں۔'' سارا ان دونوں کو گھورتی ٹرالی لیے آگے بڑھ گئی تو دونوں کی شوخ ہنسی اس کے پیچھے تک گئی۔

صغیر احمد نے ایک مدت کے بعد بیٹی کو پایا تھا اب وہ اس سے ایک لمحے بھی جدا نہیں رہنا چاہتے تھے اسی لیے وہ اس سے ساتھ لے جانے پر بضد تھے۔

"مگر صغیر احمد۔ اب تو ہم اس کی شادی کرنے والے ہیں۔ سارا میری بہو بنے گی۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔" اس ذکر پر سارا فوراً اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"میں جانتا ہوں ضیاء بھائی آپ نے سارا کو بیٹیوں کی طرح پالا ہے اور اس کے اصل حقدار بھی آپ لوگ ہیں میری بیٹی نے اس گھر میں پھولوں کی سی پرورش پائی ہے تو آئندہ بھی چاہوں گا کہ وہ اسی جنت میں رہے۔ میں کیوں اعتراض کرنے لگا۔ آپ ضرور شادی کی تیاریاں کریں۔ بیٹیاں تو اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آتی ہیں ناں۔ کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ سارا اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آئے؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے ضیاء کو دیکھا۔

"کیوں نہیں۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ سارا اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر باپ کی دُعاؤں کے سائے میں سسرال کی دہلیز پر قدم رکھے تاکہ اس کے دل میں کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔"

اور جب سارا جانے لگی تو وہ اس طرح روئی گویا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو۔

"سارا پھپھو۔ کچھ پانی رخصتی کے لیے تو بچا رکھیں۔" یاسر نے آہستگی سے کہا۔

"سمجھا کرو یار وہاں رونا تو جدائی پر آ رہا ہے۔ باپ کے گھر سے تو ہنستی کھلکھلاتی ہوئی آئیں گی پیا کے گھر۔" حیدر نے شوخی سے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

گو کہ سارا واپس آنے کے لیے گئی تھی مگر پھر بھی اس کی کمی بہت محسوس کی جا رہی تھی۔ صدیقہ کو جب معلوم ہوا کہ سارا صغیر احمد کے ساتھ چلی گئی ہے تو وہ آگ بگولہ ہو گئیں۔

"میں پوچھتی ہوں تم لوگوں کو کس نے اختیار دیا تھا کہ میری بیٹی کو اس شخص کے حوالے کر دو جس نے مڑ کر اس کی خبر نہیں لی۔ اس کا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ آج باپ بن کر لے گیا۔ کون ہوتا ہے وہ سارا پر حق جمانے والا۔"

"ایسی ہی بات ہے تو آپی' سارا پر آپ کا بھی کوئی حق نہیں۔" آپ نے تو اس کے پاس رہ کر اسے کوئی حق نہیں دیا۔ آپ نے تو اس سے اپنی ممتا بھی چھینی تھی۔ آپ نے اسے کیا دیا ہے جواب آپ اس کی دعویدار بن رہی ہیں۔ اس وقت آپ کی ممتا کہاں تھی جب آپ نے ابا جان کو سارا یہ کہہ کر دی تھی کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ ہی اس کو پالیں۔ اس وجہ سے میں زیادہ عمر کی لگتی ہوں۔"

"رضا۔ تمہیں یہ سب کچھ کہنے کا حق نہیں۔ تم تو جانے کون کون سی باتوں کے بدلے لے رہے ہو۔ مجھ سے بس میں کچھ نہیں جانتی۔ میری بیٹی واپس کرو۔" صدیقہ بیگم فیصلہ کن سخت پتھریلے لہجے میں بول رہی تھی۔

"صدیقہ۔ احمقانہ باتیں نہ کرو۔ جس کی بیٹی تھی وہ آ کر لے گیا ہے۔ ہم روکنے کا حق

نہیں رکھتے تھے۔ ماضی میں اگر تم اسے بیٹی دے دیتیں تو شاید سارا آج اتنی محروم نہ ہوتی۔ والدین کی محبتوں کی۔ اس شخص کے اندر اتنی محبت ہے کہ وہ سارا کو ماں باپ دونوں کا پیار دے کر پروان چڑھا پاتا۔"

"میں صحیح بات کہہ رہی ہو یا احمقانہ کہہ رہی ہوں۔ اس بات کا اندازہ آپ لوگوں کو تب ہو گا جب میں اس ذلیل شخص سمیت سب کو عدالت میں دھکیلوں گی۔" صدیقہ حقارت سے ان سب کو دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"عدالت میں جانے سے قبل اپنی نام نہاد بیٹی سے ضرور پوچھ لیجئے گا آپی جس کی محبت آپ ہی' آپ کے دل میں جاگی ہے۔ مبادا آپ۔" رضا کی بات پر صدیقہ تیورا کر مڑیں تاکہ رضا کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔ مگر جانے کیوں کچھ سوچ کر خاموشی سے آگے بڑھ گئیں۔

"آپی چائے تیار ہے۔" شیریں نے سہم کر ان سے کہا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری چائے۔ منحوس عورت' جب سے اس گھر میں آئی ہو' گھر کا تختہ ہی الٹ دیا ہے اس کو تو ایسا الو بنایا ہے کہ اسے بات کرتے ہوئے ذرا بھی لحاظ نہیں رہتا۔ اب تم لوگوں سے عدالت میں ہی ملاقات ہو گی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولتی باہر نکلنے لگیں تو حیدر آگے بڑھا۔ اس کے لیے پھپھو کا یہ روپ خاص نیا تھا۔ وہ آج تک پھپھو کو حق بجانب ہی سمجھتا رہا تھا۔ مگر اب اس معاملے میں وہ سمجھتا تھا کہ پھپھو کی یہ ضد فضول ہے سارا کو چونکہ انہوں نے بیٹی تسلیم نہیں کیا تھا۔ نہ اس کی پرورش کی تھی تو اب اگر وہ اپنے ابو کے ساتھ چلی گئیں تو پھپھو کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے اور پھر جب سارا نے شادی ہو کر اسی گھر میں آنا تھا۔

"رک جائیں پھپھو۔" اس نے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"ہٹ جاؤ حیدر۔" میرے راستے سے' میں نے آج تک وہی کیا ہے جو میرے دل نے کہا ہے۔ میں کسی کے حکم یا خوشی کے تابع نہیں ہوں۔ میں عدالت میں ضرور جاؤں گی۔" وہ اسی طرح انگارے چبا رہی تھیں۔

"لیکن پھپھو' ذرا سوچیے خاندان کی' آپ کے بھائیوں کی کتنی سبکی ہو گی۔ اور پھر سارا پھپھو نے تو واپس اسی گھر میں آنا ہے۔"

"وہ اس گھر میں آئے یا بھاڑ میں جائے' مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن وہ اس شخص کے گھر کیوں گئی ہے جس سے مجھے نفرت ہے۔ جو مجھے پسند نہیں اور ان لوگوں کو کیا حق پہنچتا تھا کہ اسے" مارے غصے کے صدیقہ کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے پھپھو' انکل صغیر سے آپ نفرت کرتی ہیں لیکن پھپھو ایسا بھی تو ہوتا ہے نا کہ جن لوگوں سے ہم نفرت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کی رگِ جاں ہوتے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ جن کی خاطر ہم سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوتے ہیں۔''

''بند کرو حیدر' یہ فلسفہ۔ مجھے نہیں ہے کسی سے محبت۔'' انہوں نے بری طرح حیدر کی بات کاٹ دی۔

''پھپھو۔ آپ میری بات بھی نہیں مانیں گی۔؟'' حیدر کو محبتوں کے اس پُل پر کامل اعتبار تھا جب ہی تو بلا سوچے سمجھے چل پڑا تھا۔

''کیوں تم کون ہو؟ سانپ کے سنپولیے۔ جس نے کبھی بھی مجھے بہن نہیں سمجھا ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔'' وہ اسے پرے دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ تو حیدر اپنے اوپر گرے محبتوں کے پل کے نیچے اپنا دم گھٹا ہوا محسوس کرنے لگا۔

''آجاؤ اب' کہا کس نے تھا کہ آبرو گنوانے جاؤ۔'' یاسر نے بڑھ کر اسے ساتھ لگایا اور اندر لے آیا۔

''لیکن یار کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے ورنہ پھپھو تو۔ وہ اب بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

اسے یقین آ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس پر جان دینے والی پھپھو اسے ایسی بات کہہ سکتی ہیں۔

''دیکھو حیدر۔ بڑی پھپھو ہمیشہ سے ایسا الجھا ہوا سوال رہی ہیں کہ ان کو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا اور نہ ہی حل کر سکا ہے ان کو تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے۔

''لیکن یاسر۔ پھپھو نے آج تک میرے ساتھ ایسے لہجے میں بات نہیں کی۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بے پناہ محبت دی ہے لیکن۔'' آج حیدر کو پھپھو کے اس انداز سے سخت شاک پہنچا تھا۔

''دیکھا کس قدر تکلیف ہوتی ہے ایسے لہجے سے۔ ایسی بات سے۔ ذرا سوچو ان لوگوں کے بارے میں کہ جن کے ساتھ ہمیشہ سے بڑی پھپھو کا لہجہ یہی رہا ہے۔ ان کے کیا احساسات ہو سکتے ہیں جن سے ہمیشہ پھپھو نے نفرت ہی کی ہے طنز کے تیر ہی برسائے ہیں۔'' یاسر کا اشارہ شیریں کی طرف تھا۔ وہ براہِ راست کہہ نہ سکا مبادا حیدر پٹڑی سے ہی نہ اتر جائے۔

''ہوں گے ان کے اختلافات مگر یاسر پھپھو میرے ساتھ۔'' حیدر کو اب تک یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ بات پھپھو نے اسے کہی ہے۔

''ارے جناب آگے آگے دیکھیے آپ کو کیا سننا اور کیا دیکھنا پڑتا ہے۔ یاسر حیدر کو الجھا ہوا چھوڑ کر شاہین کے بلانے پر اٹھ گیا۔

صدیقہ کی اس دھمکی سے گھر کی خواتین اور بچے ضرور ڈر گئے تھے۔

''ضیا۔ اگر صدیقہ نے واقعی عدالت میں بلا لیا تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری تو ناک کٹ جائے گی۔'' شاہین تب سے بہت فکرمند تھیں۔

''اول تو یہ کہ وہ ایسی حرکت کرے گی نہیں اور اگر کرے گی تو منہ کی کھائے گی۔ سارا تو پہلے ہی ماں کے خلاف ہے اور پھر ساری بات ہی اس کی ہے پھر سارا کو ابا جان نے گود میں لے لیا تھا اور صدیقہ اس سے بخوشی دست بردار ہوئی تھی اور اب بھی اسے سارا سے کوئی محبت نہیں وہ صرف ہم سے اور صغیر سے انتقام لینا چاہتی ہے یعنی کس بات کا اس کی تو سمجھ ہی نہیں آسکی کہ وہ چاہتی کیا ہے نہ آج تک خود خوش رہی ہے اور نہ کسی اور کو چین لینے دیا ہے ماں باپ بھی اسی کے دکھ کو لے کر قبر میں اتر گئے مگر۔'' ضیاء افسردہ سے ہو گئے۔

''ضیاء۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے میری پہلی خوشی ہے کاش سارا صدیقہ کی بیٹی نہ ہوتی۔'' شاہین واقعی ڈر رہی تھیں کہ عین موقع پر صدیقہ فضیحتہ نہ کھڑا کر دے۔

''بھابھی۔ آپ بے فکر رہیں آپ سارا کو میری بیٹی سمجھیں۔ آپی کچھ نہیں کر سکتیں۔ اب میں دیکھ لوں گا ان کو۔'' رضا فیصلہ کن انداز میں بولے۔

گھر میں صدیقہ کی اس دھمکی کے باوجود شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں مگر ایک دھڑکا سا لگا رہتا کہ جانے کب صدیقہ بیگم عدالت میں بلا لیں۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ فہیم بھیا آپ کے سہرا باندھے بیٹھے ہوں اور وارنٹِ گرفتاری جاری ہو جائیں۔'' وقاص نے مسکرا کر فہیم کو دیکھا۔

''یار۔ دھڑکا تو مجھے بھی اس قسم کا لگا رہتا ہے۔ جانے کب پھپھو۔''

''اب ایسی بھی اندھی نہیں لگی ہوئی۔ اب تو پھپھو کو برابر کا جواب ملے گا۔'' یاسر اور ایاز بولے۔ سب ہی کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ مگر حیدر خاموشی سے سن رہا تھا اس کا ذہن پھپھو کو غلط تسلیم کرنے پر قطعی تیار نہ تھا۔ وہ اب بھی یہی کہہ تھا کہ کہیں کسی سے کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے جو پھپھو یوں ہر کسی سے متنفر ہیں جب وہ ایسی بات کرتا تو یاسر چڑ جاتا۔

ہاں باقی سب ہی غلط ہیں ایک تم اور تمہاری پھپھو ہی درست ہیں۔''

''یاسر۔ وہ تمہاری پھپھو بھی تو ہیں۔''

''ہاں۔ بس اسی بات سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔'' یاسر یوں کہتا جیسے بہت مجبوری سے اس رشتے کو مان رہا ہو۔

''کیوں۔ اب کیا ارادے ہیں اس وقت؟'' ایاز حیدر کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

''میں پھپھو کے پاس جا رہا ہوں وہ خود کو کتنا اکیلا محسوس کر رہی ہوں گی۔'' حیدر کو مسلسل پھپھو کا خیال ستائے جا رہا تھا وہ ان کے منع کرنے کے باوجود اپنی گاڑی تک آ گیا شیریں بھی

اس کے پیچھے لپکیں۔

''حیدر بیٹے۔ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ گیارہ بج رہے ہیں رات کے اور پھر موسم بھی ٹھیک نہیں۔''

پہلے تو حیدر کا جی چاہا بتائے بغیر چلا جائے مگر پھر جانے کس خیال کے اس نے بتایا۔

''میں پھپھو کے ہاں جا رہا ہوں۔'' وہ انگلی پر چابیاں گھماتا ہوا بولا۔

''اس وقت۔ بیٹے دن میں کسی وقت چلے جانا۔ تمہارے پپا بھی سو گئے ہیں ان سے بھی نہیں پوچھا تم نے۔ اٹھ گئے تو ناراض ہوں گے۔'' شیریں خود ہی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اس وقت جائے مگر رضا کا نام لے کر حیدر کو منع کرنا چاہا۔ تو اس نے پلٹ کر ان کو دیکھا۔

''میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے پھپھو سے ملنے کو تو کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی اسپورٹس کار اڑاتا ہوا نکل گیا تو شیریں دل میں اس کی خیریت کی دُعا ہی کرتی رہ گئیں اور بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی مگر حیدر نہیں لوٹا۔

وہ پریشان ہو گئیں کچھ بھی تھا۔ حیدر اپنی تمام تر گستاخیوں کے ساتھ ان کو عزیز تھا اتنی رات کو وہ گیا تھا وہ سو بھی نہیں پا رہی تھیں۔ دو بجے کے قریب وہ باہر آئیں کہ شاید آ گیا ہو۔

''چچی جان۔ آپ سوئی نہیں۔ کیا بات ہے؟ چچا جان تو ٹھیک ہیں ناں؟'' وقاص جو پڑھ رہا تھا ان کو پریشان دیکھ کر بولا۔

''وہ حیدر ابھی تک نہیں آیا۔ خدا خیر کرے۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں مضبوطی سے جکڑتے ہوئے بولیں۔

''وہ پھپھو کے ہاں گیا ہے چچی جان۔ ہو سکتا ہے صبح ہی آئے۔ پھپھو نے روک لیا ہوگا آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ اب صبح ہی آئے گا۔''

''وہ تو درست ہے ایسا بارہا ہوا ہے مگر بیٹے آج کچھ دل گھبرا رہا ہے۔''

''وہم ہے چچی جان آپ کا آپ آرام کریں۔'' وقاص نے ان کو تسلی دے کر سونے کو بھیج دیا مگر ان کو پھر بھی سکون نہ آیا۔ صبح پانچ بجے ہی انہوں نے صدیقہ کے ہاں فون کیا تو نومی نے اٹھایا۔

''نومی بیٹے، حیدر کو جگا کر بھیج دو۔ رضا اٹھنے والے ہیں۔''

''مگر آنٹی حیدر تو آیا ہی نہیں۔''

''کیا؟'' ریسیور شیریں کے ہاتھ میں لرز گیا۔

''خدایا خیر کرنا۔'' تھوڑی دیر میں گھر بھر اٹھ بیٹھا لڑکے فوراً حیدر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

رضا کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا تو وہ شیریں پر برسنے لگے۔

''ساری رات گزر گئی مگر تم نے تو مجھے بتایا تک نہیں۔ کہاں گیا ہے وہ؟ کیوں جانے دیا اسے اتنی رات کو شیریں، میرے حیدر کو کچھ ہو گیا تو۔ تو۔'' رضا بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔

''حوصلے سے رضا۔ شیریں نے بہت روکا تھا حیدر کو۔ میرے سامنے روکا تھا مگر وہ اس کی سنتا کہاں ہے اللہ تعالیٰ خیر کرے گا فکر نہ کرو۔'' شاہین نے بڑھ کر رضا کو تسلی دی مگر ایک بے چینی کسی کل قرار نہیں لینے دے رہی تھی۔

شیریں الگ مجرم بنی ہوئی تھیں حیدر کی وجہ سے انہوں نے ساری رات کانٹوں پر گزاری تھی اب بھی قصوروار تھیں۔ مگر ان کو رضا اور حیدر ہی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ صدیقہ بھی آ چکی تھیں اور شیریں پر ستم آزما رہی تھیں۔

''دیکھا۔ میں نے کیا کہا تھا۔ اس نے حیدر کو کار لے کر ہی کیوں دی تھی اس لیے کہ بڑی دیوار ہے خود ہی راستے سے ہٹ جائے گا۔ ہائے میرا بچہ جانے کس ہاسپٹل میں ہوگا۔''

''خدا سے خیر کی دُعا مانگو۔ صدیقہ، دل پہلے ہی ہول رہا ہے اور تم ایسی بدفال منہ سے نکال رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے بچے کو۔'' شاہین نے فوراً ٹوک دیا۔ شیریں تو چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کہہ پا رہی تھیں۔

''ارے تو پھر کہاں ہوگا؟ پتا نہیں کہاں کہاں چوٹ آئی ہوگی۔ میرے بیٹے کو۔'' صدیقہ مسلسل ایسی ہی بری باتیں کر رہی تھیں۔ بہنوں کا الگ رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ رضا کافی برداشت کر رہے تھے جب چارہ نہ رہا تو بول پڑے۔

''بھابھی۔ ان سے کہیں یا تو یہ خاموش رہیں یا پھر چلی جائیں۔ نہیں چاہئیں مجھے ان کی ہمدردیاں۔'' وہ گویا پھٹ ہی پڑے۔

''ہاں، ہاں، تمہیں کیوں کسی کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں تو اپنی اس چہیتی کی خوشنودی چاہیے۔ خواہ اولاد رہے نہ رہے۔'' ان کی بات پر رضا نے زور سے اپنا سر دیوار سے مارا تو سارے بہت گھبرا گئے۔

''صدیقہ، خدا کے لیے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو اور جاؤ خدا کے لیے بخش دو۔'' ضیاء یہ بات کہنا نہیں چاہتے تھے مگر مجبوراً انکو کہنا پڑی تھی۔

''جا رہی ہوں۔ وہ تو مجھے محبت ہے اپنے بچوں سے تب ہی آ گئی تھی ورنہ تو میں یہاں تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کسی نے روکنے کی کوشش نہ کی۔

''ہوں محبت۔ محبت ہوتی تو یوں دعائیں دینے کی بجائے بدفالیں نہ نکالتیں اس کے لیے۔''

رضا اس وقت سخت پریشان تھے۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑے۔ آگے بھی

جانے کیا کہتے کہ ضیاء نے انکو خاموش رہنے کو کہا۔

صبح سے یاسر وغیرہ حیدر کو تلاش کرتے پھر رہے تھے کہ ایک سڑک کے قریب اس کی تباہ حال گاڑی دیکھ کر ان کی ساری ہمتیں ختم ہو گئیں۔ تلاش بھی ختم ہو گئی۔

''حیدر۔ یار کہاں کھو گئے ہو تم۔'' یاسر رو پڑا۔

''گاڑی کا یہ حال ہوا ہے تو۔ تو۔''

''چلو۔ ہاسپٹل میں پتا کریں۔'' اور پھر انہوں نے سارے ہاسپٹلز چھان مارے مگر حیدر کا نام ونشان نہ ملا۔

''خدایا۔ کیا کریں۔ کیا منہ دکھائیں گے چچا جان کو۔'' گزرتے لمحات نے سب کی ہمتیں توڑ ڈالی تھیں۔

شیریں تو تب سے سجدے میں۔ پڑی تھیں۔ ضیاء مسلسل رضا کو بہلا رہے تھے۔

''اسے آنا چاہیے بھیا' وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ کیوں تنگ کرتا ہے مجھے وہ جانتا ہے ناکہ وہ میری کمزوری ہے' اسی لیے تنگ کرتا ہے۔ بھائی جان اگر اسے کچھ۔''

''خدا نہ کرے رضا۔ اللہ تعالیٰ نگہبان ہے۔ دل میں بری بات نہ لاؤ۔''

''پپا۔ پپا بھیا آ گئے۔'' ثناء حیدر کو دیکھ کر چلائی اور بھاگتی ہوئی اس سے لپٹ گئی مگر پھر فوراً ہٹ گئی

''حیدر۔ حیدر۔ میرے بیٹے۔'' رضا اندھا دھند اس کی طرف بڑھے اور بے قراری سے اسے پیار کرنے لگے۔ ''یہ۔ یہ چوٹ۔ میرے بیٹے۔ یہ کیسے۔ کہاں تھے تم۔ کیسے آئی چوٹ؟'' رضا اس کی پیشانی پر پٹی دیکھ کر تڑپ گئے۔

''وہ پپا۔ ذرا گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔'' وہ سر جھکا کر ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

حیدر کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی تھی۔ شیریں کا دل چاہ رہا تھا اسے ساتھ لگا کر پیار کریں مگر وہ اس کا حق نہیں رکھتی تھیں۔ وہ دور کھڑی خدا کا شکر بجالا رہی تھیں۔ سب حیدر کے گرد جمع تھے۔

رضا بار بار اسے پیار کر رہے تھے۔ ارم اور کرن بھی اس کے پاس بیٹھیں۔ یاسر وغیرہ بھی ناامید ہو کر آئے مگر سامنے حیدر کو دیکھ کر اس سے لپٹ گئے۔

''یار حیدر۔ یہ تو معجزہ ہو گیا۔ تمہاری گاڑی کی حالت دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ڈرائیور بچ گیا ہو گا۔'' حیدر نے یاسر کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کو کہا۔

''کیوں کیسی ہے گاڑی' کیسے ہوا یہ ایکسیڈنٹ۔'' رضا بے چین ہو گئے۔

''جی پپا۔ بس گاڑی کا زیادہ نقصان ہو گیا۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''بھاڑ میں جائے گاڑی ایسی بے شمار گاڑیاں تم پر قربان بیٹے۔'' رضا نے اس کی پیشانی

چوم لی۔

''حیدر بیٹے' کیا کھاؤ گے؟ کیا بناؤں بیٹے کے لیے۔'' شیریں آگے بڑھیں۔

''کچھ نہیں ارم چائے بنا لاؤ۔'' حیدر شیریں کی طرف دیکھے بغیر بولا تو وہ وہاں سے ہٹ گئیں اسی وقت صغیر احمد اور سارا آ گئے۔

''حیدر۔ میری جان کیا ہو گیا تھا۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ کیا ہو گیا؟ اب کیسے ہو؟''

سارا بے تابانہ حیدر کی طرف بڑھیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں سارا پھپھو۔ یہ تو بس آپ کو بلانے کا بہانہ تھا۔ آپ آ جو نہیں رہی تھیں۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم بہت بدتمیز ہو۔ گاڑی ذرا احتیاط سے نہیں چلاتے۔ میں تمہاری پٹائی لگاؤں گی۔''

''سارا پھپھو' آپ پٹائی لگائیں یا ڈانٹیں مگر قصور میرا ہرگز نہیں تھا۔ وہ تو ٹرک والے ہی کو مذاق سوجھ رہا تھا اور دوسری طرف سے آنے والی بس بھی شوخ تھی۔ بس اسی شوخی میں میری گاڑی کی چٹنی بن گئی۔ بس مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میری جب آنکھ کھلی تو میں ہاسپٹل میں تھا۔ جانے کس مہربان کی وجہ سے خدا نے جان بخش دی۔'' حیدر مسکرا کر ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

''شکر ہے خدایا تیرا۔''

''بیٹے کی زندگی مبارک ہو رضا۔'' صغیر احمد رضا کی طرف بڑھے۔

''شکریہ۔ صغیر بھائی آئیں' ہم دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔'' رضا اور صغیر احمد چلے گئے تو یہ لوگ ایزی ہو گئے۔

''اچھا تو سارا پھپھو' اب میں آپ کی خبر لوں۔ آپ کیوں آئی ہیں وقت سے پہلے ہمارے گھر۔'' حیدر شوخ ہو گیا۔

''بکومت۔ خود ہی جان نکال دیتے ہو اور خود ہی۔'' سارا جھینپ گئی۔

''اجی رہنے دیجئے۔ ہم سب سمجھتے ہیں اتنے روز سے ملاقات جو نہیں ہوئی بس میری خبر بہانہ بن گئی۔''

وہ مسلسل اسے چھیڑے جا رہا تھا باقی سب بھی شامل ہو گئے۔

''اونہوں۔ اندر آنا منع ہے۔ آپ سے پردہ ہے فہیم بھیا۔'' یاسر نے دروازے پر ہی فہیم کو روک لیا۔

جو واقعی سارا کو دیکھنے آیا تھا کتنے روز سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

''کیا مصیبت ہے یار' حیدر کو دیکھنے آیا ہوں۔'' فہیم زبردستی اندر گھس رہا تھا۔

''جی۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ حیدر ابھی تک انسانی صورت میں ہی ہے۔ کوئی

تبدیلی نہیں ہوئی۔''

''یار، بڑے ظالم ہو تم لوگ۔'' فہیم زچ ہو گیا۔

''آنے دو یار، کیا یاد کریں گے، کس سے پالا پڑا تھا۔'' حیدر نے کہا تو یاسر پیچھے ہٹ گیا۔

''اب کیا حال ہے حیدر تمہارا۔''

''میں ادھر ہوں فہیم بھیا۔'' حیدر نے فہیم کا سر پکڑ کر اپنی طرف کر لیا۔ جو سارا کو دیکھے جا رہا تھا۔

''تمہیں پورے دو ہفتے بعد دیکھا ہے حیدر۔ میں تو بہت اداس تھا۔ کیا تم بھی؟'' فہیم کی نگاہیں اب بھی سارا پر تھی اور وہ کہہ بھی اسے رہا تھا۔

''بھیا۔ میں تو صرف ایک رات باہر رہا ہوں۔'' حیدر ان دونوں کے درمیان آ گیا۔

''پرے ہٹو۔ میں کوئی تم سے تھوڑی پوچھ رہا ہوں۔'' فہیم نے حیدر کو پرے ہٹایا۔

''تو براہ راست اپنی بے قراریوں کی داستان سنائیں ناں، میرے شانے پر بندوق رکھ کر کیوں چلا رہے ہیں۔ ویسے بھی آپ دونوں اب عدالت میں جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ آپ لوگوں کی شادی لگتا ہے کہ عدالت میں ہی ہو گی۔''

''کیا مطلب؟'' سارا بری طرح چونک گئی۔ یاسر نے ساری بات سارا کو بتا دی۔ ایک کربناک ٹیس سارا کے دل میں اٹھی۔

''ہونہہ بیٹی۔ تمام عمر میں ان کی ممتا کے لیے ترپتی رہی۔ کہ کبھی ایک بار وہ مجھے بیٹی کہہ کر اپنی ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں دیں۔ مگر ایسا تو کر نہیں سکیں۔ اب جبکہ میں پر سکون اور اپنے باپ کی محبت پا کر مطمئن ہوں تو انکو بیٹی یاد آ گئی ہے۔ وہ بھی محض ضد میں انتقام لینے کے لیے، کہہ دینا حیدر اپنی پھپھو سے۔ اگر انہوں نے ایسا اقدام اٹھایا تو۔ اچھا نہیں ہو گا۔'' سارا یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے ہی فہیم اور یاسر بھی چلے گئے۔ تو حیدر آنکھیں موند کر لیٹ گیا مگر پھر قدموں کی چاپ سن کر فوراً آنکھیں کھول دیں مگر کوئی فوراً ہی پردے کی اوٹ میں ہو گیا۔

''ثناء۔'' اسے یقین تھا یہ ثناء ہی ہے۔

''جی۔'' وہ آہستگی سے باہر نکل آئی۔

''یہاں آؤ میرے پاس۔'' اس نے بلایا تو وہ ڈرتی ہوئی آ گئی حالانکہ اس نے نارمل انداز میں کہا تھا۔

''جی بھیا۔''

''کیا میں بہت برا ہوں؟ بہت خوفناک ہوں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو؟'' وہ اس کے نرم ہاتھ پیار سے تھامے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں تو بھیا۔ آپ تو بہت پیارے ہیں۔ اتنے اچھے، اتنے پیارے کہ۔'' ثناء اس کے

ہاتھ آنکھوں سے لگا کر رو پڑی۔

''اچھا تو اپنے پیارے بھیا جان کو اپنے آنسوؤں سے پریشان کرنے آئی ہو۔'' حیدر نے پیار سے اس کا تر چہرا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو بھیا۔ میں تو آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میں آپ کا سر دبا دوں۔''

وہ اسے نرم دیکھ کر ذرا کھل کر بات کرنے لگی۔

''ہاں دبا دو۔''

''اور پھر اس کے نرم چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں جانے کیسا سکون تھا کہ حیدر کو آج تک ایسا سکون نہیں ملا تھا۔ حالانکہ اس کے سر میں ذرا بھی درد نہیں تھا مگر ثناء کے ہاتھوں سے اسے عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا وہ ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی اور دبا بھی رہی تھیں۔

حیدر کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ آج تک وہ ایسی خوشی اور سکون سے کیوں دور رہا تھا۔ وہ اس کی میٹھی میٹھی باتوں پر زیر لب مسکرا بھی رہا تھا۔ شیریں کا گزر ہوا تو یوں ثناء کو حیدر کا سر دباتے دیکھ کر ایک لطیف سا جھونکا اندر کی تلخیوں میں اتر گیا۔

''ارے ثناء کیوں بھائی کو تنگ کر رہی ہو۔ آرام کرنے دو۔ کیسے ہو حیدر بیٹے۔''

''جی ٹھیک ہوں۔'' شیریں کو دیکھ کر وہ احتراماً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ آج پہلی بار ہوا تھا۔ جانے کیوں وہ بھی نہ سمجھ سکا تھا۔

''کچھ کھاؤ گے بیٹے۔ میں ارم کو کہتی ہوں تمہارے لیے کچھ بنا لائے'' وہ خواہ کتنی ہی نفرت سے پیش آتا، گستاخی کرتا مگر شیریں اسی قدر محبت سے پیش آتیں۔ وہ نفرت کے زہر کو محبت کے امرت سے زائل کرنے کی قائل تھیں اور پھر یہ بچے تو اس رضا کے تھے جن کو انہوں نے روح کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔

''جی نہیں۔ فی الحال کچھ نہیں کھانا۔'' ان کے چہرے پر اتنی ملاحت، لہجے میں ایسی محبت تھی کہ وہ کوئی بھی تلخ بات نہ کہہ سکا۔

''اچھا ثناء۔ چلو اٹھو، بھائی کو آرام کرنے دو۔''

''نہیں۔ اسے یہیں میرے پاس رہنے دیں۔ ایک عرصے کے بعد تو یہ ملی ہے مجھے۔''

شیریں اس بے پایاں خوشی کو سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ صغیر احمد واپس نیروبی جانا چاہتے تھے اس لیے چاہتے تھے کہ سارا کی شادی کے فرض سے جلد ہی فارغ ہو جائیں مگر ان لوگوں کو صدیقہ کی وجہ سے کچھ تامل تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے صغیر مگر جب تک صدیقہ خوشی سے شریک نہ ہو۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آخر وہ ماں ہے سارا کی۔''

''وہ عورت جو اولاد کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتی ضیاء بھائی تو وہ عورت اولاد کی زندگی کے فیصلے کرنے کی حقدار بھی نہیں ہوسکتی۔ میں تو خود کو بھی سارا کا حقدار نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کا کون سا فرض پورا کیا ہے۔ اس کے صحیح حقدار تو آپ لوگ ہیں۔ مگر بس یہ میری خوشی ہے کہ میں سارا کو اپنے گھر سے سسرال رخصت کروں میرے پاس وقت محدود ہے آپ نے جہاں اتنے احسانات کیے ہیں وہاں یہ بھی کردیں کہ کوئی قریب کی تاریخ رکھ لیں۔ تیاریاں تو ویسے آپ لوگوں کی مکمل ہوگئی ہیں۔''

اور پھر اگلے ماہ کی پچیس تاریخ مقرر ہوگئی یہ اس گھر کی پہلی خوشی تھی۔ سب ہی بے حد خوش تھے۔

صدیقہ کی غیر موجودگی کا سب کو افسوس تھا کہ وہ ماں ہیں اور بیٹی کی خوشی میں شریک نہیں ہورہیں مگر اس میں صرف ان کا اپنا قصور تھا کہ وہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی یوں ماں کی محبت کو ترس رہی تھی۔

وہ کام، وہ تیاریاں جو اس کی ماں کو کرنی چاہئیں وہ اس کی ممانیاں کررہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کے لیے دکھ کی کیا بات ہوسکتی تھی۔ صدیقہ کا پورا ارادہ تھا عدالت تک ضرور جائیں گی مگر پھر سارا کی طرف سے انکار کا سوچ کر خاموش ہورہیں مگر انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس کی شادی میں شریک نہیں ہوں گی۔

''خدایا۔ کوئی رخنہ نہ ڈالنا۔ ورنہ ہمارے بھیا تو شادی کی آس میں بڈھے ہوجائیں گے۔'' حیدر نے فہیم کو چھیڑا۔ جوان سب کی چھیڑ چھاڑ میں پھنسا رہتا۔

''خدا تو رخنہ نہیں ڈالتا۔ اس کے بندے باز نہیں آتے۔''

''اسی لیے تو ہم نے رخنہ ڈالنے والوں کو شامل ہی نہیں کیا۔'' وقاص کا اشارہ صدیقہ کی طرف تھا۔

''وقاص کچھ شرم کرو۔ وہ ہماری پھپھو ہیں۔ سب لوگ ان کو غلط کہتے رہتے ہیں کبھی کسی نے اپنے اندر بھی جھانکا ہے۔ بس سب ان کو برا کہتے رہتے ہیں۔'' حیدر کو وقاص کی بات بہت بُری لگی تھی۔

''ٹھیک ہیں حیدر۔ وہ ہماری پھپھو ہیں۔ ہم ان کو بُرا کیوں کہیں گے۔ مگر ان کا جو رویہ ہے ناں۔ اس کی وجہ سے ہم تو کیا ان کی بیٹی بھی ان سے نالاں ہیں کہ انہوں نے تمہیں اپنی سوچ کے سانچے میں ڈھالا ہے نفرتوں سے تمہاری آبیاری کی ہے۔''

شٹ اپ۔ یاسر، ایک لفظ بھی آگے نہ کہنا۔ حیدر ایک دم ہی دھاڑا تو سب سہم گئے۔ پھر حیدر وہاں رکا نہیں۔ سیدھا صدیقہ کے ہاں نکل گیا۔

پھپھو۔ کہاں ہیں آپ؟''

پھپھو جانے کہاں تھیں۔ وہ ان کو آوازیں دیتا۔ نومی، روفی کے مشترکہ کمرے کی طرف آگیا تو بند دروازے کے پیچھے سے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے دروازہ ہلایا جو کھل گیا تھا تو روفی بیڈ پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

''روفی۔'' حیدر جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔

''یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟ اف تمہیں تو بہت تیز بخار ہے کب سے تمہاری یہ حالت ہے؟''

حیدر نے اس کے تپتے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ گو کہ حیدر کو روفی سے سدا کی چڑ تھی مگر اس وقت وہ ایسی حالت میں تھا کہ حیدر سب کچھ بھول گیا۔

''حیدر۔ خدا کے لیے مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو ورنہ میں مرجاؤں گا۔ دو روز سے مجھے بخار ہے اور الٹیاں آرہی ہیں۔'' روفی بمشکل بول رہا تھا۔ تکلیف اور نقاہت کی وجہ سے اس سے بات بھی نہیں ہورہی تھی۔

''دو روز سے تمہاری یہ حالت ہے اور تم نے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔''

''کون دکھاتا یار۔ مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جارہا۔ نومی بھیا دورے پر گئے ہیں اور۔ اور۔'' روفی مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

''اور پھپھو؟''

''حیدر۔ میں انسانیت کے ناتے تم سے درخواست کرتا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ میں تکلیف سے مر رہا ہوں حیدر، خدا کے لیے، روفی نے منت بھرے لہجے میں کہا تو حیدر کو بے حد دکھ ہوا۔

''ہاں میں تمہیں ابھی لے کر چلتا ہوں مگر پھپھو کو کم از کم بیماری میں تو تمہارا خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

حیدر کو واقعی دکھ ہوا تھا روفی کی حالت پر اور اپنی پھپھو کی بے حسی پر۔

''حیدر۔ تم کب آئے؟ ادھر میرے پاس آؤ۔'' صدیقہ تولیہ پکڑے اندر آگئیں۔

''پھپھو۔ روفی کی اتنی طبیعت خراب ہے۔ آپ نے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا نا؟'' وہ سلام دعا کے بغیر بولا۔

''اونہہ میں نے کوئی ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں حقارت سے بولیں۔

''پھپھو۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ پھپھو۔ انسان جاں بلب ہو تو دشمن بھی پانی کا گھونٹ دے دیا کرتے ہیں یہ تو آپ کی اولاد ہے؟''

''ہونہہ۔ اولاد جو تھی وہ نہ بنی تو۔ اور یہ تم کیا میرے دادا بنے سمجھا رہے ہو مجھے میں بہتر سمجھتی ہوں تم سے؟''

''خدا کے لیے پھپھو۔ اس وقت ایسی باتیں مت کریں۔ پلیز ڈاکٹر کو فون کریں۔ روفی

کی حالت بہت خراب ہے انکل بھی گھر پر نہیں۔ نومی بھائی بھی نہیں تو۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو آپ جواب دہ ہوں گی۔''

حیدر نے روفی کو پانی پلایا تھا جو قے کے ساتھ واپس آگیا روفی کی حالت بہت تشویشناک تھی حیدر کافی گھبرا گیا۔

''ہوتا ہے کچھ تو ہوتا رہے۔ میری جوتی سے۔ میں کیوں جواب دہ ہونے لگی۔'' ان کی زبان سے انگارے نکل رہے تھے۔ جن کی تپش میں روفی کے ساتھ حیدر بھی خود کو جلتا ہوا محسوس کررہا تھا۔

''پھپھو۔ تمام رشتوں سے بلند تر ایک رشتہ انسانیت کا بھی ہے۔ اسی کے ناتے سے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے میں میری مدد کریں یا گھر فون کردیں تاکہ یاسر وغیرہ آجائیں۔

حیدر نے بہت منت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں ذرا بازار جارہی ہوں۔'' یہ کہہ کر پرس اٹھا کر وہ نکل گئیں اور حیدر دکھ سے انہیں دیکھتا رہا گیا۔ اگر یہ ہی روفی ان کا سگا بیٹا ہوتا تو۔ لیکن کیا فرق پڑتا۔ ان کا برتاؤ تو سگی اولاد کے ساتھ ایسا ہی رہا ہے۔'' پھپھو! تو کیا سب لوگ آپ کے بارے میں درست کہتے ہیں۔'' حیدر نے انتہائی دکھ کے احساس میں دب کر سوچا۔ پھر گھر فون کیا کہ یاسر گاڑی لے کر آجائے۔ اتفاق سے گھر پر کوئی بھی لڑکا نہیں تھا۔ حیدر خود بائیک پر آیا تھا روفی کی حالت بہت خراب تھی اور زیادہ دیر روفی کے لیے خطرناک بھی ہوسکتی تھی۔

''روفی۔ تم ذرا انتظار کرو۔ میں ابھی ٹیکسی لاتا ہوں۔'' پھر وہ جلدی سے باہر آیا۔ ٹیکسی بھی جلد ہی مل گئی۔ حیدر اسے لے کر ہاسپٹل آگیا۔

وہاں روفی کو اسپیشل وارڈ میں داخل کردیا گیا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ قے بند نہیں ہورہی تھی۔

گھر پہنچا تو شفق' ایاز کے ساتھ کہیں جانے کی تیاری میں تھی۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' وہ ان کے قریب آگیا۔

''یار۔ شفق ذرا ہاسپٹل جانا چاہتی ہے۔'' ایاز بائیک صاف کرتا ہوا بولا۔

''کس لیے؟'' حیدر نے شفق کو دیکھا۔

''روفی کی عیادت کے لیے۔'' شفق نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کیوں کا کیا جواب دیتی چپ ہی رہی۔

''میں پوچھ رہا ہوں کیوں؟ جبکہ گھر کی کوئی لڑکی ہاسپٹل نہیں گئی۔ تم کیوں جارہی ہو۔'' وہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے' کسی بزرگ کی طرح جواب طلب کررہا تھا۔ شفق نے اسے دیکھا۔

واقعی گھر کی کوئی لڑکی ہاسپٹل نہیں گئی تھی مگر روفی اس کا اچھا دوست اور مخلص ساتھی تھا وہ نہ جاتی تو اسے دکھ ہوتا۔

''اس لیے کہ وہ میرا دوست ہے۔'' وہ جواب دینا تو نہیں چاہتی تھی مگر اب وہ راہ روکے کھڑا تھا تو بولنا ہی پڑا۔

''ہونہہ۔ دوست۔ لڑکی اور لڑکے کے درمیان کبھی دوستی نہیں ہوسکتی۔ بظاہر دوستی کے پیچھے کوئی نہ کوئی رشتہ پرورش پارہا ہوتا ہے۔ تو میرے خیال میں رشتے کو اسی نام سے پکارنا چاہیے۔ دوستی کے جذبے کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔''

''شٹ اپ۔ گھٹیا انسان تمہاری ذہنی پستی رشتوں کے تقدس کو کیا جانے۔'' شفق کا مارے غم و غصے کے برا حال ہوگیا۔ وہ امڈ آنے والے آنسوؤں کو روکتی وہاں سے آگئی۔

''حد کرتے ہو حیدر تم بھی۔ آخر کیوں کرتے ہو ایسا اس کے ساتھ؟ شفق ایک کھلی کتاب کی مانند ہے' ہم سب کے سامنے اس پر اس قسم کا رکیک الزام بہت غلط بات ہے یہ۔'' شفق کے جانے کے بعد ایاز' نے حیدر کی خبر لے ڈالی۔ مگر وہ الجھی سوچوں کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ اس کے بعد شفق نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے گھر جانے کا اعلان کردیا۔ اور وہ اس فیصلے پر اتنی سختی سے اڑی تھی کہ کوئی بھی اسے روک نہ سکا۔

''شفق۔ کچھ تو بتاؤ ہوا کیا ہے آخر۔''

''کچھ نہیں خالہ جانی۔ اب میں مزید برداشت نہیں کرسکتی۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔'' شفق شیریں کے گلے لگی روئے جارہی تھی۔

''بیٹے۔ ابھی تو ہم منزل پر پہنچے ہی نہیں۔ کیا خالہ جانی کو تنہا چھوڑ دوں گی؟''

''میں جانتی ہوں خالہ جانی مگر میں آپ کی طرح اعلیٰ ظرف نہیں ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ منزل کے قریب صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دوں اور آپ کی عمر بھر کی ریاضت ضائع ہوجائے۔ مجھ سے اب تک برداشت ہوا۔ میں نے برداشت کیا لیکن اب وہ گھٹیا انسان میرے کردار تک پہنچ گیا ہے تو۔'' شفق رضا کو اندر آتا دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

''کیا ہورہا ہے بھئی؟ یہ ہماری بیٹی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی کیا وجہ ہے؟'' رضا نے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کیے تو مہربان سے اس شخص کے گلے لگ کر رونے کی خواہش شدید ہوگئی مگر شفق نے ایسا نہیں کیا۔ مضبوطی سے کھڑی رہی۔

''کچھ نہیں رضا۔ کہتی ہے اب میں اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' شیریں نے اور کوئی بات نہیں بتائی۔

ڈاکٹروں نے فوری طور پر اسے توجہ دی۔ جس کے باعث اب روفی کی حالت بہتر ہوگئی۔ یاسر اور وقاص بھی اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد باقی سب بھی آگئے مگر جن

کو آنا چاہیے تھا وہ نہیں آئی تھیں۔ حیدر کو شدید شاک لگا تھا اپنی پھپھو کی اس حرکت پر عداوت' نفرت ایک طرف لیکن جب انسان موت کے اتنا قریب ہو جائے تو اس کی مدد نہ کرنا' انسانیت کی توہین ہی تو ہے جو اس کی پھپھو نے کی تھی۔ اس نے تو اپنی پھپھو کو سمجھا ہی کچھ اور تھا مگر وہ کیا نکلیں۔ بروقت اس کی توجہ سے روفی موت سے زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ روفی اس کا بہت ممنون تھا۔

''حیدر۔ تم تو کچھ اور ہی چیز ہو'' میں تو تمہیں غلط ہی سمجھتا رہا۔'' روفی نے حیدر کے ہاتھ تھام لیے۔

''ہم میں سے کوئی کسی کو نہیں سمجھ سکتا روفی۔ میں بھی تو ابھی تک غلط فہمی کا شکار رہا ہوں۔'' حیدر نے سنجیدگی سے کہا۔ روفی کے ہاتھ سہلائے اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ سامنے سے نومی پریشان حال بھاگا آ رہا تھا۔

''حیدر۔ روفی میرا بھائی کیسا ہے؟ اب ٹھیک تو ہے ناں؟''

''روفی اب بالکل ٹھیک ہے نومی بھائی' آئیں آپ۔''

پھر حیدر نومی کو روفی کے کمرے میں لے گیا۔

''یہ کیسے ہوا؟ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔'' نومی نے روفی کو ساتھ لگا کر پیار کیا۔

''بالکل ٹھیک ہوں اب تو نومی بھائی۔ بس بچ گیا ہو حیدر کی وجہ سے۔'' روفی نے حیدر کی طرف دیکھا۔

میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں حیدر یار۔'' نومی نے حیدر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے نومی بھیا۔ بس وسیلہ اس نے مجھے بنا دیا۔ اس میں میرا کیا کمال ہے؟ اب میں اس قدر بھی گرا ہوا انسان نہیں تھا کہ اسے بیماری میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا اس میں احسان مندی یا شکریے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو نادم ہوں کہ پھپھو۔'' اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

''اس میں ندامت کی کیا بات ہے حیدر۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم تو عادی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے' روفی پہلی بار بیمار ہوا ہے اور ان کی بے حسی کا شکار ہوا ہے۔ ہم تو چلچلاتی دوپہروں میں دھوپ میں کھڑنے ہونے کے عادی ہیں۔ ہم تو ٹھٹھرتی سردیوں میں لحاف کے بغیر سونے کے عادی ہیں کئی کئی دن بھوک برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اس میں ایسی کیا بات ہوئی اور۔''

''اچھا روفی۔ میں پھر آؤں گا۔ اب تو نومی بھیا آ گئے ہیں ناں اور تم **ہاسپٹل** کو گھر نہ سمجھ لینا۔''

''نہیں حیدر۔ میں اس مہربان ہاسپٹل کو گھر کیوں سمجھنے لگا۔ یہ تو بہت پرسکون جگہ ہے۔''

روفی کی گہری بات حیدر کے اندر تک اتر گئی۔ وہ بوجھل قدموں سے باہر آ گیا۔

روفی اور نومی کی داستان ان سے کوئی مختلف تو نہیں تھی مگر یہ لوگ محبتوں کے کس قدر ترسے ہوئے تھے۔ آج نومی نے اس کی پھپھو کے بارے میں جو باتیں کی تھیں' کوئی اور وقت ہوتا تو وہ نومی کا سر پھاڑ دیتا۔ مگر آج اس نے سب کچھ برداشت کر لیا تھا۔ اسے بار بار دکھ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی پھپھو کو سمجھ کیوں نہیں سکا۔ وہ تمام راستے انکے بارے میں سوچتا رہا۔

اپنی محبتوں اور خود پر ان کی عنایتوں کا تصور کرتا تو اسے پھپھو سارے زمانے سے اچھی اور سچی لگتیں مگر جب ان کا رویہ دوسروں کے ساتھ دیکھتا تو کھول جاتا۔ کیوں تضاد تھا پھپھو کے رویے میں؟ آخر کیا وجہ تھی کہ وہ باقی سب کے ساتھ تو مثل دشمن پیش آتیں اور اس کے ساتھ۔ یہ ساری باتیں سوچ کر جھنجھلا رہا تھا۔

''ہوں تو اس کا مطلب ہے ہمارے تمہارے خلوص میں ضروری کوئی کمی رہ گئی ہے' جب ہی تو۔'' رضا نے گہرا سانس لیا تو شفق ان سے لپٹ گئی۔

نہیں پپا۔ آپ لوگوں نے تو میری طلب' میری تمنا سے بڑھ کر مجھے پیار دیا ہے۔''

''پھر۔ پھر کیا وجہ ہے بیٹے؟'' رضا نے اس کے آنسوؤں صاف کیے۔

''کوئی وجہ نہیں پپا۔ بس اب دل چاہتا ہے کہ اپنے گھر جاؤں۔'' وہ نارمل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''آپ کی بات یہ نہیں ٹالتی رضا۔ آپ روک لیں اس کو۔'' شیریں نے پرامید نگاہوں سے رضا کی طرف دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے شیریں۔ یہ میری بات نہیں ٹالے گی مگر میں اس کو نہیں روکوں گا اب اسے اپنے والدین کے گھر جانا چاہیے۔'' شفق اور شیریں نے چونک کر دکھ سے رضا کو دیکھا جو باہر کھڑکی میں دیکھ رہے تھے۔ شیریں کو رضا سے ایسی بے مروتی کی ہرگز امید نہ تھی۔ شفق جھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔

''رضا۔'' رضا نے مڑ کر شیریں کو دیکھا۔ انکی آنکھوں میں جو تحریر تھی۔ وہ پڑھ کر مسکرا دیئے۔

''میں جانتا ہوں شیریں۔ تمہیں اور شفق کو میری بات ناگوار گزری ہے۔ میں خود یہ چاہتا ہوں کہ شفق اپنے والدین کے گھر چلی جائے کیونکہ اب میں شفق بیٹی کو ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لانا چاہتا ہوں اپنی بہو بنا کر' اپنے حیدر رضا کی دلہن بنا کر لانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ تمہیں منظور ہے۔ بناؤ گی اپنی شفق کو بہو؟''

رضا نے شیریں کو شانوں سے تھام لیا تو وفود جذبات سے شیریں کی پلکیں جھک گئیں۔

کتنا معتبر کر دیا تھا رضا کے اعتماد نے‘ کتنے مان سے وہ کہہ رہے تھے کہ بناؤ گی نا بہو؟

’’رضا۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کون سی ہو سکتی ہے؟ مگر حیدر؟‘‘

’’تمہارا اندیشہ درست ہے شیریں۔ مگر اب میں خدا کی ذات سے پوری طرح پرامید اور مطمئن ہوں انشاء اللہ تعالیٰ اب میری مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے دائمی خوشیاں دے گا۔ مجھے خدا سے قوی امید ہے۔‘‘

’’انشاء اللہ ضرور رضا۔ کیوں نہیں۔ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔‘‘

شفق کی ضد تھی کہ وہ ایک پل بھی اب یہاں نہیں رہ سکتی مگر سب لوگ کہہ رہے تھے کہ جانا ہی ہے تو شادی کے بعد چلی جانا اور ساتھ حیدر کو بھی کوس رہے تھے۔ جس نے ہمیشہ شفق کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔

’’اب روکو اسے۔ ہر وقت پیچھے پڑے رہا کرتے تھے۔‘‘ یاسر نے گھور کر حیدر کو دیکھا۔ جو شفق کے جانے کی ضد سے اندر ہی اندر بہت اپ سیٹ تھا۔

’’مائی فٹ۔ جاتی ہے تو جائے۔ تم لوگوں کو کیا ضرورت ہے روکنے کی؟‘‘ وہ اکھڑ پن سے پاؤں کی ٹھوکر سے کرسی کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

’’لعنت ہے تم پر یار حیدر۔‘‘ وقاص نے اس کی پشت کو گھورا۔

’’یاسر‘ تم لوگ کیوں ایسے کر رہے ہو‘ میں اس کی وجہ سے نہیں جا رہی ہوں۔ میں تو بس اس لیے جا رہی ہوں کہ میری امی بیمار رہتی ہیں۔ انکو میری ضرورت ہے ورنہ ان کو کون اہمیت دیتا ہے۔‘‘ شفق نے بھی غصے سے کہا تو وہ پلٹ آیا اور جس کرسی پر وہ بیٹھی تھی اس کے دونوں بازوؤں پر زور ڈال کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

’’واقعی دل سے یہ بات کہہ رہی ہو کہ تم مجھے اہمیت نہیں دیتیں؟‘‘ وہ انتہائی پختہ اور کاٹ دار لہجے میں بول رہا تھا۔

’’ہاں۔ ہاں۔ کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہونا۔‘‘ وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

’’جھوٹ مت بولا کرو۔ میں سب جانتا ہوں تم مجھے کتنی اہمیت دیتی ہو‘ میری ذرا سی بے اعتنائی تو دل توڑ دیتی ہے تمہارا اور۔‘‘

’’تم جیسے گھٹیا لوگ ایسی ہی سطحی باتوں سے خیابانِ چمن سجاتے ہیں۔ میرے نزدیک تمہاری کوئی اہمیت نہیں۔

سمجھ گئے؟ اور سن رکھو کہ میں تمہاری وجہ سے واقعی نہیں جا رہی۔‘‘ اس نے جھٹکے سے حیدر کو پیچھے ہٹایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’شفق۔‘‘

’’جی فہیم بھیا۔‘‘ وہ مڑ کر فہیم کو دیکھنے لگی۔

’’میں نے تو تمہیں کبھی بھی اپنی بہنوں سے کم نہیں سمجھا۔‘‘

’’تو بھیا۔ میں نے بھی ہمیشہ آپ کی بڑے بھائیوں کی مانند عزت کی ہے۔‘‘ وہ ان کی بات پر حیرانی سے بولی۔

’’اگر بھائی سمجھا ہوتا تو بھائی کو سہرا باندھنے سے قبل ہی جانے کی ضد نہ کرتیں۔‘‘ فہیم کو اس کے جانے کا افسوس تھا۔ شفق کو بہت افسوس ہوا۔ یہ بندہ ہمیشہ اس کی ڈھال بنا تھا اور یہ اس کے ساتھ زیادتی تھی کہ اس کی خوشی میں شرکت سے قبل ہی چلی جائے۔

’’سوری فہیم بھیا۔ میں اب شادی کے بعد ہی جاؤں گی۔‘‘

’’شکریہ شفق‘ تم نے میرا مان رکھ لیا۔‘‘

’’آپ نے ہمیشہ میرا مان رکھا ہے ایک بار میں نے رکھ لیا تو کیا ہوا۔ لیکن‘‘ وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔

’’لیکن کیا۔؟‘‘ فہیم نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

’’اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں سارا پھپھو کی طرف چلی جاؤں کیوں کہ انکی طرف تو کوئی بھی نہیں۔ ان کا کون خیال رکھے گا۔

’’گڈ آئیڈیا۔ اپنی شفق کم بولتی ہے مگر جب بھی بولتی ہے۔‘‘

’’بھونڈا ہی بولتی ہے۔‘‘ یاسر کی ادھوری بات حیدر نے مکمل کی تو اس نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ جینز کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے‘ دروازے سے ٹیک لگائے چیونگم چباتا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہا اس کا سر توڑ دے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

’’تمہیں اور بڑی پھپھو کو اللہ تعالیٰ نے کس مٹی سے بنایا ہے۔‘‘

’’بہت ہی اسپیشل والی مٹی سے۔‘‘ وہ ڈھٹائی سے ہنس دیا تو سب اسے گھورنے لگے۔ اور پھر یہ طے ہوا کہ آدھے لوگ سارا کی طرف چلے جائیں تا کہ ادھر بھی رونق ہو جائے اور سارا کو آسانی ہو جائے جب سارا کے گھر جانے کے لیے شفق۔ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو حیدر نے زور سے کہا۔

’’خس کم جہاں پاک۔‘‘

’’مجھے تو پہلے ہی بہت خطرات کا سامنا ہے‘ تم چین سے رہو۔‘‘ فہیم نے حیدر کا کان مروڑا۔

گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ صدیقہ ایک بار بھی نہیں آئی تھیں۔

’’ضیاء۔ کچھ کریں۔ منا لائیں صدیقہ کو۔ لوگ کیا کہیں گے کہ ماں کو شریک نہیں کیا۔‘‘ شاہین نے گوٹا لگاتے ہوئے کہا۔

’’جی ضیاء بھائی۔ آخر وہ ماں ہیں۔ کسی بھی طرح منا لائیں ان کو۔‘‘ شیریں کی بھی یہی

رائے تھی۔

"وہ ہماری بہن ہیں۔ ہم انہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ اس قدر انا پرست ہیں کہ اپنی انا کو قائم رکھنے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا سکتی ہیں اور انہیں بیٹی عزیز ہی کب تھی۔ وہ تو بس صغیر کی ضد میں آ کر انہوں نے سارا کو بیٹی مان بھی لیا۔ ورنہ شاید کبھی نہ مانتیں۔ انہیں بیٹی کی کسی تکلیف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ تو اس کی خواہش کہاں عزیز ہو سکتی ہے میں تو آج تک آپی کو سمجھ نہیں پایا' اس بہن نے تو میری اولاد کو بھی برباد کر کے رکھ دیا مجھ سے تو نہ جانے کیوں خدا واسطے کا بیر ہے ان کو۔" رضا نے دکھ سے کہا۔

"چلیں چھوڑیں رضا۔ ساری باتیں زندگی کے ساتھ ہوتی ہیں' وہ آپ کی بڑی بہن ہیں آپ لوگ خود جائیں منا لائیں انکو۔" شیریں کی اس بات پر حیدر نے چونک کر شیریں کو دیکھا' کس قدر معصوم اور سادہ لگ رہی تھیں ہر قسم کے شکوے شکایت سے بے نیاز ملاحت بھرے چہرے پر کتنا سکون تھا کتنا امن تھا کسی کدورت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ جانے کیوں ان کو دیکھتا رہا۔ آج تو یہ چہرہ اور چہرے والی اس کو قطعی بری نہیں لگی تھی اور نہ ہی اس پر جنون طاری ہوا تھا۔ کتنا تضاد تھا ان کی باتوں پر اور پھوپھو کی باتوں میں۔ پھپھو نے تو ہمیشہ ان کے خلاف ہی بات کی تھی مگر یہ تو۔ وہ سوچوں کے جال میں الجھ کر رہ گیا۔

"اچھا۔ کوشش کرتے ہیں صدیقہ کو منانے کی۔" ضیاء اور رضا اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم بھی چلیں رضا۔" شیریں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رہنے دو۔ تمہیں دیکھ کر ان کو ویسے ہی۔" رضا نے روک دیا۔

"کاش آپی مجھے میری خطا بتا دیں تو میں ان کے پاؤں چھو کر معافی مانگنے کو تیار ہوں مگر۔" شیریں افسردہ سی ہو گئیں۔

"حیدر۔ حیدر بیٹے۔"

"جی پپا۔" دوسری آواز پر وہ چونک اٹھا۔

"چلو یار۔ گاڑی نکالو۔ تمہاری پھپھو کو منانے کی ناکام کوشش کر آئیں۔"

❤ ❤ ❤

ان لوگوں کو دیکھ کر نخوت سے صدیقہ نے منہ موڑ لیا جب سے شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی تو وہ ان سے ہمیشہ سے زیادہ ناراض ہو گئی تھیں۔

"اب کیا لینے آئے ہیں اب تو خوشیاں مناؤ۔ میرے بے بسی پر ہنسو' میری بیٹی کو مجھ سے چھین کر۔"

وہ گویا پھٹ پڑیں۔

"صدیقہ۔ میری بہن اپنے گرد انا کی فصلیں اتنی بلند نہ کرو کہ اگر کبھی خود نکلنا چاہو تو تمہاری آواز کی بازگشت لوٹ کر؟۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں اب مجھ سے' نہیں چاہئیں مجھے آپ کی بھونڈی ہمدردیاں' کھوکھلی نصیحتیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔" وہ ضیاء کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی چیخ پڑیں۔ تو رضا اور ضیاء ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے حیدر بھی اب پھپھو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"صدیقہ۔ ہم نے سارا کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔"

"مبارک ہو۔ جائیے جا کر شادی کیجئے۔ یہاں کیا لینے آئے ہیں۔" وہ انتہائی بے گانگی سے بولیں تو ڈھیر سارا درد حیدر کے اندر اتر گیا۔

"صدیقہ۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ سارا تمہاری بیٹی ہے۔"

"اس اطلاع کا شکریہ۔" وہ ہر بات کا جواب بڑے کٹیلے اور زہر خند لہجے میں دے رہی تھیں۔ رضا اب تک خاموش تھے۔ حیدر بھی خاموشی سے سن رہا تھا۔

"صدیقہ۔ ہم تمہیں لینے آئے ہیں چلو نہ مانو تم سارا کو اپنی بیٹی مگر میرے بیٹے کی شادی میں تو آؤ ناں۔ آخر پھپھو ہو۔"

"جی آپی۔ ضیاء بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اپنے بھتیجے کی شادی میں تو شریک ہونا

چاہیے۔'' رضا بھی میدان میں اترے۔

''عزت اسی میں ہے کہ آپ لوگ مجھے ذلیل نہ کریں۔ میں نے قسم کھالی ہے کہ آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی' کوئی واسطہ نہیں ہے میرا کسی سے' کسی نے میرا خیال نہیں کیا۔ کسی نے میرا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ آپ لوگوں نے ہمیشہ مجھے دکھ دیئے ہیں۔'' وہ اب باقاعدہ رونے لگیں۔ بھائی کتنی ہی دیر سمجھاتے رہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اپنی ضد پر اڑی رہیں۔

''اچھا پھوپھو۔ آپ نہ آئیں ہمارے گھر۔ مگر سارا پھپھو کے گھر چلی جائیں۔ وہ آپ کو بہت مس کر رہی ہیں پھپھو پلیز۔''

''ہونہہ۔ اس ذلیل کے گھر چلی جاؤں جس سے مجھے نفرت ہے اور میں سب سمجھتی ہوں سارا کو کتنا میرا خیال ہے۔ لیکن جاؤں گی میں کہیں بھی نہیں۔؟'' وہ کسی ضدی بچے کی طرح ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔

''پھوپھو پلیز۔ میری خاطر۔'' حیدر نے بڑے مان سے کہا۔

''کیوں۔ تمہاری خاطر' تم کون ہو؟ اولاد تو اسی کی ہو ناں جس نے کبھی میری عزت نہیں کی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس دو کوڑی کی عورت کو بیاہ لایا؟''

حیدر کا دل تو ٹوٹا ہی تھا۔ رضا کے ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ گئے۔

''خدا جانے آپی۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے ہمیشہ میری زندگی میں زہر ہی گھولا ہے پہلے بھی زبردستی عفت کو میرے پلے باندھ دیا۔ اور پھر بھی سکون سے نہ بیٹھیں۔ ہر وقت آگ لگاتی رہیں پھر میرے بچوں میں نفرت کا زہر بھرنے لگیں۔ آپی خدا کے لیے بتا دیں۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے آپ کا کہ آپ مجھے ہر وقت تڑپاتی رہتی ہیں۔ آپ کے لیے اس نے ہمیشہ اچھا سوچا۔ اور اب آپ کو منانے کے لیے بھیجا۔ اس نے آپی' جس کے خلاف آپ نے ہمیشہ زہر اگلا ہے میرے بچوں کو اس کے خلاف کیا ہے آپی۔'' بولتے بولتے رضا ہانپنے لگے۔

''رضا۔ رضا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ہم اس لیے تو نہیں آئے کہ گڑے مردے اکھاڑیں۔ اور تمہیں خیال کرنا چاہیے۔'' صدیقہ تمہاری بڑی بہن ہے'' ضیاء نے رضا کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

کاش۔ یہ خود کو بڑی بہن ثابت بھی کرتیں۔ دشمن نہ بنتیں۔'' رضا بھی تھک چکے تھے اب۔

''چلو صدیقہ جانے دو' چھوٹا بھائی ہے معاف کر دو۔ غصہ تھوکو اور چلو گھر۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' ضیاء نے پھر معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔

''میں فیصلے بدلا نہیں کرتی۔ ضیاء بھائی آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' وہ اسی طرح ہٹ دھرمی سے بولیں۔

''تایا جان۔ پپا کو لے جائیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

حیدر' رضا کے ہاتھ سہلا رہا تھا وہ تو رضا کے ہارٹ اٹیک سے اتنا ڈرا تھا کہ ذرا سی بات پر گھبرا جاتا۔

''ہاں چلو بیٹا۔ بیٹھنا بھی تو بے فائدہ ہی ہے۔ صدیقہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا سیکھو ورنہ بالکل تنہا رہ جاؤ گی۔ بھائیوں کے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے تمہارے لیے۔ جب چاہو چلی آنا'' ضیاء اٹھتے ہوئے بولے۔

''ہونہہ چلی آنا۔ میں بے گھر نہیں ہوں کہ چلی آؤں۔'' وہ حقارت سے بولیں۔

''تم لوگ ضرور آنا بیٹا نومی' روفی۔'' باہر نکلتے ہوئے رضا نے نومی اور روفی کو آنے کے لیے کہا۔

''اس گھر کی گرد بھی اڑ کر ادھر نہیں جا سکتی تو ان کی کیا مجال ہے۔'' ان کے بجائے جواب صدیقہ نے دیا تو وہ لوگ مزید نہیں رُکے۔

شادی کے انتظامات بہت اچھے ہو رہے تھے مگر صدیقہ کی وجہ سے سب کے دلوں میں خلش سی رہ گئی تھی۔ سب سے زیادہ اثر حیدر پر ہوا تھا جو صدیقہ کا منظور نظر رہا تھا۔ اس نے ہی ان کی محبتیں سمیٹی تھیں۔ اب ان کے رویے نے اچانک اسے بددل سا کر دیا تھا۔ سارا کو جب معلوم ہوا تو کہ صدیقہ شریک نہیں ہو رہیں تو وہ بڑی شدت سے روئی۔ کیا قسمت تھی اس کی بھی کہ وہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی ممتا اور دُعاؤں سے محروم تھی۔ جو کام اس کی ماں کے کرنے والے تھے' وہ اس کے ابو کر رہے تھے۔ گھر میں یہ پہلی شادی تھی اس لیے سب اسے بھرپور انداز سے منانا چاہتے تھے۔

''اس روز مہندی جانی تھی۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ لڑکیاں الگ پریشان تھیں ہار سنگھار میں لڑکے بھی سب میں نمایاں ہونے کے چکر میں تھے۔

''یار۔ یہ ٹائی کیسی رہے گی اس کے ساتھ۔'' وقاص نے سرخ ٹائی حیدر کو دکھائی۔

''ہاں۔ کیا ضرورت ہے اتنے تردد کی۔ وہاں بھی ان سے تعلق رکھنے والی مخلوق ہو گی کوئی نئی چیزیں نہیں ہوں گی۔ پھر کیا فائدہ؟'' حیدر نے افراتفری سے بھاگتی شینا کو دیکھا۔ اس نے سنا ہی نہیں ورنہ جواب تو ضرور دیتی' وہ سب کو تیار ہونے پر ٹوک رہا تھا مگر جب خود تیار ہو کر آیا تو سب اسے دیکھتے رہ گئے۔

''کیا ضرورت تھی اتنا اچھا لگنے کی؟ وہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں پھر یہ تیاری کس لیے؟'' وقاص نے ہلکا سا طنز کیا۔

''ہے ایک۔ اسے جلانے کے لیے۔'' حیدر نے یاسر کو دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

''خوش فہمی ہے' وہ متاثر ہونے والی نہیں۔'' یاسر پرفیوم اسپرے کرتا ہوا بولا۔

''متاثر تو وہ بہت ہیں۔ کبھی موقع ملا تو ثبوت پیش کردوں گا۔''

''اچھا بکومت۔ خبردار جو آج کے دن کوئی بات کی ہوتو'' یاسر نے اسے ڈپٹ دیا۔

''ارے بچو۔ نو تو بج چکے ہیں کب جاؤ گے اور کب آؤ گے۔ صبح سے یہ وقت ہوگیا ہے اور تم لوگوں کی تیاری ابھی تک نہیں ہوئی جلدی کرو۔'' شاہین اور شیریں بار بار ان لوگوں کو جلدی جلدی کا کہہ رہی تھیں۔

''تائی جان۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔ یہ آپ کی آل اولاد ہی دیر کررہی ہے۔ دیکھیے کیسا لگ رہا ہوں؟''

وہ سیاہ ڈنر سوٹ میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''ماشا اللہ۔ چشم بددور۔ بہت اچھے لگ رہے ہو۔'' شیریں نے ممتا بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پیار سے کہا تو حیدر چونک کر ان کو دیکھنے لگا کتنی مٹھاس تھی ان کے لہجے میں اس نے کوئی جواب نہیں دیا آگے بڑھ گیا۔

ساڑھے نو بجے کے قریب یہ لوگ ہنستے گاتے مہندی لے کر روانہ ہوئے۔ ثناء کے سارے خوف دور ہوچکے تھے۔ اسی لیے حیدر کے بازو سے لپٹی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ صغیر احمد نے بڑے اچھے انتظامات کیے تھے۔ مہمان بھی بہت آئے تھے۔ دولہا والوں کا بڑا اچھا استقبال کیا گیا۔

بینا' شفق وغیرہ پھولوں کے ہار دولہا والوں کے گلے میں ڈال رہی تھیں۔ سبز کپڑوں اور میک اپ میں لڑکیاں بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ شفق سب کو ہار پہنا رہی تھی۔ حیدر نے شوخ سی نظر اس پر ڈالی اور سر جھکا دیا۔ مگر شفق نے ہار آگے بڑھ کر یاسر کے گلے میں ڈال دیا تو حیدر مزید جھک کر فرش پر کچھ اور تلاش کرنے لگا اور یہ ظاہر کرنے لگا گویا وہ ہار کے لیے نہیں جھکا تھا۔ یاسر کے ساتھ شفق بھی اس کی مکاری سمجھ گئی۔ اس نے ادھ کِھلی کلیوں کو یاسر کو دیا کہ اس کے گلے میں ڈال دے۔

یاسر نے اسے ہار دیا تو حیدر نے ہار پکڑ کر شفق کو دیکھا جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہار ڈسٹ بن میں ڈال دیا شفق کوئی اہمیت دیے بغیر وہاں سے ہٹ گئی۔

''بہت کمینے ہو یار' ان معصوم کلیاں کا کیا قصور تھا؟''

''قصور تو میرا خیال ہے دینے والی کا بھی نہیں۔'' وہ یاسر کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''تو پھر یہ حرکت کرنے کی وجہ؟''

''بس ایسے ہی دل چاہ رہا تھا۔'' وہ رنگ برنگی لائٹوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

''یار تم دنوں مخالف سمتوں میں چلنے والے سیارے ہو' اگر خدا نے تم دونوں کا جوڑا بنا دیا ہوا ہوتو کیا بنے گا۔'' یاسر واقعی اس نکتے پر بھی سوچتا۔

''بڑی آئیڈیل لائف ہوگی دیکھنا۔'' حیدر شوخی سے مسکرا کر سارا کے ساتھ فٹ ہوگیا جو پیلے سے کپڑوں میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔

''اُف سارا پھپھو۔ آپ تو تھک گئی ہوں گی یوں اکڑوں بیٹھ بیٹھ کر۔ میں اسی لیے دلہن نہیں بنتا۔ شادی کے دنوں میں بیٹھنا بہت دشوار پڑتا ہے۔'' اس کی بات پر سارا کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''ہش۔ سارا پھپھو۔'' دلہنوں کو ہنسنا بھی منع ہوتا ہے'' اس نے اسے ہنسنے سے بھی روک دیا۔

لڑکیاں خوب مقابلہ کررہی تھیں۔ ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ سارا کی طرف شفق بڑی تیز تھی۔ اسے بہت سے گانے آتے تھے جس کی وجہ سے یہ لوگ ہار رہے تھے۔ یاسر ان کی طرف چلا گیا تھا۔

''بھیا۔ آپ بھی آئیں نا ورنہ ہم ہار جائیں گے۔'' ثناء حیدر کا بازو پکڑ کر لے آئی میدان میں۔''

''دیکھنا۔ ابھی لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ اور جیت ہماری ہوگی انشاء اللہ۔''

حیدر نے شوخی سے شفق کو دیکھا جو بظاہر اپنا گجرا درست کررہی تھی مگر کان اسی کی طرف لگے ہوئے تھے اب شفق کا دل نہیں چاہ رہا تھا گانے کو۔ مگر وہ اس کے کہنے پر میدان چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی اس لیے مقابلہ کرتی رہی۔

ان لوگوں نے ایسی ہلڑ مچائی کہ خدا کی پناہ۔ پھر مہندی پر ایسا طوفانِ بدتمیزی برپا ہوا کہ بزرگوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ خوشیوں کی اس برسات میں سب ہی صدیقہ کی کمی محسوس کررہے تھے۔ ادھر صدیقہ بھی انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو سب کو تہس نہس کردیتیں۔

نومی' رونی کا بہت دل چاہ رہا تھا جانے کو مگر وہ صدیقہ کے خوف سے نہیں گئے۔ حالانکہ یاسر وغیرہ نے کئی بار فون کیے تھے۔ مگر صدیقہ نے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ لوگ گئے تو وہ نہ ان کو چین لینے دیں گی اور نہ ان لوگوں کو۔ ان لوگوں کی تو خیر تھی لیکن وہ ان لوگوں کی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔

''کاش صدیقہ بھی شریک ہوتی۔ اپنے ہاتھوں سے بیٹی کو رخصت کرتی مگر اس کی تو قسمت میں...... شاید کوئی خوشی ہے ہی نہیں۔'' ضیاء کو بار بار صدیقہ کا خیال آرہا تھا۔

''جو دوسروں کی خوشیاں چھینتا ہے بھائی جان' وہ خود بھی خوشیوں سے محروم رہتا ہے۔ اس

بہن نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے' میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میری زندگی میں جو زہر انہوں نے گھولا ہے۔ وہ ہر وقت میری رگوں کو کاٹتا رہتا ہے میرے بچوں کو مجھ سے جدا کر دیا ہے۔'' رضا نے دکھ سے کہا تو انہوں نے جو اذیت ناک زندگی گزاری تھی وہ ہی جانتے تھے۔

''چلو چھوڑو رضا اب کر بھی کیا سکتے ہو۔ اس نے سکون کس کو لینے دیا ہے۔ نہ خود سکون سے رہیں اور نہ کسی اور کو سکون لینے دیا ہے۔ وہ تو سگی بیٹی کی نہیں بنی تو۔'' دونوں بھائی مسلسل باتیں کر کے کڑھ رہے تھے۔

شادی والے روز ایک ہنگامہ تھا ہر کوئی سب سے نمایاں نظر آنے کی کوشش میں تھا۔ شفق کو بار بار روفی' نومی کا خیال آ رہا تھا مگر اس نے حیدر کے خوف سے کسی سے پوچھا نہیں تھا مگر یاسر اکیلا مل گیا تو اس نے پوچھ لیا۔

''یاسر۔ نومی بھائی اور روفی کیوں نہیں آئے؟''

''اس لیے کہ پھپھو نے نہیں آنے دیا۔'' کہو تو روفی کو اغوا کر لاؤں۔'' اس سے قبل کہ یاسر جواب دیتا حیدر جانے کہاں سے نکل آیا۔ اس کی بات شفق کے اندر تک اتر گئی۔ کیا کچھ کر گزرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کس قدر گھٹیا سوچ ہے اس کی۔

''جو لوگ رشتوں کے تقدس کو نہیں پہچانتے وہ انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں اور تم کسی حیوان سے کم نہیں ہو۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

''حیدر واقعی تم۔ اس قدر گر جاتے ہو کبھی کبھی کہ۔'' یاسر بھی کوئی تلخ بات کہتا کہتا رہ گیا۔

بارات جانے کے لیے تیار تھی جیسے ہی فہیم سجی ہوئی گاڑی میں بیٹھنے لگا اسی وقت ایک ٹیکسی آ کر رکی اور فیاض علی نکل آئے۔ سب جہاں تھے' وہیں رک گئے۔

❤ ❤ ❤

''فیاض علی۔'' ضیاء نے کوٹ کی جیب سے چشمہ نکال کر لگاتے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ تو فیاض بھائی ہیں بھائی جان۔'' رضا آہستگی سے بولے۔

''پھوپھا جان۔ خدایا خیر۔'' فہیم کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا بڑے بچے' مرد و خواتین سب ہی فیاض علی کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے حالانکہ یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی۔ فیاض علی اس گھر کے بڑے داماد تھے۔ صدیقہ کے شوہر تھے۔ آنا تو تھا ہی ان کو اور پھر جبکہ انہوں نے خود شادی کا کارڈ لندن ان کو بھیجا تھا تو کیوں نہ آتے۔ مگر وہ اس قدر عین موقع پر پہنچ جائیں گے اور جبکہ ان کے بیوی بچے بھی نہیں آئے تو کیا خیال کریں گے اور پھر اس موقع پر کہ جب وہ خوشیوں کے سفر پر نکل رہے تھے۔ سب ہی کسی انجانے خطرے کے خوف سے جز بز ہو گئے۔

''اسلام علیکم ضیا۔ بھائی۔ لگتا ہے آپ سب نے مجھے پہچانا نہیں۔'' میں فیاض علی ہوں آپ سب تو ایسے مجھ کو دیکھ رہے ہیں۔ کہ گویا میں کوئی اجنبی ہوں۔'' فیاض علی ٹیکسی سے فراغت کے بعد ان سب کو حیران دیکھ کر ضیاء کی طرف بڑھے تو وہ نادم ہو گئے۔

''ارے نہیں فیاض پہچانا کیسے نہیں۔ ہم تو حیران ہو رہے ہیں کہ تم آج عین بارات والے روز پہنچ کیسے گئے۔ تم نے تو جواب بھی نہیں دیا تھا۔ خط کا نہ کارڈ ملنے کا۔ ضیاء نادم سے ان کے گلے لگتے ہوئے بولے۔

''اتفاق سے آپ کا کارڈ مجھے اس وقت ملا۔ جب میں واپسی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کارڈ ملا تو میں نے سوچا کیوں نہ بارات والے روز جا کر سب کو سرپرائز دیا جائے۔ مبارک ہو آپ سب کو۔'' ضیاض علی رضا اور باقی لڑکوں سے گلے مل رہے تھے فہیم کو انہوں نے گلے لگایا تو چونک کر پھر ایک دم الگ کرتے ہوئے غور سے دیکھنے لگے۔

''ضیاء بھائی یہ آپ کا بیٹا فہیم ہی ہے ناں۔'' انہوں نے تصدیق کے لیے ضیاء کو دیکھا۔

''ہاں۔ ہاں کیوں تم نے اسے پہچانا نہیں۔'' ضیاء نے پیار سے فہیم کو دیکھتے ہوئے کہا جو دولہا بن کے بہت اچھے لگ رہا تھا۔

''شادی اس کی ہے یا آپ کی بہن سارا کی۔'' فیاض علی حیرانگی سے پوچھ رہے تھے۔

''سارا کی اور اس کی دونوں کی۔'' ضیاء شاید کچھ سمجھ نہیں پائے اس سے مسکرا کر بولے۔

''مگر یہ کارڈ۔ میں۔ شاید مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے۔'' فیاض علی نے بیگ سے ان کی شادی کا کارڈ نکالا اور غور سے پڑھنے لگے۔

''رضا۔ ضیاء بھائی میں تو سمجھ نہیں پا رہا۔ یہ کیا چکر ہے سارا اور فہیم کی شادی کیا مطلب ہے؟ میں تو کنفیوز ہو رہا ہوں۔'' فیاض علی نے رضا اور ضیاء کو دیکھتے ہوئے کہا تو رضا اور ضیاء کے ساتھ سب ہی سمجھ گئے۔ سب ہی گھبرا گئے خصوصاً خواتین کے منہ۔ خشک ہو گئے۔

''اب ہوگا پھڈا۔''

''کیوں پھڈا۔ کس بات کا انکا تو سارا پھپھو سے کوئی تعلق ہی نہیں۔'' حیدر نے ایاز کی سرگوشی کا ڈانٹ کر جواب دیا۔

''ہاں وہ اصل میں فیاض علی۔ آؤ تم اندر کچھ دیر بیٹھو تو سہی۔ سب باتیں یہیں پوچھ لو گے کیا؟ ضیاء اور رضا ان کو اندر لے گئے خواتین بھی اندر چلی گئیں۔

''کیا مصیبت ہے عین وقت پر ٹپک پڑے ہیں کچھ دیر اور نہ آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہم لوگ گھر سے نکل تو جاتے شینا نے بُرا سا منہ بنایا۔ سب کے منہ اتر گئے تھے کتنے خوش تھے۔ سب جوش و خروش۔ ماند پڑ گیا تھا۔

دولہا میاں اپنی شادی پر ہونے والے رخنے کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟'' حیدر نے پین کو مائیک کے انداز سے فہیم کے آگے کر دیا۔

''تاثرات کیا ہونے ہیں یار میری شادی میں تو اتنے رخنے پڑ چکے ہیں کہ اس رخنے کا میں منتظر تھا اب تو یہ بھی جی چاہتا ہے کہ گریبان چاک کر کے صحرا نورد ہو جاؤں۔'' فہیم نے گہری سی سانس لے کر کہا۔

''واہ کیا بات کہی ہے آپ نے جلدی کیجئے۔'' قسم سے سارا پھپھو کو ایسا مجنوں نہیں چاہیے۔'' اس سے قبل کہ فہیم حیدر کا کان پکڑتا۔ وہ پھرتی سے بھاگتا ہوا اندر آ گیا اور اس کمرے کی کھڑکی سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''میں تو بہت بوکھلا گیا ہوں۔ یہ چکر کیا ہے فہیم اور سارا۔ سارا تو۔'' فیاض علی بہت الجھ گئے تھے کیونکہ وہ سارا کو ضیاء کی بہن کی حیثیت سے جانتے تھے اور فہیم بھیا ضیاء کا بیٹا تھا تو پھر ان کی شادی نے لاعلم سے فیاض علی کو گڑبڑا کر رکھ دیا تھا وہ اس گھر کی ہر بات سے واقف تھے

مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ سارا صدیقہ کی بیٹی ہے اور وہ اب اس کے بارے میں پوچھ بھی ایسے موقع پر رہے تھے جب ضیاء سارا کو بہو بنانے جا رہے تھے اور اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی فرضی بات بنا کر فیاض علی کو مطمئن کر دیا جائے۔

''ہاں فیاض علی تمہیں شاید علم نہیں کہ سارا ہماری بہن نہیں۔''

''بہن نہیں پھر۔ پھر کون ہے؟'' فیاض علی نے درمیان ہی میں بات اچک لی۔

''سارا کو اصل میں ابا جی نے گود لے لیا تھا اور ہم سب نے اسے بہن ہی سمجھا گو کہ سارا ہمارے بچوں کے برابر تھی مگر چونکہ ابا جی۔''

''سارا ہے کس کی بیٹی۔ کس سے لے لیا تھا۔'' فیاض علی کرید رہے تھے۔

''فیاض علی میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ ہم یہ باتیں بعد میں کس وقت تفصیل سے کریں۔ اس وقت تو بارات تیار ہے اور دلہن والے انتظار کر رہے ہوں گے پہلے اس فرض سے فارغ ہو جائیں تو پھر۔''

''جی فیاض بھائی یہ باتیں تو بڑی تفصیل طلب ہیں پہلے ایک فرض سے فارغ ہو جائیں تو۔'' ضیاء کے بعد رضا بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو فیاض علی بھی الجھے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اچھا تو چلیے میں تو حیران ہی ہو گیا تھا چلیے اب یہ عقدہ تو حل ہوا کہ سارا کو لے کر پالا ہے اور فہیم کے ساتھ اس کی شادی ہو سکتی ہے۔'' وہ گویا خود سے بولے۔

''فیاض بھائی آپ کو غسل کرنا ہوگا۔ کپڑے وغیرہ۔'' چلتے چلتے جیسے رضا کو خیال آ گیا تو وہ مڑ کر بولے۔

''ارے نہیں بھئی مجھے معلوم تھا شادی پر جانا ہے میں سیدھا ہوٹل گیا وہاں سے تیار ہو کر آیا ہوں۔ حیرت ہے وہاں جب کارڈ پر سارا اور فہیم کا نام دیکھا تو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی مگر یہاں آ کر۔ خیر صدیقہ اور بچے کہاں ہیں؟ مجھے تو ان کا بھی خیال نہیں رہا وہ نظر نہیں آ رہے۔'' ایک مسئلہ حل ہوا تو ان کو صدیقہ اور نومی' روفی کا خیال آ گیا۔ رضا اور ضیاء ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''وہ فیاض صدیقہ اور بچے تو نہیں آئے۔'' دونوں جیسے مجرم بن گئے۔

''نہیں آئے کیا مطلب؟'' فیاض علی کے بڑھتے قدم رک گئے۔

''ہاں اس کو تم جانتے ہو کہ صدیقہ ذرا گرم مزاج ہے بس ہم لوگوں سے ذرا ان بن ہو گئی تھی تو ناراض ہو گئی۔ لاکھ منایا مگر وہ نہیں مانی اور شادی پر نہ خود آئی۔ اور نہ بچوں کو آنے دیا۔'' ضیاء اور بتاتے بھی کیا۔ وقت ہی اتنا نازک تھا کہ حقیقت بتا نہیں سکتے تھے۔

''ایسی بھی کیا ناراضگی کہ انسان اتنی اہم خوشی میں شریک نہ ہو۔'' فیاض علی کو بہت مایوس ہوئی تھی یہ سنکر۔

''تو پھر میں چلتا ہو گھر میں بچوں کو دیکھنا چاہتا ہوں تین سال ہو گئے ہیں۔ ان کو دیکھے ہوئے۔'' وہ واپسی کے لیے پلٹے تو سب پریشان ہو گئے۔

''فیاض بھائی' یہ تو زیادتی ہے آپ اتنی دور سے شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں اور اب نہیں جا سکتے آپ۔ آپ بھی آپی کی جگہ ہیں آپ کی شرکت سے ان کی کمی پوری ہو رہی ہے لہٰذا آپ نہیں جائیں گے۔'' رضا نے بڑھ کر روک لیا تو وہ بے دلی سے رک گئے۔

خدا خدا کر کے بارات روانہ ہوئی مگر پھر بھی سب کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جانے اب بھی کیا ہو جائے۔

''دولہا میاں اب تو کسی رخنے کا انتظار نہیں۔ حیدر آہستگی سے فہیم کے کان میں بولا۔

''یار کچھ پتا نہیں ابھی تو واپسی کا سفر بھی پڑا ہے۔'' فہیم نے بے دلی سے کہا۔

ڈر تو سب رہے تھے مگر شکر ہوا کہ کوئی اور بات نہیں ہوئی۔ ہال میں شفق' صائمہ اور یاسر وغیرہ نے ان کا استقبال کیا۔ آف وائٹ شرارے اور میک اپ میں شفق بہت اچھی لگ رہی تھی۔ حیدر نے ایک گہری اور شوخ نگاہ اس پر ڈالی اور بڑے تپاک سے اس کی طرف بڑھا۔

''ہیلو کیسی ہیں آج تو آپ محفل لوٹ لینے کے چکر میں وجہ کیا ہے آخر؟ ویسے آپ بے حد اچھی لگ رہی ہیں۔

یاسر کے سر کی قسم۔'' وہ مسلسل اس کی تعریف کیے جا رہا تھا اور وہ جزبز ہو رہی تھی یاسر بھی متوجہ ہو گیا تھا دونوں سمجھ رہے تھے کہ کوئی بدتمیزی ضرور کرے گا۔

''بات کیا ہے آج بڑے موڈ میں ہو۔'' یاسر اس کے قریب چلا آیا۔

''یار موڈ کی بات نہیں ہم تو خدا کی اچھی چیز کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔''

اب وہ براہ راست شفق کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس لیے وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ اپنے پیچھے اس نے سنا وہ صائمہ سے پوچھ رہا تھا۔

''صائمہ بھئی تم لوگوں کی شفق باجی نظر نہیں آ رہیں۔'' وہ مکاری سے انجان بنتا ہوا بولا تو یاسر اسے گھورنے لگا۔

''وہ کون تھی جس کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔''

''کیا مطلب تو وہ۔ ارے نہیں یار قسم کھاؤ اپنے سر کی کہ وہ وہی تھی۔ سڑی سی نک چڑھی سی۔'' اس نے ایسے اداکاری کی کہ گویا واقعی نہیں پہچانا تھا۔

''باتیں نہ بناؤ وہ شفق ہی تھی۔''

''بنو مت اب۔''

''نہیں یار۔ صائمہ کے نقلی ناخنوں کی قسم میں نے نہیں پہچانا یار۔ داد دیتا ہوں میں میک اپ بنانے والے کو کس طرح چہرے بدل جاتے ہیں کہ انسان بالکل ہی بدل جاتا ہے۔ لو اب مجھے بھی دیکھو میک اپ کی تہوں میں اسی سڑی مرچ کو پہچان نہیں سکا حد ہو گئی۔ یار۔ یعنی کہ۔''

''اچھا بکواس بند کرو اب۔ ہم سب سمجھتے ہیں میں بھی کہوں کہ تم انسانی کھال میں آ کیسے گئے۔'' وہ شفق کو سنانے کے لیے بلند آواز میں بول رہا تھا اور وہ بھی تو بظاہر وقاص سے باتوں میں مصروف تھی مگر کان اس بدتمیز کی طرف لگے ہوئے تھے۔

''یہ بن رہا ہے اصل میں آج اسے شفق بہت اچھی لگی ہے ناں تو تعریف کرنا چاہتا تھا۔ مگر جھوٹی انا کی وجہ سے کر نہیں سکتا تھا۔ اس نے سوچا اسی میں۔''

''بالکل۔ بالکل درست کہہ رہا ہے ایاز۔'' یاسر اور ایاز اسے چھیڑ رہے تھے اور وہ زیر لب مسکرا رہا تھا پھر یاسر نے ایاز کو منع کر دیا کہ اب مذاق نہ کرے مبادا پٹڑی سے اتر جائے وہ لوگ اندر جا رہے تھے کہ شیریں بوکھلائی سی آ گئیں۔

''حیدر بیٹے ذرا جلدی سے میرے ساتھ گھر چلو سارا کا وہ سیٹ جو تمہارے پپا نے سارا کو نکاح کے وقت پہنانا تھا۔ وہ تو میں گھر بھول آئی ہوں چلو لے آئیں۔

''آیئے چچی جان میں لے چلتا ہوں میں بھی فارغ ہوں۔'' شیریں کی بات پر حیدر خاموش نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگا تو وقاص نے اپنی خدمات پیش کر دیں مبادا وہ کوئی الٹ بات کہہ دے یا نہ جائے تو ماحول خراب نہ ہو جائے۔

''غالباً حیدر میرا نام ہے اور وہ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ آیئے۔'' حیدر نے مضبوط لہجے میں کہا اور شیریں کے لیے رستہ بنانے لگا۔

''لگتا ہے اللہ تعالیٰ کو چچی جان پر رحم آ ہی گیا ہے بندہ لائن پر آتا جا رہا ہے۔'' ان کے جانے کے بعد ایاز نے آہستگی سے کہا۔

''خیر حیدر برا تو نہیں تھا بس ذرا پھپھو۔''

''اچھا چھوڑو یار اس موقع پر ان باتوں کو۔'' یاسر نے ان کو منع کیا اور سب اندر چلے گئے۔

''بیٹھیے۔'' حیدر نے انکے لیے دروازہ کھول کر آہستگی سے کہا تو بے ساختہ سی دعا شیریں کے لبوں تک آ گئی۔

''جیتے رہو بیٹا۔'' وہ اسے دعا دیتی بیٹھ گئیں وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا یوں زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ دونوں یوں اکیلے گاڑی میں کہیں جا رہے تھے اور حیدر نے خود ان کے لیے دروازہ کھولا تھا وہ بے حد خوش تھیں اور خدا کا شکر بھی ادا کر رہی تھیں۔

''بیٹے میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا۔'' انہوں نے پیار سے گیئر بدلتے ہوئے حیدر کو

دیکھا۔

''جی نہیں۔'' بہت دھیما اور مختصر جواب ملا۔ آج ان کا کہا مان کر خود اسے عجیب سی خوشی ہو رہی تھی اپنے اندر ایک مسرت محسوس کر رہا تھا سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیوں؟ شیریں کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اس فرمانبرداری پر اس کی پیشانی چوم لیتی۔ وہ بڑا ہی گستاخ تھا مگر ان کو اتنا ہی عزیز رہا تھا ان کو کبھی نہ تو اس پر غصہ آیا اور نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

''بس بیٹے میں ابھی چیزیں لے کر آئی۔'' شیریں جلدی سے اندر چلی گئیں وہ گاڑی سے باہر نکل کر ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا کچھ ہی دیر میں شیریں چیزیں لیے واپس آ گئیں تو حیدر نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ بیٹھنے لگیں مگر جیسے ہی حیدر نے دروازہ بند کیا شیریں کراہ اٹھیں حیدر پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا...... آپ کو؟''

''کچھ نہیں بیٹا شاید پاؤں دروازے میں آ گیا ہے۔'' شیریں نے ہونٹ دبا کر بمشکل۔۔ درد کی ٹیس کو دبایا۔

''لائیے مجھے دکھایئے۔'' اور پھر وہ اٹھ کر ان کا پاؤں دیکھنے لگا جو خون سے تر بہ تر ہو رہا تھا زخم خاصا بڑا اور گہرا تھا وہ گھبرا گیا۔

''اوہو۔ یہ تو بہت بڑا زخم ہے بہت تکلیف دے رہا ہوگا آپ کو۔'' اس نے شیریں کا پاؤں ہاتھوں میں لے لیا تو اس کے ہاتھ بھی خون آلود ہو گئے۔ اس وقت وہ ہمیشہ سے مختلف حیدر لگ رہا تھا بہت فرمانبردار سا۔ ہمدرد سا بیٹا۔ شیریں کو۔ اب پاؤں میں درد نہیں ہو رہا تھا بلکہ جب سے حیدر نے پکڑا تھا بڑا پرسکون محسوس ہو رہا تھا۔

''نہیں بیٹا کچھ تکلیف نہیں تم گاڑی چلاؤ۔ دیکھو ذرا میرے بیٹے کے ہاتھ خراب ہو گئے ہیں بالکل ٹھیک ہوں چاند تم فکر نہ کرو۔ چلو گاڑی چلاؤ۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔'' انہوں نے حیدر کے ہاتھ اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر گاڑی چلانے لگا مگر گاڑی ایک کلینک پر جا رکی۔

''کس لیے بیٹے؟'' شیریں نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ انکے لیے حیدر کی یہ تمام عنایات خدا تعالیٰ کے کسی بڑے انعام سے کم نہیں تھیں وہ لمحہ بہ لمحہ منزل کے قریب ہو رہی تھیں۔

''آپ کا زخم بہت گہرا ہے پٹی کروا لیجئے۔''

''اچھا بیٹے جیسے تم کہو۔ ورنہ تو اس زخم سے جو راحت مل رہی ہے اس کا خیر۔'' پھر شیریں نے پٹی کرائی وہاں کھانا شروع ہو چکا تھا۔ رضا بے چینی سے باہر ٹہل رہے تھے کیونکہ ایاز سے ان کو پتا چلا تھا کہ حیدر شیریں کو لے کر گیا ہے۔ جانے کیوں بُرے بُرے وہم آ رہے تھے ان

کو۔ وہ تو زندگی کے ہاتھوں اتنا سہہ چکے کہ اب کوئی خوش کن تصور آتا ہی نہیں تھا۔

''حیدر بیٹا۔ وہ اصل میں۔'' حیدر دروازہ کھولے کھڑا تھا اور شیریں سے قدم نہیں رکھا جا رہا تھا۔ پاؤں گویا تھا ہی نہیں۔

''بیٹا کوئی چھڑی وغیرہ ہو تو...... بہتر ہے مجھ سے تو نہیں چلا جا رہا۔''

''آپ میرا سہارا لے کر چلیں ناں یہاں میرے شانے پر ہاتھ رکھیں۔ لائیں اپنا ہاتھ۔'' پھر حیدر نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے شانے پر رکھا۔

''خدا تمہیں سلامت رکھے بیٹا۔ جوان بیٹے ہی والدین کا سہارا بنتے ہیں۔''

وہ اسے بے شمار دعائیں دے رہی تھیں اور ایک ٹھنڈک سی حیدر کے اندر اتر رہی تھی جس کی لطافتوں کا حیدر کو ادراک...... ہو رہا تھا۔ بے قراری سے ٹہلتے رضا کی نظر جوان پر پڑی تو پہلے تو وہ گھبرا گئے کہ شیریں کو کیا ہوا لیکن شیریں کی تکلیف کا احساس اس لطیف خوشی میں دبا۔ رہ گیا کہ شیریں کو حیدر نے تھام رکھا ہے اور شیریں کے لبوں پر بڑی پرسکون اور آسودہ سی مسکراہٹ ہے۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

''یہ تم ماں بیٹا کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔''

''پپاوہ'' رضا کو دیکھ کر حیدر کچھ جھجک سا گیا۔

''میں سارا کا سیٹ گھر ہی بھول آئی تھی پھر اپنے بیٹے کو ساتھ لیا اور لے آئی۔'' وہ بہت مان بھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔ انہوں نے ابھی بھی حیدر کا سہارا لے رکھا تھا۔ انکے چہرے پر خوشیوں کی سحر طلوع ہو رہی تھی۔

''اور یہ چوٹ کیسے آ گئی اتنے خوبصورت سفر میں۔'' رضا کا لہجہ بھی خوشی سے معمور تھا۔

''اس چوٹ کا کچھ نہ پوچھیے رضا۔ اس چوٹ کا میں نے بڑی شدت سے انتظار کیا ہے۔ اس چوٹ کی راحت کو محسوس کرنے کے لیے تو میں نے پل پل خدا کے حضور سجدے کیے ہیں۔ آپ کو کیا خبر اس چوٹ نے کتنا معتبر کر دیا ہے مجھے۔ کیا کچھ عطا کر دیا ہے مجھے۔'' شیریں خوشی اور محبت سے مغلوب لہجے میں بول رہی تھیں۔ رضا سب کچھ سمجھ رہے تھے ان کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا' انہوں نے بھلا کہاں سوچا تھا کہ تقدیر یوں بھی مہربان ہوگی۔

''آپ۔ آپ یہاں بیٹھ جائیں' زیادہ کھڑا ہونا آپ کے لیے مناسب نہیں۔'' حیدر نے ایک کرسی شیریں کے آگے کر دی۔ وہ شیریں اور رضا کی خوشی اور جذبات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ شیریں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''پپا۔ یہ کھانا کھا لیں تو یہ دوا ان کو دے دیں۔'' حیدر نے دوا رضا کی طرف بڑھائی۔

''کیوں تمہی میں کوئی ملازم ہوں ان کا۔ تمہاری ماں ہے خود دیتے پھرنا دوا' مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔'' رضا نے پیار سے حیدر کو دیکھا تو وہ جی اچھا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

''دیکھا شیریں میں نہ کہتا تھا کہ میرے بچے بہت اچھے ہیں۔ ان کی رگوں میں میرا خون ہے ذرا رہ بھٹک گئے ہیں۔ لوٹ آئیں گے۔ خدایا میں تیرا کس زبان سے شکر ادا کروں۔''

''جی رضا انشاء اللہ اب منزل دور نہیں۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ بچوں کا کوئی قصور نہیں یہ بچے تو۔''

دونوں میاں بیوی خوش آیند باتوں میں مصروف تھے کہ شاہین آ گئی۔

''شیریں تم یہاں بیٹھی ہو اور سارا کا رو رو کر بُرا حال ور ہا ہے وہ صدیقہ کو شدت سے یاد کر رہی ہے تم ذرا اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔''

''اس کا رونا بھی تو بجا ہے بھابھی شادی کے موقع پر بیٹی کو سب سے زیادہ ماں کی ضرورت ہوتی ہے اگر ماں نہ ہو تو صبر ہوتا ہے مگر جیتی جاگتی ماں موجود ہو کر بھی اپنی دُعاؤں کی اوٹ میں بیٹی کو رخصت نہ کرے تو...... خیر آپ ذرا میرا ہاتھ پکڑ لیں میں چلتی ہوں۔'' شیریں دُکھ کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں تو شاہین چونک گئیں۔

''ارے شیریں تمہارے پاؤں کو۔''

''بس بھابھی ذرا چوٹ آ گئی ہے بڑی پیاری چوٹ ہے۔'' وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

''چوٹ اور پیاری۔'' شاہین نے تعجب خیز نگاہوں سے شیریں کو دیکھا۔

''بتاؤں گی بھابھی آپ بھی خوش ہوں گی۔ فی الحال تو سارا کے پاس پہنچا دیں۔'' شیریں سارا کے کمرے میں پہنچی تو لڑکیاں سارا کے اس طرح رونے سے افسردہ بیٹھی تھیں۔

''سارا۔ سارا بیٹی۔'' شیریں نے بڑھ کر سارا کو ساتھ لگا لیا۔

''بھابھی۔ میں۔ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی ممتا اور دعاؤں سے محروم ہوں۔ کیوں بھابھی اللہ نے مجھے ہی ایسی ماں کیوں دی جو میری ماں کہلانے میں سبکی محسوس کرتی تھی۔ بچپن سے آج تک ترستی رہی ہوں ان کی محبت کو۔ سوچا تھا شاید اس وقت وہ آجائیں گی اور......اور......''

سارا رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ خوشیوں کی اس برسات میں اسے ممتا کی تشنگی تڑپا رہی تھی وہ اب تک ماں کی بے حسی برداشت کرتی آئی تھی مگر آج جب وہ ماں باپ کے گھر سے سسرال رخصت ہو رہی تھی تو وہ ماں کے لیے تڑپ تڑپ گئی۔

کتنی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ چپکے سے آجائیں اور ان کے گلے لگ کر ساری زندگی ممتا کی پیاس کو بجھا لے مگر وہ تو بچپن سے ہی پیاسی تھی اور اب بھی ممتا کی آب حیات پیئے بغیر خشک لبوں کے ساتھ پیا دیس سدھار رہی تھی کتنی بے حس عورت اس کی ماں بنا دی گئی تھی جس کو اس کا ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ آج جب وہ زندگی کی ابتداء کر رہی تھی تو ماں کی دُعاؤں کی ہوا تک نصیب نہیں ہو رہی تھی۔

''سارا میری جان میں تمہارے دکھ سمجھ رہی ہوں۔ مگر بیٹے تمہیں تو پہلے سے ہی تیار رہنا چاہیے تھا۔ آپی کو منانے کے لیے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ رضا گئے ضیاء بھائی نے منتیں کیں مگر وہ نہیں مانیں۔ بیٹے ٹھیک ہے ماں کی کمی تو کوئی پوری نہیں کر سکتا مگر سارا ہم لوگوں نے تمہیں کبھی اپنی بیٹیوں سے کم جانا ہے؟ تم میری بیٹی ہو ارم کرن اور ثناء کی طرح ہو۔ نہ رو میری بیٹی میں تمہیں ممتا بھری دعاؤں تلے رخصت کروں گی۔ خدا کرے تم ہمیشہ سکھی رہو۔ سہاگ سلامت رہے۔'' شیریں نے سارا کو ساتھ لگا کر بے شمار دُعائیں دے ڈالیں اور اپنی بیٹی کی تڑپ اور کسک سے بے نیاز صدیقہ انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔

''ہونہہ یہ لوگ سمجھتے ہیں۔ اس طرح مجھے نظر انداز کر کے مجھے نیچا دکھانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' میں نے بھی سارا کو فہیم کے گھر آباد ہونے دیا تو میرا نام بدل کر رکھ دیں۔'' وہ بے چینی سے اندر باہر ٹہل رہی تھیں اور روفی نومی اس بدنصیب عورت کو دیکھ رہے تھے جس نے خود اپنے آشیانے میں آگ لگائی اسے تنکا تنکا کر ڈالا پھر بھی چین نہیں۔ بیٹی کی شادی ماں کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے اور وہ اپنے سارے ارمان نکال دینا چاہتی ہے مگر یہ کیسی ماں تھی کہ نہ اسے بیٹی سے سروکار تھا' نہ اس کی خوشیوں کی پروا تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے ان کو دیکھ کر تو ویسے بھی صدیقہ کا بی پی ہائی ہو جایا کرتا تھا۔

اور ایسے موقع پر وہ اور بھی انگاروں پر لوٹ ہو رہی تھیں ان کو یہ دکھ نہیں تھا کہ سارا کی شادی میں شریک نہیں ہو سکیں بلکہ وہ اس بات پر آگ بگولا تھیں کہ ان کی بات نہیں مانی گئی اور ان کی مرضی کے خلاف فہیم سے شادی کر دی گئی اور سب سے بڑھ کر صغیر احمد کی واپسی اور سارا کا ان کے ہاں چلے جانا اور باپ کے گھر سے بیٹی کی رخصتی تھی۔ اس صغیر احمد کے گھر سے جن سے ان کو شدید نفرت تھی۔

''ایسے لوگوں کا کیا انجام ہوتا ہے بھیا جو صرف نفرت ہی بوتے ہیں۔'' روفی نے نومی کو دیکھا۔

''ظاہر ہے جب نفرت کی فصل تیار ہو جاتی ہے تو نفرت بونے والا اسی میں جکڑ کر اپنا آپ ختم کر دیتا ہے۔'' نومی نے ایک گہری سانس کے ساتھ کہا اور کتاب لے کر بیٹھ گیا۔

''نومی بھیا۔ سب لوگ کتنا انجوائے کر رہے ہوں گے میرا کتنا دل چاہ رہا تھا جانے کو مگر۔'' روفی افسردگی سے کہہ رہا تھا۔ واقعی اس کا بہت دل چاہ رہا تھا شادی پر جانے کو مگر صدیقہ بیگم کی طرف سے اتنی سخت پابندی تھی کہ وہ لوگ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

''زندگی کی ایسی خوشیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں روفی مت خواب دیکھا کرو ایسے' تعبیر نہ ملے تو انسان ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے' جیسے۔ جیسے'' نومی شکستہ لہجے میں کچھ کہتے کہتے رک گیا اور پھر ورق گردانی کرنے لگا۔

ادھر رخصتی کی گھڑیاں آ گئی تھیں ہنستا مسکراتا ماحول افسردہ ہو گیا۔ صغیر احمد بہت نڈھال ہو رہے تھے۔ سارا کو ساتھ لگا کر وہ شدت سے رو دیے۔

''میری بیٹی مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔ مجھ سا بدنصیب کوئی شخص ہوگا۔ ایک عرصے تک بیٹی کی جدائی میں تڑپتا رہا۔ بیٹی ملی تو پھر جدا ہونے کے لیے۔''

''صغیر کیا بچوں والی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارا سارا کو مل جانا ہی سب کچھ ہے یہ بے چاری تو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن ماں باپ کے رہی ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ خود اپنے ہاتھوں سے بیٹی کو اس کے گھر سے رخصت کر رہے ہو' ایک وہ بدنصیب ہے کہ اس نے ہر خوشی کو خود پر حرام کر رکھا ہے۔'' سارا کی شادی میں صدیقہ کے نہ آنے کا سب کو بہت دکھ تھا مگر ضیاء کو بہت زیادہ دکھ تھا۔ ماحول خاصا سوگوار ہو گیا تھا ایسے میں حیدر چپکے سے سارا اور فہیم کے پاس کھسک آیا۔

''سارا پھپھو بند کریں یہ مگرمچھ کے آنسو' دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں کہ آخاہ جی فہیم کی دلہن بنی ہوں اوپر سے۔'' وہ کچھ اس طرح بولا کہ ایسی سچویشن میں بھی سارا کو شرم کے ساتھ ہنسی بھی آ گئی۔ اس کا سر مزید جھک گیا۔

''ویسے تو میرے خیال میں فہیم آپ کو رونا چاہیے۔ اس لیے کہ آپ کی آزادی سلب ہو گئی ہے۔ اب تو آپ ادھر ادھر تاک جھانک بھی نہیں سکتے۔'' اس کی بات پر فہیم نے اس کو مارنا چاہا تو حیدر نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیا غضب کرتے ہیں فہیم بھائی دولہا اگر ایسی حرکت کرے تو لوگ اسے چھچھورا یا پاگل سمجھتے ہیں۔ اگر آپ۔''

''تم سے تو بیٹا گھر جا کر نمٹوں گا۔'' فہیم نے دانت پیس کر کہا۔

پھر سارا ماں کی محبتوں اور دعاؤں کو ترستی باپ کے اشکوں کی برسات میں بابل کا آنگن چھوڑ کر۔ پھر اسی جنت میں آ گئی جہاں اس نے اتنی زندگی گزاری تھی جہاں والدین کی محبت تو نہیں البتہ ماموں ممانیوں کی چاہت کے گلاب ضرور چنے تھے اس نے' آج ہمیشہ کے لیے اسی آنگن میں اتر آئی۔ دلہن کے گھر آتے ہی پھر خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ فہیم اور سارا شوخ جملوں کی زد میں گھرے بیٹھے تھے اور خواتین دیگر رسومات ادا کر رہی تھیں فیاض علی جواب تک الجھے ہوئے بیٹھے تھے اور خاصی بوریت محسوس کر رہے تھے۔ وہ اس بار تین سال کے بعد آئے تھے اور ظاہر ہے ایسے میں انسان سب سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ سیدھے ادھر ہی آ گئے تھے مگر یہاں ان کو نہ پا کر انہیں خاصی مایوسی ہوئی تھی۔

''جی اچھا۔ اب تو اجازت ہے۔ بہت بہت مبارک ہو آپ لوگوں کو۔'' فیاض علی اٹھ

کھڑے ہوئے۔

''رُکیے فیاض بھائی۔ میں کسی لڑکے کو بھیجتا ہوں آپ کو گھر چھوڑ آئے۔ رات کافی ہو گئی ہے۔'' رضا یہ کہتے ہوئے اٹھ کر اندر آ گئے۔ جہاں سب ہنسی خوشی مذاق میں مصروف تھے۔ رضا نے باری باری سب پر نگاہ ڈالی کہ کس کو بھیجوں مگر حیدر پر ہی نگاہ ٹھہری کیونکہ وہ جانتے تھے صرف حیدر ہی واحد لڑکا ہے جو صدیقہ کو بھاتا ہے ورنہ تو اس گھر کے کسی فرد سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

''سارا پھپھو اب اتنا بھی کیا شرمانا۔ تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔ ٹھیک ہے فہیم بھائی خوفناک لگ رہے ہیں مگر اب اتنے بھی نہیں کہ آپ آنکھیں بند رکھیں۔ ہاں شینا ذرا سا پھپھو کا دوپٹہ پیچھے سرکا دو اور جھومر بھی درست کر دو۔ ہاں بس اب ٹھیک ہے ریڈی۔''

اس سے قبل کہ وہ کیمرے کی آنکھ میں اس حسین منظر کو قید کرتا رضا نے آواز دے دی۔

''حیدر۔''

''جی پپا۔'' وہ کیمرہ لیے رضا کی طرف آ گیا۔

''بیٹا وہ انکل فیاض کو چھوڑ آؤ پھپھو کے گھر۔''

''پپا پلیز آپ کسی اور کو کہہ دیں ناں۔ میں اس یادگار موقع کی تصویریں بنا رہا ہوں۔'' اس وقت اس کا کہیں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''بھئی تصویریں کوئی بھی لڑکا بنا لے گا۔''

''یہی تو رونا ہے پپا۔ ان جاہلوں کو تو کیمرہ پکڑنا ہی نہیں آتا صرف ایک میں ہوں جو اس میدان کا کھلاڑی ہوں۔ وہ بھی نمبر ون۔'' وہ اتراتا ہوا بولا تو رضا کو بہت اچھا لگا اس وقت۔

''اچھا یاسر' ایاز بیٹے تم دونوں جاؤ انکل کو چھوڑ آؤ۔'' اب رضا نے یاسر اور ایاز کو کہا۔

''ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں چچا جان۔ مگر ہمارے والدین سے پوچھ لیں واپسی پر ہمارا قیمہ ہی آئے گا۔'' یاسر نے یہ بات کی تو مذاق میں کہی تھی مگر رضا کے دل پر چوٹ پڑی تھی کہ صدیقہ بیگم سے نفرت کی کتنی بڑی اور مضبوط فصیلیں اپنے اردگرد کھڑی کر لی تھیں۔

''ٹھیک ہے حیدر تم ہی جاؤ یاسر درست کہہ رہا ہے آپی ان لوگوں کا آنا جانا پسند بھی تو نہیں کرتیں۔'' رضا یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ حیدر یاسر کو گھورنے لگا۔

''یاسر ایک تصویر بھی خراب ہوئی تو زمین میں گاڑ دوں گا۔'' حیدر کیمرہ یاسر کے ہاتھ میں دیتا ہوا بولا اور گاڑی کی چابیاں لیتا باہر پورچ میں آ گیا۔

''حیدر چچا جان کہہ رہے ہیں رات زیادہ ہو گی ہے واپس مت آنا۔ صبح آ جانا۔'' ایاز نے اوپر سے شرارت میں ہانک لگائی کیونکہ آج رات ان کے بہت سے پروگرام تھے اور سب کا

روحِ رواں حیدر ہی تھا۔

''بکومت۔ ابھی آ کر بتاتا ہوں تمہیں کہ۔''

پھر وہ انکل فیاض کو آتا دیکھ کر چپ ہوگیا۔ رات کے ساڑھے بارہ کا وقت تھا۔ صدیقہ اپنی ہی آگ میں سلگ رہی تھیں۔ روفی نومی اپنے کمرے میں تھے۔ نومی تو کتاب پڑھ رہا تھا مگر روفی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سیدھا لیٹا مسلسل شادی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ سب کو کتنا مزہ آ رہا ہوگا۔ کتنا انجوائے کر رہے ہوں گے سب۔ ایک ہم ہیں کہ ظالم جادوگرنی کی قید میں بے بس پڑے ہیں۔ اپنی اس گستاخانہ سوچ پر اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں نسی نے سن تو نہیں لیا۔ کسی نے اس کی سوچ کو پڑھ تو نہیں لیا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو پھر اسے سنگسار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

وہ اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ کال بیل کی آواز پر دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اس وقت ہمارے گھر میں کون آ سکتا ہے؟'' نومی گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''رکیے۔ بھیا میں بھی چلتا ہوں جانے کون ہے۔'' روفی بھی ساتھ آ گیا۔

''حیدر تم اس وقت۔ ابو۔ ابو آپ۔'' حیدر کے پیچھے فیاض علی کو دیکھ کر روفی بچوں کی مانند ان سے لپٹ گیا۔ بے شمار آنسو ان کے کالر میں جذب ہوگئے۔

''پیچھے ہٹو یار۔ اب مجھے بھی ذرا ٹھنڈی چھاؤں میں آنے دو۔ پاؤں جھلس گئے ہیں۔ تپتے صحرا میں چلتے چلتے۔'' روفی کو ہٹا کر نومی ابو سے بغل گیر ہوگیا۔ فیاض علی وارفتگی سے دونوں کو پیار کر رہے تھے۔ حیدر خاموش کھڑا بچھڑے ہوؤں کا۔ ملاپ دیکھ رہا تھا۔

''ابو آپ یوں اچانک آ گئے اطلاع کیوں نہیں دی؟ اطلاع دے دیتے تو زندگی کی تلخی کم ہو جاتی۔ آپ کے آنے کے تصور سے۔'' روفی دوبارہ ان سے لپٹ گیا۔

''بھئی بتاتا ہوں۔ سب بتاتا ہوں۔ یہ تم لوگوں کی ماں کہاں ہے۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے یوں پوچھ رہے تھے گویا وہ واقعی ان کی ماں ہو۔

''ارے آپ۔ آپ کیسے آ گئے؟'' صدیقہ جو شور سن کر آ گئی تھیں۔ فیاض علی کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''صدیقہ بیگم اس بار تو جملے میں کچھ ترمیم کر لیتیں میں جب سے باہر گیا ہوں۔ جب بھی آتا ہوں سلام دُعا سے قبل تمہارا یہ ہی جملہ سننے کو ملتا ہے ارے آپ کیسے آ گئے۔ بھئی ظاہر ہے جہاز سے آیا ہوں اور تمہارے بھتیجے کی شادی میں شریک ہو کر آ رہا ہوں سناؤ کیا حال چال ہیں۔؟'' صدیقہ بیگم ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرہ لیے کھڑی تھی یوں جیسے ان کو شوہر کے آنے کی نہ کوئی خوشی ہے اور نہ کوئی سروکار۔

''آداب پھپھو۔'' حیدر نے آگے بڑھ کر آداب کیا تو اس کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح پھپھو۔ اس کی پیشانی چوم کر پیار کریں گی۔۔ ساتھ لگائیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا اور منہ موڑ کر آگے بڑھ گئیں۔

''پھپھو یہ میں ہوں حیدر۔'' حیدر نے آگے بڑھ کر گویا ان کو یاد دلایا کہ میں حیدر ہوں۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں اندھی ہوں یا پاگل ہوں جو تمہیں نہیں پہچان رہی۔'' آج پہلی بار ان کی زبان سے حیدر کے لیے شعلے نکلے تھے وہ جل جل گیا ان شعلوں میں۔

''پھر پھپھو۔''

''پھر یہ کہ میرے گھر سے چلے جاؤ۔'' وہ چیخ پڑیں ان کو کچھ خیال نہیں تھا کہ ان کا شوہر ایک عرصے کے بعد گھر آیا ہے اس کو دیکھنا ہے' پوچھنا ہے۔ حیدر کا دل بری طرح مجروح ہوا تھا۔ اسے شدت سے رونا آ رہا تھا۔ اس پھپھو نے اسے یوں دھتکارا تھا جو کبھی اس کے لیے جان بھی دینے کو تیار تھیں۔ آج یوں نفرت سے دیکھ کر گھر سے نکال رہی تھیں۔

''صدیقہ یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ اگر تمہارے اختلافات ہیں تو اپنے بہن بھائیوں سے۔ ان میں ان بچوں کا کیا قصور ہے۔'' اور حیدر تو ہے بھی تمہارا بیٹا۔'' فیاض علی کو صدیقہ کا حیدر کے ساتھ یہ رویہ پسند نہیں آیا تھا۔

''ہے نہیں تھا۔'' صدیقہ بیگم کسی بات کا خیال کیے بغیر کٹیلے لہجے میں بولیں۔'' حیدر کے لیے اب وہاں رکنا محال تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے واپس پلٹا۔

''حیدر یار ہمیں معاف کر دینا۔ کیا ستم ہے کہ ہم تمہیں اپنے گھر میں روکنے کے مجاز بھی نہیں مجھے احساس ہے کہ امی کے رویے سے اس وقت تمہارے کیا احساسات ہیں تمہارے لیے یہ پہلی چوٹ ہے۔ اس لیے کافی اذیت محسوس کرو گے گاڑی دھیان سے چلانا۔'' نومی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ دکھی نگاہوں سے نومی کو دیکھتا ہوا گاڑی اڑاتا لے آیا۔

تمام راستہ وہ کھولتا رہا آج خود کو چوٹ لگی تو اسے ہر کسی کے درد کی شدت کا احساس ہونے لگا آج اس کا مان اعتماد مجروح کر دیا تھا پھپھو نے۔ گھر میں اتنی رات گزرنے کے باوجود ہنگامے عروج پر تھے۔ مگر اب اس کا دل نہیں چاہا کسی بات میں شریک ہونے کو۔ وہ آہستگی سے پچھلے دروازے سے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ دل ایسا ٹوٹا کہ سارے جوش ولولے دم توڑ گئے اور وہ لوگ جو اس کے منتظر تھے بار بار اسکا انتظار کر رہے تھے' رضا بھی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کسی کو اپنی آمد کی خبر کیے بغیر کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ وہ اتنا اپ سیٹ تھا کہ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کس کے کمرے میں لیٹ رہا ہے۔ لائٹ آف کیے وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ دل بری طرح بوجھل تھا وہ خاموش لیٹا رہنا چاہتا تھا کہ اچانک لائٹ آن ہوگی۔

''ارے حیدر بیٹے تم کب آئے۔ خیریت تو ہے ناں۔ بیٹے پپا پریشان ہو رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟ کیوں یوں اداس لیٹے ہو'' شیریں کی نرم آواز حیدر کو اس وقت تپتے صحرا میں برسات کی پہلی نرم ٹھنڈی پھوار لگی۔ وہ ایک عورت جو اس کی پھپھو تھی' وہ اس کی نفرت میں جلتا ہوا آیا تھا مگر دوسری عورت جو اس کی سوتیلی ماں تھی' اس کی محبت نے پرسکون سا کر دیا۔

''حیدر کیا بات ہے بیٹا۔'' شیریں پہلے بھی ہر ناکامی کے بعد آگے بڑھتی رہتی تھیں اور اب تو حیدر کے گزشتہ رویے سے کافی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔

''جی کچھ نہیں بس ذرا سر میں درد ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''لاؤ میں دبا دوں۔'' شیریں آگے بڑھیں۔

''جی نہیں شکریہ اب اتنا بھی نہیں۔ بس ذرا خاموش لیٹنا چاہتا ہوں۔'' وہ نگاہیں جھکائے بول رہا تھا۔

''اچھا بیٹا' تم آرام کرو میں تمہارے پپا کو بتا دیتی ہوں کہ تم آ گئے ہو۔'' شیریں نرمی سے بولتی باہر نکل گئیں۔ حیدر کے آنے کی اطلاع پا کر سب اس کے کمرے میں بھاگے مگر اس نے کسی بھی پروگرام میں شریک ہونے سے سختی سے منع کر دیا۔

''یہ تمہیں ہوا کیا ہے۔ اچھے خاصے گئے تھے۔'' ایاز نے اٹھانے کی کوشش کی۔

''اپنی پھپھو کے ہاں سے ہو کر آ رہا ہے تو۔'' یاسر نے معنی خیزی سے سب کو دیکھا۔

''میں کہتا ہوں چلے جاؤ تم سب۔ تنہا چھوڑ دو مجھے۔'' حیدر نے ہاتھوں میں بال پکڑ کر چیخ کر کہا تو سب ڈر گئے اور باہر نکل گئے۔

وہ سب چلے گئے تو حیدر بے دم سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسا ہمدرد مونس آئے کہ وہ اپنا سارا درد اسے دے دے یا کوئی اس کے ساتھ اس اذیت کو شیر کرے۔ وہ یونہی لیٹا رہا۔ اسے لگ رہا تھا گویا سارا بدن آگ میں جل رہا ہو۔ کتنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔ پھپھو کے رویے پر کتنی حقارت سے انہوں نے اسے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا اسے۔ یعنی حیدر کو۔ اف۔

''بھیا میں آ جاؤں۔'' اس نے مندی آنکھوں سے دیکھا ثنا اجازت مانگ رہی تھی۔

''آؤ ثنا اس وقت مجھے ایسے ہی لطیف جھونکے کی ضرورت ہے۔''

''آپ کا سر دبا دوں بھیا چائے بنا لاؤں یا کوئی ٹیبلٹ لے آؤں۔'' اس نے آتے ہی ہر قسم کی خدمات پیش کر دیں تو حیدر مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ کتنی معصوم اور سادہ تھی یہ لڑکی اور۔ اور پھپھو تو اس کے متعلق جانے کیا کیا کہا کرتی تھیں۔ بھلا کلیوں سے زیادہ معصوم اور نرم اور بادِ صبا سے زیادہ لطیف محبتوں کے امرت میں ڈوبی یہ لڑکی ان کی دشمن ہو سکتی تھی۔

''بھیا جان کیا بات ہے بتائیں نا؟ ثنا نے اس کا ہاتھ ہلایا تو وہ چونک گیا۔

''ہوں۔ کچھ نہیں تم جاؤ ایک چائے لے آؤ اور پھر دونوں بہن بھائی باتیں کریں گے ٹھیک ہے ناں۔''

''جی اچھا۔'' ثناء بے پناہ خوشی کے جھولے میں جھولتی چائے بنانے چل دی۔ حیدر بھی اب خود کو پرسکون محسوس کرنے لگا۔

فیاض علی اتنے عرصے بعد گھر آئے تھے۔ آج وہ صرف اپنی باتیں کرنا چاہتے تھے اور بچوں کی سننا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ روفی' نومی کو پاس بٹھائے باتیں کر رہے تھے۔

''روفی بیٹے تم بہت کمزور لگ رہے ہو' تمہاری صحت بہت خراب لگ رہی ہے' بیمار رہے ہو۔'' انہوں نے تشویش سے روفی کو دیکھا۔

''کچھ نہیں ابو ذرا بیمار ہو گیا تھا۔''

ذرا بیمار ہو گئے تھے۔ اتنے کمزور ہو اور مجھے اطلاع تک نہیں دی گئی۔'' فیاض علی ایک دم پریشان ہو گئے۔

''کوئی خاص بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی کہ آپ کو اطلاع دی جاتی۔ معمولی بخار تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی آرام آ گیا' صدیقہ کی بات پر روفی نومی ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ فیاض علی کو بھی بات کا یہ انداز بُرا لگا تھا مگر انہوں نے اگنور کر دیا۔

''صدیقہ بیگم چائے نہیں ملے گی۔ بھئی آج تو مہمان ہیں ہم'' فیاض علی نے بہانے سے ان کو بھیجا۔ وہ بیٹوں سے کھل کر باتیں کرنا چاہتے تھے۔

''اور نومی بیٹے تمہاری جاب ٹھیک جا رہی ہے ناں۔ مطمئن ہو۔''

''جی ابو میں اپنی زندگی سے بے حد مطمئن ہوں اس قدر کہ۔'' نومی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کتنا جی چاہ رہا تھا ابو کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیں اور وہ خود ہی ان کے ایک ایک زخم کو دیکھ کر اس کی شدت کا اندازہ لگا لیں۔ کیونکہ اس کی زبان میں تو وہ اثر نہیں تھا جس سے وہ اپنے زخموں کی شدت کا اظہار کرتے اور اگر انسان اپنے درد کی شدت کو لفظوں میں نہ ڈھال سکے تو اسے خاموش ہی رہنا چاہیے۔

شادی کے ہنگامے ختم ہو چکے تھے۔ سارا اس بار اب ایک نئی حیثیت سے شرمائی شرمائی سی پھرتی۔ حیدر وغیرہ اسے بھابھی کہہ کر چھیڑا کرتے۔ شادی کے بعد سے صدیقہ ایک بار بھی نہیں آئی تھیں۔ کتنا دل چاہتا تھا سارا کا کہ وہ آئیں کتنے عرصے سے ان کو نہیں دیکھا تھا دل میں ایک آگ سی لگی تھی۔ کچھ بھی تھا' وہ اس کی ماں تھیں۔ اس کے کان لاشعوری طور پر ان کے منتظر تھے۔

''اگر وہ نہیں آئیں تو تم ان کے ہاں ہو آؤ۔ سارا وہ ماں ہیں تمہاری۔ کیوں ان سے مقابلہ کرتی ہو۔ کہو تو آج شام کو لے چلوں۔'' فہیم ٹائی کی گرہ لگاتے بولے۔

"نہیں فہیم میں کس رشتے سے کس ناتے سے ان کے ہاں جاؤں جب وہ میرے رشتے کو تسلیم ہی نہیں کرتیں تو میں کس حیثیت سے ان سے ملنے جاؤں۔ بس خون کے باعث اک تڑپ سی ہوتی رہتی ہے اور آپ کو تو وہ ویسے ہی بہت ناپسند کرتی ہیں۔" سارا افسردگی سے بولی۔ جب سے فیاض علی آئے تھے ضیاء کو دھڑکا لگا رہتا کہ اب سارا کی حقیقت بتانا پڑے گی۔ خدا جانے کیا ہنگامہ ہو۔

"میرا خیال تو یہ ہی تھا کہ فیاض علی کو نکاح کے وقت ہی بتا دیا جائے۔ سارا صدیقہ کی بیٹی ہے۔ اب فیاض جانے کیا ہنگامہ کھڑا کرے اور ظاہر ہے بتانا تو اسے پڑے گا ہی۔"

"بھائی جان یہ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں چھپانے والی کیا بات تھی۔ بتا دیا جاتا سیدھا سیدھا تو آج حالات نہ ہوتے۔ اب نجانے فیاض بھائی۔" شیریں بھی متفکر انداز میں بولیں۔

"ٹھیک ہے بتا دینا چاہیے تھا مگر میرے خیال میں فیاض بھائی کو کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ سارا ان کی نہیں ہماری ذمہ داری تھی اور ہم نے پوری کر دی۔ اب تو یہ مسئلہ اٹھانا بھی بچگانہ بات ہوگی۔"

"نہیں رضا اصولی طور پر ہم نے غلطی کی ہے خیر دیکھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے۔" ضیاء ٹوپی اٹھا کر نماز کے لیے اٹھ گئے۔

♥ ♥ ♥

شفق شیریں کی بھانجی تھی خود اپنے والدین کی آنکھ کا تارا دل کا سکون تھی مگر خالہ سے اتنی محبت تھی کہ باقی سب کی محبتیں پیچھے رہ گئی شیریں جب بیاہ کر رضا کے ساتھ جا رہی تھیں تو شفق نے زمین آسمان ایک کر دیا مجبوراً اس کے والدین کو اسے شیریں کی گود میں ڈالنا پڑا یوں وہ شیریں کے ساتھ ہی رخصت ہو کر آ گئی یہاں بھی رضا نے تو پدرانہ شفقت دی ہی تھی باقی سب نے بھی اسے بہت پیار اور محبت دی سوائے صدیقہ بیگم کے اور حیدر کے۔ کرلی بالوں والی گول مٹول سی گڑیا جب اس گھر کے بچوں کی کھیپ میں شامل ہوئی تھی تو حیدر کو بھی بہت اچھی لگی تھی اس نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو صدیقہ بیگم نے کمسنی ہی میں شفق اور شیریں سے نفرت کا پیالہ حیدر کے لبوں کو لگا دیا تھا شفق نے خالہ کی محبت میں آتے جاتے موسموں کی سختیاں برداشت کی تھیں صدیقہ اور حیدر کی نفرت کی کڑکڑاتی دھوپ بھی برداشت کی تھی اور باقی سب کی محبتیں بھی سمیٹی تھیں وہ خالہ کی طرح نفرت کو بھلا دیتی تھی سب کی محبتوں کی خوب قدر کرتی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ سارا اور فہیم کے اسرار پر وہ ان کی شادی کے لیے رک گئی تھی۔ اب وہ اپنے گھر لوٹ کر جا رہی تھی تو گھر بھر اداس تھا کیا بڑے کیا چھوٹے سب کے

سب یوں افسردہ تھے گویا پھر کبھی ملنا نہ ہوگا۔

"شفق نہ جاؤ پلیز۔" .... ارم، ثناء باقاعدہ رو رہی تھیں شفق بھی سسک پڑی۔

"ارے جانے دو جانے دو......... امیر باپ کی بیٹی مل اونر کی ہے تب ہی تو اترا رہی ہے ارے اتنی اتراہٹ تھی تو آئیں کیوں تھیں ہمارے غریبوں کے گھر۔"

وہ جانتی تھی یاسر کو جب بھی اس پر شدید غصہ آتا اسے امیر باپ کی بگڑی بیٹی کہہ کر بھڑاس نکالتا "تو بچپن میں مجھے کب معلوم تھا کہ تم لوگ غریب ہو اور میں مل اونر کی بیٹی...... شرم تو نہیں آتی یاسر تمہیں ایسی باتیں کرتے...... ہوئے روکنے کی بجائے فضول بول رہے ہو۔" ...... وہ خفا ہوگئی۔

"ارے میرے پاس تمہیں روکنے کا حق نہیں ہے جسے ہے وہ تو منہ میں کچھ دبائے بیٹھا ہے...... حیدر بولو روکو اسے روک کیوں نہیں رہے شفق کو جانے سے۔"

یاسر نے ایک طرف خاموش کھڑے حیدر کو دیکھا جس کے دل کی عجیب سے کیفیت تھی جہاں یہ احساس شاید پہلی بار ابھرا تھا کہ یہ لڑکی زندگی کے لیے کتنی ضروری ہے اگر چلی گئی تو کچھ باقی نہیں بچے گا۔

"میں اس لیے چپ ہوں کیونکہ مجھے اپنے لفظوں کا بھرم بہت عزیز ہے۔" ...... وہ سنجیدگی سے بولتا ہوا مڑا تو اس کی اس لاتعلقی پر شفق کھول گئی۔

"شاید زندگی میں پہلی بار آپ کو اپنے لفظوں کی حرمت کا احساس ہوا ہے گڈ یہ تو طے ہے کہ آپ روکتے بھی تو کب مجھے رک جانا تھا۔" ...... خلق میں آنسوؤں کا گولا پھنس گیا۔

"ارے بھئی بچو اداس کیوں ہوتے ہو شفق تو بچپن ہی میں رخصت ہو کر آ گئی تھی ابھی اسے جانے دو ہم پھر اسے لے آئیں گے رخصت کرا کر پھر یہ کہیں نہیں جائے گی۔" ....

شاہین بیگم نے بمشکل اپنے آنسو روکتے ہوئے شفق کو ساتھ لگا کر پیار کیا یوں سارا بچپن یہاں گزار کر شفق اپنے والدین کے پاس لوٹ گئی تو گھر جیسے ویران ہو گیا حیدر نے غصے میں اپنے کمرے کا حلیہ بگاڑ دیا۔

"جانا تھا تو آئیں کیوں تھیں تم میری زندگی میں۔" ...... پھر وہ یاسر کے گلے لگ گیا۔

اس روز سارا اور فہیم شاپنگ کر کے لوٹ رہے تھے کہ ایک دوکان پر سارا کی نگاہیں ٹھہر گئیں صدیقہ اور فیاض علی کھڑے کپڑا دیکھ رہے تھے اتنے دنوں بعد دیکھا تھا سارا کا جی چاہا کہ بھاگ کر ان سے لپٹ جائے وہ بیٹی کہہ کر ساتھ لگائیں تو یہ اتنی شدتوں سے روئے کہ ہر محرومی کا احساس مٹ جائے مگر ایسا کہاں ممکن تھا انہوں نے اس کو بیٹی کہنا ہوتا تو اسے خود سے کاٹ کر الگ نہ کر دیتیں سارے ارمان ساری خواہش صدیقہ کی بے حسی کے سرد خانے میں دفن ہو گئیں۔ آنکھوں کے سامنے ہر منظر دھندلانے لگا اس نے فہیم کی نظر بچا کر آنکھیں رگڑ

ڈالیں۔

''ارے سارا وہ دیکھو۔ پھپھو اور انکل آؤ ان سے ملیں۔'' فہیم نے کہا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ کیونکہ اندر کہیں خود ان سے ملنے کی شدید خواہش مچل رہی تھی۔

''آداب پھپھو۔'' فہیم نے تیزی سے چلتی صدیقہ کو سلام کیا تو انہوں نے جواب دینے کی بجائے منہ موڑ لیا۔ تو سارا کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ سلام کرے۔ البتہ فیاض علی بڑے تپاک سے ملے۔

''کیسی ہو سارا بیٹی۔'' انہوں نے سارا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' آنسوؤں کا گولا سارا کے حلق میں اٹک گیا۔

''فہیم میاں بھئی ہم بھی تو تم لوگوں کے کچھ لگتے ہیں شادی کے بعد تم لوگوں نے ایک چکر بھی نہیں لگایا۔ چلو آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا کیوں صدیقہ؟'' فیاض علی نے صدیقہ کو دیکھا جو بڑی مشکل سے غصہ ضبط کیے کھڑی تھیں۔

''آپ کی مرضی ہے میری تو طبیعت خراب ہے کسی ہوٹل میں دے دیں دعوت۔'' صدیقہ کی بات سارا کا جگر کاٹتی گزر گئی۔ یہ ماں ہے ایسی ہوتی ہیں بھلا مائیں۔ اولاد کو اپنے ہاتھوں سے موت دینے والی ان کی رگوں کو کاٹنے والی۔

''فہیم پلیز۔ چلیں میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' وہ بمشکل ضبط کرتی ہوئی بولی۔

''فہیم بیٹے سارا کی غالباً طبیعت خراب ہو رہی ہے جاؤ۔ میں آؤں گا گھر دعوت دینے۔'' فیاض علی بیوی کے اس رویے کے پیچھے چھپے راز اور سارا کی طبیعت کو سمجھے بغیر بولے۔ وہ قطعی نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ صدیقہ نے ایسا رویہ کیوں اختیار کر رکھا ہے ان کو تو بس یہ معلوم تھا کہ صدیقہ کی اپنے بھائیوں سے ان بن ہے تو اس میں ان کے بچوں کا کیا قصور تھا۔ مگر وہ اپنا فلسفہ ان کو نہیں سمجھا سکتے تھے فہیم ان سے معذرت کرتا ہوا سارا کو لیے گھر آ گیا۔

''صدیقہ میں تمہارے رویے کو قطعی نہیں سمجھ پایا کہ تم نے سارا اور فہیم کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' گھر آ کر فیاض علی پھر صدیقہ سے بولے۔

''کیوں کیا گولی مار دی تھی میں نے سارا اور فہیم کو۔ بس میرا دل نہیں چاہا۔ تھا ان سے بات کرنے کو تو نہیں کی اس میں اور کیا برائی ہے۔'' صدیقہ کچھ ایسے انداز میں بولیں کہ فیاض علی کو دوسری بات کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ویسے بھی ان کے بھائیوں کا معاملہ تھا۔ وہ دخل دینا نہیں چاہتے تھے۔

''اچھا موڈ تو درست کرو یہ بتاؤ تم نے بھی کوئی بہو دیکھی ہے کہ نہیں۔ نومی ماشاء اللہ اب اس قابل ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے تم اپنے بھائیوں کی کوئی لڑکی دیکھ لو۔ سب ہی اچھی بچیاں ہیں۔'' فیاض علی ایسے مشورہ دے رہے تھے جیسے وہ بڑے خوشگوار موڈ میں ہیں اور اس

موضوع پر بول کر ان کو راحت ملے گی۔

''آپ کا بیٹا ہے آپ خود تلاش کریں۔ رہا میرے بھائیوں کا سوال تو میں ان کا نام بھی لینا پسند نہیں کرتی۔ آپ جہاں چاہیں اپنے بیٹے کی شادی کر دیں۔ مجھے کیا۔'' وہ اسی طرح لاتعلقی اور اکھڑ پن سے بولیں کہ فیاض علی کو شدید غصہ آ گیا۔ مگر وہ اب اس عمر میں جھگڑا کرنا پسند نہیں کرتے تھے جبکہ گھر میں دو جوان لڑکے تھے۔

''کیوں تمہارا نومی سے کوئی تعلق نہیں کوئی رشتہ نہیں۔'' انہوں نے کڑی نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

''سوتیلی ماں سوتیلی ہی رہتی ہے خواہ جان بھی دے دے۔''

''یہ صرف تمہارا نظریہ ہے ورنہ عورت چاہے تو سگے سوتیلے کا تصور ہی ختم کر سکتی ہے۔''

''جی ہاں میں تو ساری دنیا سے بُری ہوں۔'' اس سے قبل کہ بات مزید بڑھتی۔ فیاض علی اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جب سے وہ صدیقہ بیگم کو بیاہ کر لائے تھے ان کا مزاج ایسا ہی تھا۔ جانے کیوں وہ نہ خود خوش رہتیں اور نہ دوسروں کو ہونے دیتی تھیں۔

اس روز صدیقہ کا موڈ قدرے بحال تھا۔ اس روز انہوں نے پہلی بار چائے بنائی اور خود نومی اور روفی کو دی تو انہوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ فیاض علی بھی خوش تھے کہ چلو موڈ تو درست ہوا۔ اس لیے خوشگوار لہجے میں بولے۔

''بھئی صدیقہ میں تو سارا کو آج تک تم لوگوں کی سگی بہن ہی سمجھتا رہا گو کہ عمروں میں اتنے تفاوت کی وجہ سے بھی گمان ضرور گزرتا تھا مگر شادی پر تو پتا چلا کہ۔''

''کہ سارا میری بیٹی ہے۔'' ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے صدیقہ بیگم نے دھما کا کر دیا وہ ان کو ایسے دیکھنے لگے گویا صدیقہ کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔

''سارا تمہاری بیٹی۔'' فیاض علی نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے سارا میری بیٹی ہے میں نے ابا جی کو دے دی تھی یہ بھی تو بتایا ہوگا ناں میرے بھائیوں نے۔'' وہ خود ہی سارے راز اگلتی چلی گئیں۔

''انہوں نے تو کچھ اور ہی بتایا تھا جو کہ غلط تھا اور اگر یہ حقیقت ہے کہ سارا تمہاری بیٹی ہے تو یہ بات آج تک مجھ سے کیوں راز رکھی گئی ہے۔ مجھے کیوں لاعلم رکھا گیا۔ اس حقیقت سے کیا سوچ کر تمہارے بھائیوں نے یہ حرکت کی ہے میرے ساتھ۔''

آج اس نئی حقیقت کو جان کر فیاض علی کا طیش میں آ جانا فطری بات تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ آپ ان سے پوچھیں کہ کیوں چھپائی گئی یہ حقیقت آپ سے۔'' صدیقہ بیگم بجائے

نادم ہونے یا دینے کے اسی طرح تنی رہیں۔

''ان سے تو میں پوچھ ہی لوں گا مگر تم۔ تم نے کیوں چھپائی یہ بات مجھ سے۔ مجھے کم ظرف سمجھا تھا یا خود کو اس قابل نہیں سمجھتی تھیں کس قسم کی ماں ہو تم کہ نہ تو بیٹی کی شادی میں شرکت کی اور نہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔''

فیاض علی کو شدید صدمہ پہنچا تھا اس بات سے۔

''سارا میری بیٹی ہے یا نہیں آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس کا آپ پر بوجھ نہ پڑے۔ اسی لیے ابا جی نے اسے لے لیا تھا۔ وہ آپ کی ذمہ داری نہیں تھی کہ آپ کو اس کی فکر ہوتی۔ اب کیوں آپ کو طیش آ رہا ہے اب تو اس کی شادی ہو چکی ہے۔ جن کی ذمہ داری تھی انہوں نے نبھا دی آپ بے فکر رہیں۔''

''تم سے تو بات کرنا بالکل فضول ہے چلو روفی گاڑی نکالو۔'' فیاض علی اسی طرح غصے میں بھرے ادھر آ گئے ان کے تیور دیکھ کر ضیاء' رضا کے ساتھ سب گھر والے دہل گئے۔ ضیاء کو تو اپنا اندیشہ درست ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''فیاض علی کیا بات ہے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو۔''

''ضیاء بھائی میں آپ لوگوں کو اس طرح تو نہیں سمجھتا تھا کہ آپ مجھے خوار کریں گے میری ہی نظروں میں گرا دیں مجھے۔'' فیاض علی بہت غصے میں تھے۔

''فیاض بھائی آپ بیٹھے تو سہی' ہمارا قصور تو بتائیں۔ کیا خطا ہوئی ہے؟'' رضا نے غصے سے بھرے فیاض علی کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ آپ لوگ حقیقت کو یوں مجھ سے چھپائیں گے۔''

''کون سی حقیقت فیاض۔''

''یہ ہی کہ سارا صدیقہ کی بیٹی ہے۔'' فیاض علی کا لہجہ بہت تیز تھا۔

''میرے خیال میں فیاض علی اس میں اتنا غصے میں آنے والی بات نہیں جتنا تم کر رہے ہو ٹھیک ہے سارا صدیقہ کی بیٹی ہے۔ اگر ہم نے اسے تم سے چھپایا تو اس میں بھی کوئی مصلحت تھی۔''

''کیا مصلحت تھی آخر مجھے تو بھی تو پتا چلے کہ مجھے کیوں کم ظرف سمجھا آپ نے۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کہ اگر مجھے سارا کا علم ہو جاتا تو کیا میں انکار کر دیتا۔''

''نہیں فیاض بھائی اصل میں سارا ہے تو آپ کی بیٹی مگر وہ ہماری ذمہ داری تھی تو آپ کو اس کے بارے میں بتانا نہ بتانا برابر تھا۔'' رضا بھی نرمی سے بولے۔

''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے اگر سارا کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جاتی تو کیا میں اسے قبول نہ کرتا۔ اس کے فرائض جو ایک باپ ادا کرتا ہے۔ میں ادا نہ کرتا۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ

آپ لوگوں نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور مجھ سے اتنی بڑی حقیقت چھپائی۔''

فیاض علی کو اصل دکھ بھی اس بات کا تھا کہ ان کے خلوص کو جانے پرکھے بغیر غلط سمجھا گیا تھا۔

''فیاض علی ذرا ٹھنڈے ہو کر بیٹھو۔ اصل بات یہ ہے کہ سارا جب ایک سال کی تھی تو صدیقہ طلاق لے کر گھر آ بیٹھی اور اس نے آتے ہی سارا کو ابا جان کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آج سے میری نہیں آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کی ذمہ داری ہے۔ چاہیں تو قبول کر لیں اور اگر نہیں تو اسے یتیم خانے میں داخل کروا دیں اور یہ کہ آئندہ سے نہ تو سارا کو میری بیٹی کہا جائے اور نہ کسی کو بتایا جائے۔ تو میرے بھائی جب سارا بن ہی ہماری بیٹی گئی تھی تو اس کے بارے میں تمہیں بتانا' نہ بتانا برابر ہی تھا اور پھر جس کی بیٹی تھی اس نے اس سے اپنی ذات کا حوالہ چھین لیا تھا تو پھر ہاں اس کے باوجود ہمیں چاہیے تھا کہ تمہیں باخبر رکھتے مگر بہت سی باتیں سوچ کر نہیں بتایا یہ قصور ضرور ہے۔ اب جو چاہو ہمارے اس گناہ کی سزا دے لو ہمیں تو صدیقہ شروع سے ناکردہ گناہوں کی سزا دیتی رہی ہے۔ اب تم جو چاہو کہہ لو۔'' ضیاء بہت دکھی اور بکھرے لہجے میں بولے۔'' تو فیاض علی اپنے رویے پر نادم ہو گئے۔ حالانکہ اس میں اس قدر مشتعل ہونے والی ایسی کوئی خاص بات بھی نہ تھی۔

''ضیاء بھائی ذمہ داری کی بات نہیں اس میں۔ میں اپنی انسلٹ محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیا جاتا تو آپ دیکھتے کہ میں سارا کو کس طرح بیٹی بنا کر پالتا۔ اور اس کے فرائض ادا کرتا۔ میری تو کوئی بیٹی بھی نہیں تھی اگر مجھ پر اعتماد کیا جاتا تو آپ لوگ مایوس ہرگز نہ ہوتے۔'' کچھ دیر قبل فیاض علی بہت غصے میں تھے مگر اب بڑے دھیمے...... انداز میں بول رہے تھے۔

''فیاض بھائی سارا تو ان کی بھی ذمہ داری نہیں رہی تھی جن کی بیٹی تھی۔ ابا جی نے سارا کو اپنی بیٹی بنا کر پالا تھا۔ اس کے بعد وہ ہماری بیٹی بن کر رہی۔ سارا تو کلیوں کا دوسرا نام ہے وہ کسی پر بوجھ کہاں ہو سکتی تھی۔ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ آپ اسے یقیناً بیٹی بنا کر رکھتے ہمیں آپ کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں۔''

''اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا تو میں بھی اس کے بیٹیوں والے حقوق ادا کرتا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے مگر یہ صدیقہ نے بیٹی کی شادی میں شرکت کیوں نہیں کی۔ اب فیاض علی مکمل طور پر نارمل ہو چکے تھے۔

''فیاض جب بیٹی کو اس نے تسلیم ہی نہیں کیا تو اس کی خوشی میں وہ شریک کیوں ہوتی۔'' ضیاء نے دکھ سے کہا۔

''مگر وہ آپ کے بیٹے کی شادی میں تو شریک ہو سکتی تھی۔''

''اسی بات پر تو وہ ناراض تھی کہ ہم فہیم کے ساتھ سارا کی شادی کیوں کر رہے ہیں۔''

''نجانے یہ عورت کیا چاہتی ہے میں ہی اسے سمجھ نہیں پایا۔ یا سب ہی اسے نہیں جانتے۔ اچھا ضیاء بھائی مجھے ذرا غصہ آ گیا تھا نجانے کیا کچھ بک گیا ہوں۔ آپ لوگ بڑے پن کا مظاہرہ کریں اور مجھے معاف کر دیں۔'' فیاض علی بہت نادم لگ رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں فیاض اچھا ہے ہمارے دل سے بھی بوجھ کم ہو گیا ہے۔ تمہیں ہماری کوئی بات ناگوار گزری ہو تو تم معاف کر دینا۔ ہماری بہن نے تو ہمیں معاف نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔'' ضیاء بھی افسردگی سے اٹھ کھڑے ہوئے پھر فیاض علی نے خاص طور پر سارا کو پاس بلا کر پیار کیا۔

''سارا بیٹی گو کہ تم اپنے گھر میں خوش رہو۔ اللہ تعالیٰ خوش رکھے۔ مگر بیٹی جب چاہو اپنے باپ کے گھر چلی آنا۔ تم میری بیٹی ہو۔ مجھے سدا ہی بیٹی کی خواہش رہی مگر قدرت کو منظور نہ تھا آج بیٹی ملی تو تب جب وہ اپنے گھر بار والی ہے۔ خوش رہو بیٹی آباد رہو۔ فہیم بیٹا میری بیٹی کا بہت خیال رکھنا۔'' فیاض علی سارا کو دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے تو سارا کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی۔

''امی سارا پھپھو کو دیکھیں بہت رو رہی ہیں۔'' ثنا کے کہنے پر شیریں اس کی طرف لپکیں۔

''سارا بیٹی کیا بات ہے؟''

''بھابھی میرے دل میں آگ سی لگی ہوئی ہے کہیں سے میری ماں کو ڈھونڈ لائیں کہاں کھو گئی ہے میری ماں سارے رشتے مل گئے ہیں مگر۔ مگر بھابھی نہیں ملتی تو ماں نہیں ملتی۔ کیا مائیں ایسی ہوتی ہیں بھابھی جو بیٹی کو...... تسلیم کرنے سے انکار کر دیں باپ کے ہوتے ہوئے یتیم خانہ میں داخل کرنے کو کہیں کیا مائیں ایسی ہوتی ہیں کہ بیٹی کو اپنی دُعاؤں کی چھاؤں میں رخصت بھی نہ کریں۔ ان کو دولہن بنا ہوا بھی نہ دیکھیں۔ بھابھی کیوں ہے میری ماں ایسی کیا میں اکیلی ہی دنیا کی بدنصیب بیٹی ہوں جسے۔ جسے۔''

''سارا۔ سارا نادانی کی باتیں نہ کرو بیٹی یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں کہ تم یوں کرو ٹھیک ہے ہم تمہاری ماں کا نعم البدل تو نہیں مگر جان ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ کس طرح تمہاری ماں کے دل میں تمہارے لیے ممتا جگا سکتے ہیں مت رو میری بیٹی کیا حال کر لیا ہے' آپی پر تو میرے خدا اپنی رحمت کرے۔ جانے کیا کر بیٹھیں یہ اپنی انا کی فصیل کے نیچے دب کر نہ رہ جائیں۔ بس کرو بیٹی تمہارے بھیا آ رہے ہیں تمہیں یوں دیکھ کر ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے چپ ہو جاؤ شاباش۔

شیریں نے ہلکان ہوتی سارا کو ساتھ لگا کر پیار کیا تو وہ بھی رضا کے خیال سے بمشکل ہچکیوں کو چھپاتی وہاں سے ہٹ گئیں سارا کی حقیقت فیاض علی کو معلوم ہونا اس گھر کے لیے

ایک کڑا امتحان تھا جو گزر چکا تھا حالات پھر معمول پر آ گئے تھے۔

''فیاض علی اب بھی آتے رہتے سارا کو بہت پیار کرتے اس کے لیے تحائف لاتے تو سارا کا شدت سے جی چاہتا کہہ دے کہ میرے لیے میری ماں کو ڈھونڈ لائیں جو مجھے ملی بھی نہیں تھی اور کھو گئی۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ گھلتی آہیں سینے میں دم توڑ دیتیں۔

ضیاء اور رضا کو بزنس کے سلسلے میں لاہور جانا پڑ گیا تو وہ شاہین اور شیریں کو ہدایات دے کر چلے گئے۔ حالات بڑی حد تک شیریں کے حق میں تھے اب ان کو نفرت کی یہ بازی جیت لینے کے لئے چند پوائنٹس کی ضرورت تھی اور خدا سے پر امید تھیں کہ وہ یہ پوائنٹس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ حیدر ہی انکی جیت تھا۔ وہ بھی کافی حد تک بدل چکا تھا اب ان سے بات کرتے کرتے اس کی نگاہیں باعثِ ادب آپ ہی جھک جایا کرتیں۔ ان کی میٹھی نرم بات نفرت کی فصیلوں کے اس پار سنائی دینے لگی تھیں تاہم یہ آواز اتنی صاف اور واضح نہیں تھی۔

اس روز فہیم کے کسی دوست کی شادی تھی گھر بھر مدعو تھا مگر شاہین کی طبیعت ذرا خراب تھی اس لیے وہ نہیں گئیں اور شیریں شاہین کے خیال سے رک گئیں۔ شاہین کو دوا وغیرہ دے کر وہ نماز پڑھنے لگیں ابھی دُعا سے فارغ بھی نہیں ہوئی تھیں کہ بیل ہوئی گھر میں اور کوئی تھا نہیں وہ جلدی جلدی گئیں دروازہ کھولا تو سامنے حیدر ویران سی صورت بنائے کھڑا تھا۔

''حیدر بیٹے تم کیوں آ گئے خیریت تو ہے ناں۔'' وہ پریشان ہو گئیں۔

''جی بس ذرا طبیعت بوجھل ہے۔ اس لیے آ گیا۔'' وہ بوجھل اور تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''حیدر بیٹے کیا محسوس کر رہے ہو سر میں درد ہے بخار ہے کیا بات ہے۔'' وہ پیچھے ہی آ گئیں۔

''پتہ نہیں جی دل بوجھل سا ہے یوں جیسے قے ہو جائے گی۔'' حیدر شرٹ کے بٹن کھولتا ہوا بولا اس کی طبیعت بڑی خراب ہو رہی تھی۔

''اچھا تم لیٹو میں ابھی کوئی ہاضمے والی دوا لے کر آتی ہوں۔'' ابھی وہ پلٹی ہی تھی کہ حیدر کو بڑے زور سے قے آ گئی وہ الٹے پاؤں واپس آ گئیں۔ اسے تھام کر باتھ روم لے گئیں اور دنوں ہاتھوں سے اس کا سر تھام لیا حیدر کو قے پر قے آ رہی تھی اس کی بری حالت تھی شیریں بری طرح گھبرا گئیں شاہین بھی نیند کی دوا لے کر سو گئی تھیں۔ کوئی گھر میں تھا نہیں اور...... حیدر بے حال ہو رہا تھا۔

''خدایا یہ کیا ہو گیا ہے میرے بچے کو' نظر لگی ہے کسی کی ابھی صدقہ اتارتی ہوں بیٹے کا۔ یہاں لیٹ جاؤ۔ چاند آرام سے' لاؤ سر دبا دوں۔'' وہ اسے بستر پر لٹا کر سر دبانے لگیں' اسے شدید بخار بھی ہو گیا تھا شیریں آیتیں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں' حیدر لمبے لمبے سانس لے

رہا تھا ابھی وہ سنبھل نہیں پایا تھا کہ پھر بڑے زور سے قے آ گئی مگر وہ واش روم تک نہ پہنچ سکا جس کی وجہ سے بستر اور شیریں کی ساڑھی خراب ہو گی۔

"سوری آپ کی ساڑھی خراب ہو گئی۔" اتنی تکلیف میں بھی وہ معذرت کرنا نہ بھولا۔

"ارے بھاڑ میں جائے سب کچھ' میرا بیٹا ٹھیک ہو جائے کیا کھایا تھا چندا کیوں ایسا ہو رہا ہے؟" وہ الماری سے اس کے بستر پر ڈالنے کے لیے نئی چادر نکالتی ہوئی بولیں۔

"پتہ نہیں جی۔" وہ اپنے بستر پر بے دم سا لیٹ گیا۔ شیریں اسے سیٹ کر کے خود واش روم میں اپنی ساڑھی دھونے چلی گئی۔

حیدر کے دماغ کی رگیں درد سے پھٹ رہی تھیں۔ سارا بدن گویا آگ میں جل رہا تھا ایسے میں اس کا دل شدت سے مما کو یاد کر رہا تھا ان کے ٹھنڈے میٹھے لمس کو محسوس کرنا چاہ رہا تھا اسے خواب کے ہیولوں کی طرح یاد تھا کہ بچپن میں جب وہ بیمار ہو گیا تھا تو مما نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اس کی دکھتی اور سلگتی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے تھے۔ اپنے نرم ہاتھوں سے چھوا تھا تو تمام درد سارے دکھ کتنی جلدی بھاگ گئے تھے۔ آج بھی اس کی وہی حالت تھی آج بھی وہ ایسے ہی لمس کا متمنی تھا ایسے لمس کا جو اس کا سارا درد اپنے اندر جذب کر لے اس نے روح کی تمام گہرائیوں سے مما کو یاد کیا۔ اسی وقت اس نے اپنی تپتی پیشانی پر ٹھنڈے لبوں اور نرم ہاتھوں کے لمس کو محسوس کیا جس نے سارا درد اپنے اندر جذب کر لیا اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو شیریں اس کا سر گود میں رکھے دبا رہی تھیں۔

"اوہ یہ ہیں میں سمجھا میری اپنی مما ہیں۔ مگر ان کے لمس میں اور مما کے لمس میں کوئی فرق نہیں' کیوں ان کے لمس نے بھی مما کے لمس کی طرح میری روح کو پرسکون کر دیا تھا۔ کیا وجہ ہے کیوں ہے ایسا؟ وہ درد سے دکھتی آنکھوں سے انکو دیکھ کر سوچ رہا تھا اور فرق نہ ہونے کی وجہ تلاش کر رہا تھا۔

"اب کیسا ہے میرا بیٹا؟" وہی شعلوں پر پڑتی نرم پھوار جیسی آواز۔

"جی قدرے بہتر ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"اچھا تو بیٹا تم ذرا لیٹو میں ابھی تمہارے پپا کے بکس سے دوا لے کر آتی ہوں دیکھو تو کیسی صورت نکل آئی ہے میرے چاند کی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھامے ہوئے بولیں اور دوا کے لیے چلی گئیں۔ وہ تھک کر آنکھیں موند کر لیٹ گیا تو آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب رونی بھی اس طرح بیمار ہو گیا تھا اس کی تو اس سے زیادہ حالت خراب تھی اور پھپھو نے اسے پوچھا تک بھی نہیں تھا مگر۔ مگر شیریں نے تو اس کا سارا درد اپنے اندر اتار لیا تھا یہ تضاد کیوں تھا۔ اس کا شیریں سے وہی رشتہ تھا جو رونی۔ کا پھپھو۔ سے تھا پھر۔ پھر یہ تضاد کیوں کون غلط تھا کون درست۔ سوچتے سوچتے دماغ کی رگیں درد سے پھٹنے لگیں۔

"حیدر بیٹے لو دوا کھا لو۔" پھر انہوں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور دوا دی دوا لے کر وہ لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگیں اس نے چاہتے ہوئے بھی ان کو نہیں روکا عجیب سا سکون مل رہا تھا جیسے زخموں پر مرہم لگ رہی ہو۔ آگ پر پانی پڑ رہا ہو۔ پھر جانے کب وہ سو گیا۔ باقی سب جانے کب آئے کب سوئے شیریں نے کسی کو بھی حیدر کے متعلق نہیں بتایا خواہ مخواہ پریشان ہوتے وہ اس کے بیڈ کے پاس کرسی پر بیٹھ گئیں۔ حیدر کا بخار تیز ہو گیا تھا اس لیے وہ خاصی پریشان تھیں۔ کبھی سوچتیں کہ فہیم کو جگا دیں مگر اتنی رات کے وقت کیا ہو سکتا تھا رضا بھی گھر پر نہ تھے۔ انہوں نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنا شروع کر دیں کچھ تو دوا کا اثر اور کچھ پٹیوں کے باعث بخار کی شدت میں کچھ کمی ہو گئی۔

"پانی۔" حیدر نے خشک لبوں پر زبان پھیری تو شیریں نے فوراً اسے پانی دے دیا۔

"ارے آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔" حیدر ان کو ابھی تک جاگتا دیکھ کر بولا۔

"اولاد بیمار ہو تو نیند کس ماں کو آ سکتی ہے بیٹے۔" شیریں نے اس کی تپتی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"میں اب بہتر ہوں آپ آرام کریں۔" اسے شرمندگی سے محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ بے آرام ہو رہی ہیں۔

"خدا تمہیں سلامت رکھے بیٹے تم ٹھیک ہو جاؤ۔ میں بھی آرام کر لوں گی۔ ماں اسی وقت آرام کر سکتی ہے جب اس کے بچے ٹھیک اور تندرست ہوں۔ تم پرسکون ہو کر سو جاؤ۔ کچھ کھاؤ پیو گے۔"

"جی وہ۔" وہ جھجک کر خاموش ہو گیا۔

"بتاؤ ناں بیٹے۔"

"جی بھوک تو محسوس ہو رہی ہے۔" ان محبتوں کے سامنے وہ ہارتا جا رہا تھا۔

"میں ابھی اپنے بیٹے کے لیے نرم سی غذا لے کر آتی ہوں۔" وہ چھوٹے بچوں کی طرح اس کے گال چھوتی خود کچن میں آ گئیں۔

وہ اتنی شدید تکلیف میں بھی بہت سکون' بہت راحت محسوس کر رہا تھا جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ آج تک انجانی آگ میں جل رہا تھا اور آج۔ آج ساری آگ بجھ کر رہ گئی تھی۔ اس کے اطراف میں ٹھنڈی ہوا کے ساتھ پھوار پڑ رہی تھی۔ آج تک ایسا کیوں نہیں ہوا کیوں محسوس نہیں ہوا کون سی دیوار آڑے تھی کونسا پردہ پڑا ہوا تھا پہچان کی حس کہاں سوئی تھی کہ یہ سب کچھ دیکھ نہ سکی۔ پہچان نہ سکی۔؟

ابھی وہ ان ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ شیریں دودھ میں دلیا ڈال کر لے آئیں دودھ میں دلیا اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا مگر آج اس میں ایسی لذت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ خود بھی

حیران تھا۔ آج ہوا کیا تھا۔ ہر بات کے مفہوم بدل گئے تھے۔ ذائقے بدل گئے تھے اس کی سوچ بدل گئی تھی یا واقعی کوئی معجزہ رونما ہو گیا تھا وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا سوائے اس کے کہ ایک مہربان ہستی اس پر اپنی محبتوں‘ عنایتوں کے پھول نچھاور کر رہی ہے کتنا سکون تھا اس ٹھنڈی چھاؤں میں۔ آج کیا بات تھی۔ شیریں کو دیکھ کر اس پر ہیجان کا دورہ نہیں پڑا تھا ورنہ تو وہ شروع سے اب تک ویسی ہی تھیں ان کی محبتوں میں تو اضافہ ہی ہوا تھا۔

’’پلیز آپ بھی آرام کریں۔ وہ نادم ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے بے آرام ہو رہی ہیں۔‘‘

اچھا کر لوں گی آرام پہلے تو تم پرسکون ہو کر سو جاؤ۔‘‘ وہ اس پر کمبل درست کرتی ہوئی بولیں تو وہ کچھ ہی دیر بعد نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

شیریں اس کے بخار اور قے سے خوف زدہ ہو گئی تھیں اس لیے وہیں کرسی پر پڑی رہیں نیند تو آ نہیں رہی تھی رسالہ دیکھنے لگیں درمیان میں حیدر کی ایک دو بار آنکھ کھلی تو وہ فوراً متوجہ ہو گئیں۔ مگر بخار کی غنودگی کے باعث وہ پانی پی کر پھر سو گیا پھر شیریں کی آنکھ بھی لگ گئی۔

صبح اذان کے وقت آنکھ کھلی تو وہ وضو کر کے نماز پڑھنے لگیں۔ حیدر کو چھوا بخار بہت کم ہو چکا تھا اس پر دم کر کے تلاوت کرنے لگیں تلاوت کی دھیمی اور خوبصورت آواز پر حیدر کی آنکھ کھل گئی سامنے ہی کھڑکی کے پاس جائے نماز پر شیریں بیٹھ کر تلاوت قرآن پاک کر رہی تھیں سفید دوپٹے کے ہالے میں وہ سے بے حد مقدس لگیں وہ ایک ٹک ان کو دیکھے گیا۔ کانوں میں ان کی میٹھی آواز رس گھول رہی تھی اور نگاہوں میں ان کا پرنور سراپا سما رہا تھا۔

پھر بچپن سے جب سے شیریں اس گھر میں اس کی مما کی حیثیت سے آئی تھیں سارے حالات و واقعات نگاہوں میں گھومنے لگے بھلا یہ محبتوں کا مرکز کسی سے نفرت کر سکتا ہے یا یہ اس قابل ہے کہ اس ہستی سے نفرت کی جائے اسے اس کی محبت کے جواب میں دھتکارا جائے یا پھر اس نے نفرت کی ان سے۔ ہاں وہ تو بہت چھوٹا سا تھا بالکل اندھے فقیر کی مانند جس کی انگلی پھپھو کے ہاتھ میں تھی وہ۔ وہ اسے جانے کہاں لے آئی تھیں کہ وہ واپسی کا راستہ بھی بھول گیا تھا۔

پھر ایک ایک وقت یاد کرنے لگا جب بھی وہ محبت سے اس کی طرف بڑھتیں تو وہ حقارت ونفرت سے ان کو دھتکار دیتا وہ اس کے لیے کتنی چاہت سے کپڑے لاتیں تو وہ ان کو ان کے سامنے جلا دیتا تھا۔ وہ جو اس پر اپنی محبتوں کے پھول نچھاور کرتی تھیں وہ ان کی بیٹی کو اپنی بہن کو آگ میں جلاتا تھا کیوں اسے خود پتہ نہیں کیوں کرتا تھا وہ ایسے۔ وہ تو وہ کرتا جو پھپھو کہتیں پھر اس کا کیا قصور تھا یہ بھی اس کی سوتیلی ماں تھیں مگر وہ ان کے لمس اور اپنی مما کے لمس میں کوئی فرق تلاش نہیں کر سکا تھا۔

اور ایک سوتیلی ماں اس کی وہ پھپھو بھی تھیں جو صرف اس کے لیے سراپا رحمت مگر اپنی

سوتیلی اولاد کے لیے کسی جلاد سے کم نہیں تھیں دونوں ہی عورتیں تھیں‘ دونوں کا اپنی سوتیلی اولاد سے ایک ہی رشتہ تھا پھر یہ تضاد کیوں تھا۔ کیوں کیا پھپھو نے ایسا؟

اس روز روفی کی بھی یہ حالت تھی اور وہ تڑپ رہا تھا۔ مگر پھپھو نے پانی کا گھونٹ بھی اسے نہیں دیا تھا اور انہوں نے تو میرا سارا گند خود اپنے ہاتھوں سے صاف کیا ہے کس کو دکھانے کی خاطر کس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے پپا تو گھر پر نہیں پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا اور پھپھو ان کے ساتھ ایسا کیوں کرتی تھیں یہ مہربان حلیم سی ہستی تو چاہے جانے کے قابل تھیں نفرت کے تو نہیں۔ اسے تو کبھی بھی ان سے نفرت نہیں تھی اس کا تو بہت دل چاہتا تھا محبتوں کی عافیتوں کی اس پناہ میں لپٹنے کو‘ سوتے میں وہ ڈر جاتا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ ان کی گود میں چھپ جائے مگر پھپھو کہا کرتی تھیں کہ یہ ہماری دشمن ہیں ان کی محبت دکھاوا ہے پپا کو متاثر کرنے کا مگر کوئی بھی انسان ساری زندگی تو دکھاوے میں نہیں گزار سکتا اب تو پپا گھر پر نہیں تھے بلکہ ان کی محبتوں کا تو کوئی بھی گواہ نہیں تھا پھر کیوں انہوں نے صرف میری خاطر رات آنکھوں میں گزاری دی کیا لالچ ہے ان کو کس کو متاثر کرنا چاہتی ہیں۔ یہ کیا کر دیا پھپھو نے اسے اتنا ذلیل کر دیا ان کے سامنے کہ وہ ان کے سامنے نگاہیں نہیں اٹھا سکتا ورنہ ان کے پاؤں چھو لیتا۔

وہ مسلسل شیریں کے پاکیزہ اور ملیح‘ چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔ کتنی سادگی کتنا وقار تھا ان کے چہرے پر‘ ہر قسم کے بغض‘ ہر قسم کی نفرت سے پاک چہرہ جس پر اللہ تعالیٰ کی محبت کا نور روشن تھا پر آج اسے کیا ہو رہا تھا۔ یہ آج کن احساسات اور کیفیات کا ادراک ہو رہا تھا وہ آگہی کی کن وادیوں میں اتر رہا تھا۔ اسے کیا ہو رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

اسے تو بس یہ تھا کہ ندامت کے یہ داغ کیوں کر دھل پائیں گے وہ کن راستوں سے ہوتا ہوا معافی کی۔ توبہ کی منزل پر پہنچ پائے گا۔ اگر ان کی پچھلی عنایات اور محبتوں کو اگنور بھی کر دیتا تو۔ تو آج کی رات کی محبتوں کا‘ عنایات کا قرض کیوں کر ادا کر پائے گا۔ اس کے پاس تو ان کو دینے کے لیے پھپھو نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ نہ محبت‘ عزت کی رمق‘ اور نہ معذرت کے الفاظ وہ وہ کیسے ان سے معافی مانگتا۔ اس مہربان کی محبتوں کا اعتراف کس منہ سے کرتا۔ وہ اس کی اس جذباتی کیفیت سے بے خبر تلاوت کرنے کے بعد قرآن پاک کو بوسہ دے کر الماری میں رکھ رہی تھیں!

’’مما۔‘‘ وہ چونک چونک گئیں یہ آواز تو حیدر کی تھی مگر اس کی زبان پر لفظ مما بڑا اجنبی لگا وہ اسے اپنا وہم سمجھیں۔

’’مما۔‘‘ اب یہ آواز انہیں ساعتوں کے بہت قریب محسوس ہوئی۔ تو وہ تڑپ کر واپس پلٹیں مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ نگاہ نیچے گئی تو حیدر کو اپنے پاؤں پکڑے ہوئے پایا۔

''مما۔ مما۔ مما'' وہ روئے جا رہا تھا اور صرف ایک لفظ مما کی گردان کیے جا رہا تھا۔

''حیدر میرے بچے کیا بات ہے میری جان۔'' شیریں سمجھیں شاید بخار کی غنودگی کے باعث وہ اسے مما کہہ رہا ہے یا اسے اپنی مما سمجھ رہا ہے۔''

''مما۔ مما۔ مجھے معاف کر دیں پلیز۔ معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں بہت زیادتیاں کی ہیں آپ کے ساتھ مما۔ مما پلیز مجھے معاف کر دیں' معاف کر دیں۔'' وہ بے خودی میں روتا بھی جا رہا تھا اور بولے بھی جا رہا تھا شیریں کو جب یقین ہو گیا کہ ان کو ہی مما کہہ رہا ہے تو وہ بھی ضبط نہ کر سکیں اور حیدر کو ساتھ لگا کر شدتوں سے رو پڑیں۔

''حیدر میرے بچے میری جان تمہاری قصور ہی کیا ہے میری جان اتنے عرصے میں تم لوگوں کو تلاش کرتی رہی' اپنی محبتوں کو آزماتی رہی تو آج مل بھی گئے ہو نا حیدر میرے بیٹے نہ رو۔'' انہوں نے حیدر کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''مما جان آپ بہت اچھی ہیں شروع سے اچھی ہیں میری اپنی والی مما کی طرح ہیں۔ میں نے مما۔'' میں نے آپ سے بہت بدتمیزیاں کی ہیں' گستاخیاں کی ہیں' پلیز معاف کر دیں مگر۔ مگر مما آپ یقین کریں میں کوئی خود سے نہیں کرتا تھا وہ سب پھپھو جو کہتی تھیں میں وہی کرتا۔ پھپھو نے کہا آپ نے پپا سے دولت کی خاطر شادی کی ہے۔ ہماری مما کو مارا ہے آپ اچھی نہیں ہیں۔ تو پھر مما میں کیا کرتا میرا تو اس میں قصور نہیں ہے ناں۔ بتائیے مما میں تو گناہگار نہیں ناں۔'' وہ ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگائے بولے جا رہا تھا۔

''نہیں حیدر بالکل نہیں میری جان تمہارا کوئی قصور نہیں تھا تب ہی میں بھی اس امید پر زندہ تھی کہ کبھی تو حقیقت آشکار ہو گی کبھی تو میرے خلوص کی' میری محبتوں کی جیت ہو گی تم لوگوں کا جان کیا قصور جب آپی نے زہر ہی بھر دیا تھا تم لوگوں کی رگوں میں تو کیا کہا جا سکتا تھا۔ اسی لیے اپنی محبتوں سے اس زہر کو ختم کرنے کی سعی میں لگی رہتی تھی اور آج میرے پاک رب نے مجھے فتح نصیب کر دی ہے خدایا میں تیری شکر گزار ہوں تیری ذات نے مجھ گناہ گار پر یہ کرم کیا۔'' شیریں بھیگی پلکوں سے خدائے قدوس کا شکرانہ بجا لا رہی تھیں۔

''تو کیا مما آپ نے مجھے معاف کر دیا۔'' وہ ان کے ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں میری جان اول تو تمہارا قصور ہی نہیں تو معافی کیسی' میں تم لوگوں کی ماں ہوں مائیں تو بچوں کو تمام خطائیں معاف کر دیا کرتیں ہیں اور تم تو بے گناہ ہو میرے بچے۔ کاش۔ کاش میری اس جیت کا منظر رضا بھی دیکھ لیتے تو کتنے خوش ہوتے۔''

دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے پر محبتوں کے پھول نچھاور کرنے میں اس قدر مگن تھے کہ ان کو پتا بھی نہیں چلا کہ رضا جو کچھ دیر قبل ہی لاہور سے لوٹے تھے حسبِ عادت سب سے پہلے حیدر کے کمرے میں آئے تو دونوں بچھڑے ہوئے ماں بیٹے کا ملن دھندلائی آنکھوں سے دیکھ

رہے تھے۔ زیست کے اس سفینے نے گو کہ بہت طوفانوں کا مقابلہ کیا تھا کئی مدوجزر ہزار ہا گرداب پڑے تھے راہ میں مگر ناؤ ساحل پر آ گئی تھی۔ ان ساعتوں کے لیے انہوں نے خدائے واحد کے حضور کتنی دعائیں کر ڈالی تھیں اور شکر تھا کہ دعائیں بے ثمر نہیں لوٹی تھیں۔ شیریں کی محبت نے بالآخر حیدر کی نفرت کو محبت میں بدل دیا تھا حیدر کو فتح کر لیا تھا اور یہ ہی تو وہ چاہتے تھے کہ نہ شیریں کا اعتماد مجروح ہو اور نہ حیدر متنفر ہو۔

''مبارک ہو شیریں تم نے نفرت و محبت کی یہ جنگ جیت لی ہے۔'' رضا۔ رضا آپ آ گئے۔ رضا دیکھے میں جیت گئی ہوں میں نے اپنی محبتوں سے نفرتوں کے زہر کو مار دیا ہے۔'' رضا میری ممتا جیت گئی ہے۔ رضا میری عمر بھر کی ریاضتوں کو اللہ تعالیٰ نے بے ثمر نہیں لوٹایا میں کہتی تھی ناں رضا آپ فکر مند نہ ہوا کریں۔ مجھے اپنی فتح تک لڑنے دیں اور آج میں جیت گئی ہوں صدیقہ بیگم کی نفرتوں کی لگائی آگ ہمیشہ کے لیے بجھ چکی ہے رضا میں کس قدر خوش ہوں' میں کس قدر خدا کا شکر بجا لاؤں کہ اس نے مجھے معتبر بنا دیا ہے۔ حیدر نے مجھے مما تسلیم کر لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس کی ماں ہوں' اس کی مما ہوں اس کی اپنی مما کی طرح' رضا سن رہے ہیں ناں۔'' شیریں رضا کے ہاتھ تھامے دیوانہ وار بولے جا رہی تھیں۔

''ہاں شیریں ہم۔ ہم تو اس قابل بھی نہیں کہ اتنی عنایات پر خدا کا شکر بجا لا سکیں۔ حیدر میری جان میرے پاس آؤ بیٹے۔ کہاں کھو گئے تھے میرے چاند کتنے عرصے بعد ملے ہو۔'' رضا نے بازو پھیلائے تو حیدر ان سے لپٹ گیا۔

''پپا میرے پیارے پپا مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بھی بہت دکھ دیے ہیں۔ بہت گستاخیاں کی ہیں پپا پلیز مجھے معاف کر دیں مگر پپا میں۔ میں۔''

''میں جانتا ہوں بیٹے ہماری خوشیوں کا رہزن کون ہے؟ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں بس خدا سے اتنی دعا ہے کہ ان کے حال پر اللہ تعالیٰ رحم کرے جنہوں نے مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دی زندگی کے کسی پل میں بھی خوشی نصیب نہیں ہونے دی۔'' رضا نے حیدر کو پیار کرتے ہوئے صدیقہ کے لئے دعا کی۔

''دیکھا شیریں میں نہ کہتا تھا کہ میرے بچے بے قصور ہیں ایسے نہیں ہیں۔ یہ محبت کرنا جانتے ہیں۔ ادب کرنا ان کا شعار ہے بس ذرا بہکائے میں آ گئے ہیں اور جس روز یہ سنبھل گئے اس روز ان سے زیادہ تابعدار کوئی نہ ہو گا۔'' رضا نے پیار سے حیدر کو دیکھتے ہوئے شیریں سے کہا۔ حیدر رومال سے چہرہ صاف کر رہا تھا۔

''اور مجھے آپ کی بات پر سو فیصدی یقین تھا کہ رضا کہ ہمارے بچے بہت اچھے' بہت فرمانبردار ہیں۔'' شیریں اس خوشی پر نہال ہو رہی تھیں۔ آج کی سحر کا سورج نئی روشنی' نئی محبتوں' نئی امنگوں کی کرنوں کے ساتھ طلوع ہوا تھا ان تینوں کو غیر حاضر پا کر سب اوپر ہی آ گئے۔

''اوہو یہاں تو بچھڑے ہوؤں کے ملنے کا جذباتی سین ہو رہا ہے' ڈراپ سین ہے یا ابھی ڈرامہ باقی ہے۔'' یاسر حیدر کو چھیڑ رہا تھا۔

''میں سب کے سامنے مما سے گستاخی کیا کرتا تھا۔ آج میں سب کے سامنے ان سے معافی مانگتا ہوں اور آئندہ گستاخی نہ کرنے کی قسم کھاتا ہوں۔'' اس نے سب کے سامنے شیریں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو شیریں نے اسے ساتھ لگا لیا۔ سب بہت خوش ہو گئے ایک عرصے کی جنگ ختم ہو گئی تھی۔ ہر وقت کی کوفت سے نجات مل گئی تھی۔

''بھیا جان اب تو میں آپ کی بہن ہوں ناں ارم' کرن' آپی کی طرح۔'' ثناء آہستگی سے حیدر کے قریب کھسک آئی تو اس نے اسے ساتھ لگا لیا۔

''تم میری بہن کب نہیں تھیں ثناء۔''

''سب کو یہ جنگ بندی مبارک ہو۔ ویسے تو ہمیں معلوم ہے پھر بھی تسلی کے لیے بتایا جائے کہ پہل کس نے کی تھی صلح صفائی میں۔''

''یاسر نے بلند آواز سے کہا۔

''کسی نے بھی کی ہو خدا کا شکر ہے کہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں اللہ اب۔'' ضیاء صدیقہ کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔

اس جنگ بندی کے بعد گھر میں بڑا خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا تھا ہر کوئی خوش اور شاداں تھا۔ حیدر نے جس قدر بدتمیزیاں کی تھیں اب وہ اسی قدر ان کا ازالہ بھی کر رہا تھا۔ شیریں کی بات بعد میں نکلتی وہ پوری پہلے کرتا ہر بات پر ''جی مما'' کہہ کر فوراً حاضر ہو جاتا تو شیریں اسے دعائیں دیتی رہ جاتیں سب ہی خوش تھے ایسے میں صدیقہ بیگم کی کمی سب کو محسوس ہوتی مگر سارا بجھ کر رہ جاتی۔''

''امی آپ کس قدر بدنصیب ہیں زندگی کی کسی خوشی میں آپ کا حصہ نہیں برا مت مانیے گا۔ امی میں تنہائی میں اپنی سوچوں میں آپ کو امی کہہ کر اپنے پیاسے لبوں کو تر کر سکتی ہوں ناں' ماں کہنے کا حق تو آپ نے بہت پہلے چھین لیا تھا۔'' سب ہنس بول رہے تھے اور سارا ماں کے ہجر میں دکھی آنسوؤں کو روکتی رہ جاتی۔

''کچھ نہیں حیدر بس اتنی دعا کرو کہ جس طرح تمہیں تمہاری ماں مل گئی ہے اسی طرح مجھے بھی میری ماں مل جائے۔'' سارا کے دکھی لہجے میں صدیوں کی پیاس اور حسرت تھی۔ حیدر صدیقہ کے نام پر منہ بنا کر اٹھ گیا۔

''دیکھ لیں امی نفرت کے بیج سے کبھی محبت کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں آپ کا حیدر بھی اب آپ کا نام سننا پسند نہیں کرتا۔'' سارا دھندلی آنکھوں سے حیدر کو جاتا دیکھ کر سوچتی رہی۔

حالات مکمل طور پر معمول پر آ گئے تھے۔ ایک روز رضا نے اپنے بزنس اور جائیداد کی

دستاویزات شیریں کو دیں تو وہ حیران رہ گئیں۔

''رضا یہ کس لیے آپ نے کیا ہے؟''

''یہ تم حیدر کو دے دینا۔'' رضا بہت سنجیدہ تھے۔

''رضا یہ کیا ایسا نہ کریں رضا بچہ اگر سیدھا جا رہا ہو یا اس سے غلطی ہو جائے اور اسے غلطی کا احساس بھی ہو تو بار بار اس کی غلطی کو دہرانا مناسب نہیں۔'' شیریں نہیں چاہتی تھی کہ اب پرانی باتوں کو دہرایا جائے اور پھر حیدر کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔

''میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو شیریں اسے تم میرا امتحان سمجھ لو۔'' شیریں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کاغذات لے لیے اور حیدر کے کمرے میں آ گئیں۔

''ارے مما آپ کو اگر کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔'' حیدر ان کو دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا تو شیریں کو اس پر پیار آ گیا۔ یہ وہی حیدر تھا جو ان کو دیکھتے ہوئے نفرت سے منہ موڑ لیا کرتا تھا آج فرمانبردار بنا کھڑا تھا۔

''جیتے رہو بیٹے کام تو کوئی نہیں تھا بس یہ کاغذات دیے ہیں تمہارے پپا نے۔''

''کیسے کاغذات؟'' وہ حیرانگی سے ورق گردانی کرتا ہوا بولا۔

''بزنس اور جائیداد کے کاغذات ہیں بیٹا تم ماشاءاللہ اب اس قابل ہو کہ سب کچھ سنبھال لو ویسے بھی یہ سب تم لوگوں کا ہی ہے' ہمارے لیے تو تم لوگوں کی خوشیاں ہی سرمایہ ہیں۔''

کاغذات سے اسے پتہ چلا کہ تمام بزنس اور جائیداد ان چاروں بہن بھائیوں کے نام ہے اس میں ثناء یا شیریں کا نام تک نہیں ہے وہ دھنستا چلا گیا ایک بار پھپھو کے بہکاوے میں آ کر اس نے جائیداد کا تقاضا کر دیا تھا تو پپا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا وہی جائیداد ان چاروں کے نام تھی جو پھپھو کے مطابق شیریں اور ثناء کو ملے گی ان کا تو نام بھی نہیں تھا اس نے دکھ اور شرمندگی سے شیریں کو دیکھا۔

''لگتا ہے مما آپ نے اور پپا نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا اگر میری کوتاہیوں کو آپ لوگ دل سے معاف کر دیتے تو۔ تو یہ خنجر میرے دل میں نہ اتارتے۔ نہیں چاہیے مجھے کچھ بھی مما میں تو جس دولت سے محروم رہا ہوں اب تک وہ آپ کی محبت ہے اور جب یہ سرمایہ آپ نے میرے نام کر دیا ہے تو مجھے کسی مادی دولت کی ضرورت نہیں۔ مما پلیز۔ مجھے میری گذشتہ کوتاہیاں یاد دلا کر شرمندہ نہ کیا کریں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف آپ لوگوں کی محبت چاہیے اور بس ہم سب ایک ہیں مما ہمارا کچھ بھی بٹا ہوا نہیں اور نہ بٹے گا ہم یوں ہی رہیں گے پلیز۔ آئندہ آپ ایسی بات نہ کریں۔ حیدر نے فائل اٹھا کر دروازے کی طرف اچھالی تو اس کے گرنے سے قبل رضا نے پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے آہستگی سے حیدر کے قریب آ گئے۔

''تھینک یو بیٹے کاغذ کے ان ٹکڑوں کی میری نزدیک بھی کوئی وقعت نہیں میں تو بس یہ

دیکھنا چاہتا تھا کہ بے جان کاغذ کے یہ ٹکڑے میرے بیٹے کی توجہ کس حد تک حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور یہ کہ اس وقت جو تم نے ان کا مطالبہ کیا تھا تو اس میں بہکاوا کتنا تھا اور تمہاری اپنی خواہش کتنی تھی۔ بیٹے یہ تمہارا نہیں میرا امتحان تھا یہ جان کر کہ تمہارا اس خواہش سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ ہے میں بھی یہ بازی جیت گیا ہوں اگر میں یہ بازی ہار جاتا تو شاید کبھی سنبھل نہ پاتا شکریہ میں یہی کچھ سننا چاہتا تھا جو تم نے مجھے سنا کر معتبر کر دیا ہے' خوش کر دیا ہے بیٹے تم نے۔'' اب رضا پرسکون سے ہو گئے۔ اسی وقت رضا کو باہر کوئی بلانے آ گیا تو وہ چلے گئے۔

''مما یہ فائل آپ ذرا مجھ دیں ایک قرض میں نے بھی اس سے چکانا ہے۔'' حیدر شیریں کے ہاتھ سے فائل لے باہر نکلا۔

''حیدر بیٹے اگر پھپھو کے ہاں جا رہے ہو تو بیٹے کوئی بات نہ کرنا کوئی گستاخی نہ کرنا۔''

''مما آپ ان کے متعلق کہہ رہی ہیں جنہوں نے آپ کی راہوں میں ہمیشہ خار بوئے' ہمیں متنفر کیا۔'' حیدر مڑ کر اس عظیم عورت کو دیکھنے لگا جس نے صدیقہ کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے تھے۔

''ہاں بیٹا میں کہہ رہی ہوں اس لیے کہ نفرت کو محبت سے شکست دی جاتی ہے اور برائی کو اچھائی سے ختم کیا جاتا ہے یہ بات بہت سچی ہے اور اگر اس فارمولے پر ایمان رکھا جائے تو میرے خیال میں دنیا سے برائی کا وجود ہی ختم ہو جائے۔''

''کاش مما تمام لوگ۔ آپ کے ذہن سے سوچنے لگیں تو واقعی کوئی برائی کا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے مگر دنیا میں آپ جیسے فاتح لوگ بھی ہیں۔'' ''میرے جیسے مفتوح لوگ بھی ہیں اور۔ اور پھپھو جیسے شکست خوردہ اور انا پرست اور بدنصیب لوگ بھی ہیں۔'' مجھے چند باتیں پھپھو سے ضروری کرنی ہیں اور وہ میں کر ہی کے دم لوں گا ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔'' حیدر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

وہ کافی عرصے کے بعد آیا تھا یہ وہ حیدر تھا جو ان کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا تھا اس کا زیادہ تر وقت ان کے ہاں ہی گزرتا مگر کل اور آج میں کتنا فرق تھا گھر میں اور کوئی نہیں تھا وہ سیدھا صدیقہ کے کمرے میں گیا وہ بیڈ پر دیوار سے ٹیک لگائے خالی نگاہوں سے خلاؤں میں گھور رہی تھیں وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا تب انہوں نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا' حیدر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کیوں دیکھ رہے ہو ایسے کیا کرنے آئے ہو؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''میں کیا کرنے آیا ہوں اس کا جواب تو میں بعد میں دوں گا پہلے یہ بتا دوں پھپھو میں کیا دیکھ رہا ہوں تو سنیے پھپھو میں آپ کے چہرے پر وہ عورت تلاش کر رہا ہوں جسے خدا نے نفرت

کے لیے نہیں' بلکہ محبت کے لیے پیدا کیا ہے اور جس کا خمیر' محبت سے اٹھایا گیا ہے وہ نفرتوں کا درس کیونکر دے سکتی ہے؟'' حیدر ایک ایک لفظ چبا کر ادا کر رہا تھا۔

''کیا بک رہے ہو تم؟'' صدیقہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں ان کے لیے حیدر کا یہ انداز قطعی نیا تھا۔

''آپ نے میرے بچپن سے اب تک کچھ اچھا فرمایا ہوتا تو میں آج یوں بک نہ رہا ہوتا یوں اپنی نگاہوں میں گر نہ رہا ہوتا۔ آپ نے پھپھو۔'' آپ نے بہت بُرا کیا۔ بہت بُرا۔'' میں کہتی ہوں عافیت اسی میں ہے کہ چلے جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

صدیقہ طیش میں اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''بس پھپھو اتنی سی بات تھی مجھ پر لٹانے کے لیے اب آپ کے پاس محبتیں نہیں رہیں یا زیادہ دیر تک اپنی اصلیت کو چھپا نہیں سکیں۔'' حیدر کی تلخ بات سے خود ان کا حلق کڑوا ہو گیا۔

''میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ میری نگاہوں کے سامنے سے وہ چلائیں۔

''کیوں دفع ہو جاؤں پھپھو کیوں؟ میں تو آپ کی آنکھوں کا نور ہوں' دل کا سرور ہوں۔ پھر کیوں دفع ہو جاؤں۔ نہیں پھپھو' یوم حساب ہو تو محبتوں اور نفرتوں کا ایک ایک پل کا حساب دینا پڑتا ہے اور آپ کو بھی دینا پڑے گا' پھپھو آپ کو میری زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہوگا۔ اس لیے پھپھو کہ۔ کہ میں۔ میں اپنی نظروں میں گر گیا ہوں مجھ پر عقل شعور کے دروازے وا...... ہو گئے ہیں آپ کے چنگل سے آزاد ہو کر میں نے محبت کا امرت پیا ہے تو احساس ہوا کہ زندگی تو اب تک خسارے میں جا رہی تھی۔ میری زندگی کے اس خسارے کو کون پورا کرے گا پھپھو کون حساب دے گا؟ ظاہر ہے آپ اس لیے کہ آپ ہی میری قرض دار ہیں۔

جی پھپھو آپ۔ آپ نے۔ مجھے انسان سے حیوان بنا دیا تھا ہماری رگوں میں زہر بھر کر ہماری رگوں کو کاٹ ڈالا۔ ہمیں محبت کا درس دینے کی بجائے ہمارے ذہنوں کی نرم کچی زمین پر آپ نے نفرت کے بیج بو دیے۔ ہم لوگ اندھے تھے' آپ نے ہمیں غلط راہ پر ڈال دیا' تاریکیوں کی طرف دھکیل دیا آپ نے پھپھو' آپ نے عورت ہو کر بھی دوسری عورت کا سکھ چین برباد کر دیا آپ نے ہمیں اس عورت سے گستاخ کر دیا جو ہماری بدتمیزیوں اور نفرتوں کے جواب میں ہم پر محبتوں کے پھول نچھاور کرتی رہیں' ہم اس پر نفرت کی آگ اچھالتے وہ ہم پر چاہتوں کی بارش کرتیں۔

اسی عورت نے پھپھو' اسی عورت نے جس کو آپ نے اپنی نفرت کا نشانہ بنایا اس نے مجھے آپ سے گستاخی کرنے پر منع کر دیا اس لیے کہ وہ پاکیزہ عورت' محبتوں اور عنایتوں کا مجسمہ ہے۔ وہ عورت کے تقدس کو جانتی ہے آپ نے اس کی راہ میں خار بوئے اور وہ اپنی پلکوں سے

خار چنتی کلیاں بکھیرتی چلی گئی' پھپھو آپ کا انجام بہت برا ہوگا۔ آپ نے بہت ظلم کیا ہے ہم تو بچے تھے ناسمجھ تھے اگر آپ زہر نہ بھرتیں تو ہم ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں میں پرورش پاتے تو کوئی محرومی کوئی تشنگی ہم میں نہ ہوتی۔ ہم بھی مما کی چاہت میں پرسکون زندگی گزار رہے ہوتے۔

پھپھو آپ بھی روفی' نومی کی سوتیلی ماں ہیں ناں' آپ نے تو ان سے زندگی کا مفہوم بھی چھین لیا ہے۔ اس روز روفی کی اتنی طبیعت خراب تھی وہ مر بھی سکتا تھا لیکن آپ نے اسے پانی کا گھونٹ تک نہیں دیا یہ ہے آپ کا عورت پن۔ یہ ہے آپ کی ممتا اور ایک وہ عورت ہے کہ ساری رات آنکھوں میں گزار دی میری خاطر'' اس نے اپنی ممتا مجھ پر نچھاور کر دی جس میں نے آپ کے کہنے میں اگر اتنی گستاخیاں کی ہیں آپ کی طرح ہوتیں تو اس روز وہ انتقام لے سکتی تھیں مگر وہ آپ نہیں تھیں ورنہ تو میرا گلا ہی دبا دیتیں۔'' حیدر جوش میں بولے جا رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے۔ صدیقہ اب تک بڑے ضبط سے سن رہی تھیں۔

''ہوں تو گویا جادوگرنی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔'' شیریں کے لیے ان کے منہ سے اب بھی زہر ہی نکل رہا تھا۔

''جی ہاں۔ محبت کا جادو نفرت کے ہر اثر کو زائل کر دیتا ہے اور مما کی محبت نے ہی ہماری رگوں کو کاٹتے زہر کو ختم کر دیا ہے آپ کس قسم کی ماں ہیں پھپھو ہیں کہ سارا پھپھو کو آپ نے ماں ہوتے ہوئے بھی اپنے وجود سے کاٹ ڈالا محض اپنی انا کی خاطر بیٹی کے وجود سے منحرف ہوگئیں وہ پل پل ترستی رہیں آپ کے پیار کو کہ زندگی میں ایک بار ان کو آپ بیٹی کہیں۔ مگر آپ کے پتھر ایسے دل میں ممتا کیونکر دھڑک سکتی ہے۔

پھپھو آپ تو عورت کہلانے کی بھی حقدار نہیں۔ عورت اپنے بچوں کے لیے تو محبت کا سمندر ہوتی ہی ہے دوسرے لوگ بھی اس سے پیاس بجھا لیتے ہیں اور ایسی عورتیں مما جیسی ہوتی ہیں جو خود ہر دکھ تکلیف برداشت کر لیتی ہیں مگر اپنے سے وابستہ لوگوں کو محبتیں دیتی ہیں۔

خدا مجھے معاف کرے میں نے آپ کے بہکاوے میں آ کر کیسی کیسی گستاخیاں نہیں کیں مگر اس فرشتہ صفت عورت نے پھر بھی مجھے سینے سے لگا لیا اور آپ۔ آپ نے تو ہمیشہ دوسروں سے نفرت کی اور ہمیں بھی نفرت کا درس دیا تاکہ ہم لوگ نہ دین کے رہیں نہ دنیا کے کیوں پھپھو کیا بگاڑا تھا ہم نے آپ کا کہ آپ نے ہمارے ساتھ ایسا کیا۔

آپ نے آج تک نفرت ہی کی ہے لیکن اگر کسی سے محبت کی ہوتی تو یوں تہی دامن نہ رہتیں آپ۔ مگر آپ نے تو اپنے گرد نفرت کی اتنی مضبوط فصیلیں کھڑی کر رکھی ہیں کہ محبت جیسا لطیف اور پاکیزہ جذبہ وہاں تک کس طرح پہنچ سکتا ہے۔''

''نکل جاؤ۔ نکل جاؤ میرے گھر سے میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی نفرت ہے

مجھے تم سے بھی۔'' ''تم کس کھیت کی مولی ہو نکل جاؤ۔'' یہ وہی حیدر تھا جس میں کبھی ان کی جان ہوا کرتی تھی اس لیے کہ وہ ان کی ناپسندیدہ ہستی شیریں کو اذیت پہنچانے میں ان کی مدد کرتا تھا۔ آج جب وہ ان سے وفاداری کا دم بھرنے لگا تو ان کو اس سے نفرت ہوگئی وہ اسے گھر سے باہر دھکا دیتی ہوئی پاگلوں کی طرح بول رہی تھیں۔

''جاتا ہوں پھپھو مجھے بھی کوئی شوق نہیں محبتوں سے خالی اس تپتے صحرا میں ٹھہرنے کا آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب تو دے دوں۔ یہ دیکھئے۔ یہ دیکھئے پھپھو یہ پاپا کی تمام جائیداد اور بزنس کے کاغذات ہیں جو صرف ہم چاروں کے نام ہیں مما کا اور ثنا کا جو حق دار بھی ہیں نام تک درج نہیں۔''

''یہ دیکھئے ظرف محبت کی مثال پھپھو یہ وہی کاغذات ہیں جن کے لیے آپ نے مجھے پاپا سے گستاخی پر اکسایا۔ اف خدایا پھپھو آپ نے کون کون سا گناہ مجھ سے نہیں کروایا۔ میں نہ صرف اس فرشتہ صفت ماں کا دل دکھاتا رہا بلکہ اپنے پیارے پاپا کو بھی دکھ دیتا رہا آپ نے بہت ظلم کمایا ہے آپ عذاب الٰہی سے ہرگز نہیں بچ پائیں گی۔'' حیدر نے بھی آج تمام حساب بے باق کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''میں نے کہا ناں نفرت ہے مجھے تم سے بھی جاؤ اپنی پیاری مما کے پاس اس کی محبتیں سمیٹو۔''

''جا رہا ہوں پھپھو لیکن سن لیں کہ نفرت ہے مجھے بھی آپ سے بلکہ آپ تو اب کسی کی نفرت کے قابل نہیں رہیں۔ میں بھی اب تمام زندگی آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا نفرت ہے مجھے آپ سے۔ نفرت ہے۔ جا رہا ہوں اس ماں کے پاس جس نے میری نفرت کے جواب میں ہمیشہ مجھے محبت دی۔'' حیدر نے زور سے دروازہ بند کیا اور واپس آ گیا۔

اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ شدت سے رو دیا اس نے ایسا تو نہیں چاہا تھا کہ وہ پھپھو کے ساتھ اس طرح بدتمیزی سے پیش آئے گا ان سے گستاخی کرے گا اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ دل کا غبار نکال کر دل مزید بوجھل ہو گیا تھا پھپھو کو تو اس سے مطلبی اور انتقامی محبت تھی مگر اسے ان سے سچی محبت تھی مگر انہوں نے جب اس کی محبت کو پامال کر دیا تو وہ بھی ضبط نہ کر سکا اسے پھپھو کے ساتھ بدتمیزی کا بہت ملال تھا مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا بُرے کام کا ہمیشہ بُرا ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

اس نے بوجھل دل کے ساتھ فائل شیریں کو واپس کر دی انہوں نے تفصیل نہیں پوچھی حیدر کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ساری داستان لکھی تھی۔ حیدر کے اس رویے کے بعد صدیقہ بل کھاتی ناگن بن گئی تھیں۔ ہر وقت پھنکارتی رہتیں۔ فیاض علی گھر کے اس تناؤ سے تنگ آ گئے تھے کیونکہ گھر کا سکون عورت سے وابستہ ہوتا ہے اور جب عورت ہی آگ لگاتی

رہے تو سکون کہاں سے آسکتا ہے۔

فیاض علی صدیقہ سے شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی باہر چلے گئے تھے اس لیے سال بعد آتے تو ان کو صدیقہ کے بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ وہ گھر میں کس طرح رہتی ہیں لیکن اس دفعہ کئی راز فاش ہوئے تھے صدیقہ کی فطرت کے بارے میں بھی پتہ چلا تھا۔

''یہ گھر ہے کہ دوزخ''

''اس گھر سے تو شاید دوزخ بھی اچھی ہوا بو۔''

''روفی۔!''۔ روفی نے دکھ سے کہا تو نومی نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ کوئی بات نہ کرے۔ فیاض علی نے دونوں کو دیکھا۔

''تم لوگ کچھ چھپا رہے ہو کیا؟'' انہوں نے ٹٹولتی نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

''نہیں ابو ایسی بات نہیں جس کو چھپایا جائے۔ بس ایسے ہی۔'' نومی نے ان کو پرسکون کر دیا وہ نہیں چاہتا تھا جس آگ میں آج تک وہ لوگ سلگتے رہے ہیں اس کی تپش ان کے مہربان ابو تک پہنچے۔

نومی نے تو ان کو ٹال دیا تھا مگر اس روز بک شیلف سے کوئی کتاب ڈھونڈ رہے تھے تاکہ کچھ دیر کے لیے ذہنی آسودگی حاصل ہو اسی کوشش میں ایک سیاہ رنگ کی ڈائری قالین پر آرہی اور کھل گئی وہ ذرا جھک کر اس تحریر کو پڑھنے لگے جو بڑی واضح نظر آرہی تھی۔

''پیارے ابو آج پھر چھوٹی امی نے ہم دونوں کو سزا دی اور گھر سے نکال دیا۔ سردی بہت تھی ابو ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ ابو ہم ساری رات باہر رہے پھر مجھے تو اندر کر لیا۔ مگر بھیا کو صبح تک باہر رہنے دیا۔ ٹھنڈے فرش پر سونے سے بھیا بہت بیمار ہو گئے تو پڑوسی والے انکل نے ان کو دوا لا کر دی۔''

''ابو جان آپ نے عید پر جو ہمارے کپڑے بھیجے تھے وہ عید والے روز غائب ہو گئے تھے ہم دونوں بھائی ترستے رہے۔''

''ابو جان نہ عید کے کپڑے ملے نہ عیدی ملی۔۔ ابو آپ آ کیوں نہیں جاتے ہم ہر چیز کے لئے ترس رہے ہیں ابو میں آپ کو ہر ایک بات لکھنا چاہتا ہوں مگر بھیا منع کر دیتے ہیں تو میں اپنی ڈائری سے ساری باتیں کر لیتا ہوں میری ڈائری تو میری دوست ہے ناں' ابو آپ ہمیں کسی اور پتے پر الگ پیسے بھیج دیا کریں تاکہ ہم اسکول کی فیس اور کتابیں تو خرید لیا کریں۔ امی سے مانگو تو پہلے پیٹتی ہیں پھر دیتی ہیں۔ ابو آپ آئیں ناں تو میں آپ کو اپنی پشت پر زخم ضرور دکھاؤں گا جو امی نے لگایا ہے نومی بھیا سے تو امی کو شدید نفرت ہے۔ ابو وہ اکثر کھانا ہوٹل سے کھاتے ہیں ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچ پورا کرتے ہیں۔ ابو آپ اتنی دور ہیں ہم کیسے آپ سے کچھ کہیں بھیا آپ کو خط

نہیں لکھنے دیتے ابو میں کیا کروں پلیز آپ جلدی سے آجائیں...... ابو پلیز''......

ہر ورق پر جگر خراش داستان تھی فیاض کے بچوں کے زخم تھے غم و غصے سے ان کا برا حال ہو گیا۔

''صدیقہ میں تم پر اعتبار کر کے برباد ہو گیا صدیقہ۔'' وہ چیخ کر بولے پھر اسی وقت انہوں نے ضیاء اور رضا کو فون کر کے گھر بلوالیا۔

''خیریت فیاض علی۔'' ضیاء پریشانی سے بولے۔

''ہونہہ خیریت' مجھے یہ بتائیے ضیاء بھائی میں نے کیا بگاڑا تھا آپ لوگوں کا کہ اس بے حس عورت کو میری زندگی برباد کرنے بھیج دیا۔'' دیکھئے پڑھیے اس کو ضیاء بھائی اس میں میرے بچوں کے زخم ملیں گے آپ کو۔ ان بچوں کے جن کی پرورش اور خدمت کے لیے میں نے دوسری شادی کی مگر یہ عورت میرے بچوں کو زخمی کر کے ان پر نمک پاش کرتی رہی۔ میں ان بچوں کی خاطر پرائے دیس میں دربدر ہوتا رہا صرف اس لیے کہ میرے بچے خوشحال ہوں' ان کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی خواہش پوری ہو سکے مگر کیا خبر تھی کہ یہ ذلیل عورت خواہشات تو ایک طرف ان کی ضروریات بھی پوری نہیں کر رہی قصور میرا ہے جو میں نے اس پر اعتماد کیا وہ اسکول کی فیس اور کتابوں کو ترستے رہے اور یہ لکھتی رہی کہ آپ کے بچے بدقماش ہیں' فضول خرچ ہیں' آوارہ ہیں۔ مجھے ان کے خلاف بھڑکاتی رہتی ضیاء بھائی میں نے جن کی خوشیوں کی خاطر ان کی جدائی برداشت کی وہ۔ وہ عید کے کپڑوں اور اچھے کھانے کے لیے ترستے رہے۔'' فیاض علی جذباتی ہو کر کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ رضا اور ضیاء ندامت سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ صدیقہ بھی جوابی کاروائی کے لیے تیار تھیں۔

''جن کا باپ ہزاروں کے حساب سے ہر ماہ بھیجتا رہا مگر اس کے بچے ترستے رہے میں ان دونوں کے صدقے میں دوسرے بچوں کے اخراجات پورے کر دیا کرتا تو یہ سوچتا بھی نہیں تھا کہ میں جن کے صدقے میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں وہ چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے ترس رہے ہیں کیسی کیسی سزائیں نہیں دیں اس نے میرے بچوں کو یہ۔ یہ تو عورت کہلانے کا بھی حق نہیں رکھتی جو عورت اپنی سگی اولاد کی سگی نہ ہو تو وہ سوتیلی اولاد کو سوائے دکھوں کے دے بھی کیا سکتی ہے۔ ظالم جلاد عورت۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت۔''

''خدا کے لیے فیاض آگے مت کچھ کہنا میرے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھو اس بڑھاپے میں یہ داغ نہ لگاؤ ہماری عزت کا خیال کرو مانا کہ تم درست کہہ رہے ہو مگر میرے بھائی۔'' ضیاء نے فیاض علی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''کوئی ضرورت نہیں اس بھیک کی جو کرتا ہے کرنے دیں مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ میں اگر سگی اولاد کی نہیں تو اس لیے کہ وہ اس شخص کی بیٹی تھی جس سے مجھے نفرت تھی اور محبت تو مجھے تم

سے بھی نہیں فیاض علی۔'' سختی اور نفرتوں نے ان کی صورت انتہائی مکروہ بنادی تھی۔

''صدیقہ تم ایک دن نفرت کی قبر میں اتر جاؤ گی اور ہمیشہ جلتی رہو گی معافی مانگ لو میری بہن مت برباد کرو اپنا گھر۔''

''آپی پلیز خدا کے لیے کسی کے لیے نہ سہی اپنے لیے' اپنی ذات کے لیے۔''

دونوں بھائی صدیقہ کو سمجھا رہے تھے جو اپنی انا کے بت کی پجاری بنی ہوئی تھیں۔

''کیوں کس لیے مجھے کسی کی ضرورت نہیں کوئی گھر نہیں چاہیے مجھے۔'' وہ اس طرح ہٹ دھرمی سے بولیں۔

''ٹھیک ہے میں اس چڑیل کے ساتھ نہ خود رہ سکتا ہوں اور نہ اپنے بچوں کو چھوڑ سکتا ہوں اور آپ کی خاطر میں اسے طلاق بھی نہیں دے رہا لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنے بچوں کو لے کر لندن سیٹل ہو جاؤں گا۔ یہ میرا قطعی اور آخری فیصلہ ہے۔ اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں میں اس کے لیے بس یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے بچوں کے صدقے میں یہ گھر اس کے نام کر دوں ہم کل اسلام آباد چلے جائیں گے اور وہاں سے لندن ہمیشہ کے لیے' ہو سکے تو آپ لوگ مجھے معاف کر دیں آپ جیسے شریف لوگوں کے ساتھ مجھ سے زیادتی ہوگئی ہے اس کا مجھے دکھ رہے گا مگر میں مجبور ہوں۔'' فیاض علی انتہائی دکھ کے ساتھ بول رہے تھے ان دونوں بھائیوں کے سر جھکے جا رہے تھے۔

''چلو صدیقہ گھر چلو شاید کسی شوہر کا گھر تمہارے نصیب میں نہیں۔'' ضیاء بھرائی ہوئی آواز میں بولے ان کو شاید صدمہ پہنچا تھا۔

''نہیں جاؤں گی ہرگز نہیں کہیں بھی اور نہ ہی اس کے بخشے ہوئے گھر میں رہوں گی۔''

''پھر کہاں رہیں گی آپی آپ؟'' رضا نے صدیقہ کے ہاتھ تھام لیے۔

''کہیں بھی رہوں تم لوگوں کو کیا چلے جاؤ یہاں سے سب نکل جاؤ فیاض علی اپنے بچوں سمیت اور تم دونوں بھی نکل جاؤ۔'' وہ جذباتی انداز میں چلائیں وہ بھوکی شیرنی لگ رہی تھیں ان کا بس چلتا تو اپنے بھائیوں سمیت سب کو بھنبھوڑ کر رکھ دیتیں نفرت کے زہر نے ان کے حواس چھین لیے تھے۔ ضیاء اور رضا دکھتے دلوں کے ساتھ باہر نکل آئے۔

''انکل خط حیدر کو دے دیجئے گا۔ ملاقات تو اب اس سے ہو نہیں سکتی۔'' روفی نے ایک خط رضا کی طرف بڑھایا تو انہوں نے خاموشی سے جیب میں ڈال لیا۔

''خدا حافظ فیاض علی' ہمیں معاف کر دینا۔ اچھے بیٹے۔''

''پھر ضیا اور رضا ان سے مل کر رنجیدہ سے چلے گئے رضا نے خط حیدر کو دے دیا۔

''حیدر بھائی! ہمارے رشتے بھی عجیب تھے ہماری زندگیاں بھی عجیب انداز میں گزریں کہ ہم ایک دوسرے

کو سمجھ نہیں پائے۔ میں تمہیں غلط سمجھتا رہا مگر تم اندر سے بہت اچھے انسان ہو ایک وضاحت کرنی تھی وہ یہ کہ تمہیں شاید یہ غلط فہمی تھی کہ میں اور شفق ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں نہیں حیدر شفق بہت اچھی لڑکی ہے وہ ہم دونوں کی بہن بنی ہوئی تھی اور اس نے واقعی بہنوں جیسی ہمیں محبت دی اور ہمیں بھی وہ بہت عزیز تھی ہماری چونکہ بہن نہیں تھیں اس لیے وہ بہت اچھی لگتی تھی مگر تمہاری غلط فہمی کے باعث میں اس کا زیادہ خیال نہیں رکھتا تھا اب جاتی دفعہ بھی اسے نہیں مل پائے مختصر یہ کہ زندگی کے سفر میں اسے ہی ہمسفر بنانا اور جب بناؤ تو مجھے اطلاع ضرور دینا کہ میں اپنی بہن کو دعائیں نذر کروں۔ اجازت دو۔

تمہارا دوست

''روفی''

خط پڑھ کر حیدر کا سر شرم سے جھک گیا انسان بھی کیا چیز ہے جانے پرکھے بغیر قیافوں کی بنیاد پر ایسی ایسی باتیں کر جاتا ہے جن کا وجود ہی نہیں ہوتا اس لیے حکم ہے کوئی بات تحقیق کے بغیر نہ کہو۔ فیاض علی اپنے بچوں کے ساتھ لندن سیٹل ہو چکے تھے اور صدیقہ بیگم اپنی تمام تر نفرتوں' انا اور ہٹ دھرمی کے زنداں میں تنہا رہ گئی تھیں۔ تنہائی اور سب سے لاتعلقی کے ناگ ان کو ڈستے رہتے مگر انا کی ماری صدیقہ بیگم کسی کو اپنی طرف نہیں بڑھنے دیتی تھیں سارا نے بارہا کوشش کی کہ ان کے ساتھ رہے یا وہ ان کے ساتھ رہیں مگر انہوں نے بری طرح دھتکار دیا۔

''نہیں ہے مجھے کسی کی ضرورت تم لوگ مجھے نیچا دکھانے کے لیے ایسا کرتے ہو کوئی نہیں ہے میرا' نفرت ہے مجھے سب سے میں کیوں کسی کا حکم مانوں پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے کیا۔''

اپنی انا کے دیوتا کو خوش رکھنے کے لیے صدیقہ بیگم نے اپنی ساری محبتیں سارے رشتے اس دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیے تھے۔ تنہائی سے اپنی ضد' اپنی انا سے آخر کب تک وہ لڑتیں' برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے آہستہ آہستہ ان کے حواسوں نے کام کرنا چھوڑ دیا' وہ نیم پاگل سی ہو گئیں کبھی چلانے لگتیں کہ۔

''مجھے ساری دنیا سے نفرت ہے کوئی نہیں ہے میرا۔'' کبھی ہنستے ہوئے کہتیں۔

''مجھے محبت ہے سب سے' سب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس سے قبل کہ لوگ ان کو پتھر مارتے ضیاء بھیگی آنکھوں سے انا کی ماری بہن کو گھر لے آئے جس کے نصیب میں واقعی

کسی شوہر کا گھر نہیں تھا شیریں اور سارا ان کا ہر وقت خیال رکھتیں سارا روتی بھی جاتی اور ان کا کام بھی کرتی۔

''ماں حواس کھونے سے پہلے ایک بار بیٹی کہہ کر میری پیاس تو بجھا دی ہوتی۔'' سارا ان کے سر پر تیل ڈال کر رو پڑی تو صدیقہ چونک گئیں۔

''ارے کیوں رو رہی ہے ہاں تو میری بیٹی ہے کس نے چھین لیا تھا تجھے مجھ سے۔ میری بیٹی آ میرے سینے سے لگ جا۔'' پھر انہوں نے سارا کو سینے سے لگا لیا تو سارا کو لگا جیسے صدیوں کی پیاس بجھ گئی ہو وہ کڑی دھوپ سے ٹھنڈی چھاؤں میں آ گئی ہو۔

''حواس سے تو بدحواسی ہی بہتر کم از کم بیٹی تو کہہ دیا امی آپ نے۔'' ابھی سارا لطیف احساس کو محسوس بھی نہیں کر پائی تھی کہ انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کر دیا۔

''کون ہو تم یہاں سے چلی جاؤ نفرت ہے مجھے سب سے تم سب سے جاؤ چلی جاؤ۔'' انہوں نے سارا اور شیریں کو دھکے دے کر باہر نکال دیا اور پھر اپنے بندھے ہوئے بال بکھرا کر ہاتھوں سے نوچنے لگیں سارا روتی ہوئی شیریں کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔

وہ لوگ جو زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے اپنی انا اور ضد کے دیوتا کو پوجتے رہتے ہیں۔ کسی معاملے میں کمپرومائز نہیں کرتے صرف اپنے آپ کو اپنی خوشی کو اہمیت دیتے ہیں نفرت کو اپنا شعار بناتے ہیں جو مردوں کی زندگی میں زہر گھولتے ہیں ان کا انجام صدیقہ بیگم سے قطعی مختلف نہیں ہوتا صدیقہ اب روگِ مسلسل تھیں آخر کب تک اس کا سوگ مناتے رضا اب حیدر کی شادی کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے شفق ہی ان کو پسند تھی۔

''کیوں شیریں بیگم آپ کو اپنے بیٹے کا کچھ خیال ہے کہ نہیں؟'' کیوں جی خدا سلامت رکھے کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو۔'' شیریں ان کو کافی کا کپ دیتے ہوئے بولیں۔

''بھئی ہونا کیا ہے اسے البتہ مجھے آج کل شفق بیٹی بہت یاد آ رہی ہے بھئی بنا لو اسے بہو بڑی اچھی بیٹی ہے میری بیٹی۔ اپنے بیٹے کی دلہن بنا لو۔'' رضا بہت خوشگوار موڈ میں بول رہے تھے۔

''میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا میں تو اپنے بیٹے کے لیے چاند سی دلہن لاتی مگر اب آپ کہہ رہے ہیں تو غور کروں گی۔'' شیریں کے لبوں پر بھی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کھیل گئی۔

''بڑی مہربانی مسز رضا آپ کی کہ آپ نے ہمیں اپنے لیے پسند کیا اور اپنے بیٹے کے لیے ہماری بیٹی کو قبول کیا۔'' رضا بہت خوش اور مطمئن ہو گئے۔

''خدایا تیرا اس قدر شکرانہ۔ میں ادا نہیں کر سکتا۔ شیریں میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں بھی اس طرح پرسکون زندگی گزاروں گا یہ بس اللہ تعالیٰ کی عنایت اور تمہاری وجہ سے ہوا ہے ورنہ تو۔''

''یہ صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے رضا ورنہ میں کیا کر سکتی تھی۔''

''گھر میں حیدر اور شفق کی بات پھیل گئی تھی۔ سب بہت خوش تھے اور حیدر کو چھیڑ رہے تھے۔

''اب جناب اس سے بھی معافی مانگنا۔ بہت بدتمیزیاں کی ہیں تم نے اس کے ساتھ۔'' یاسر نے اسے یاد دہانی کرائی۔

''کیوں بھئی معافی کس سلسلے میں اول درجے کی بدتمیز تو وہ خود تھی ہر گولی کا جواب تو میزائل سے دیتی تھی برابر کا مقابلہ کرتی تھی حساب برابر تھا تو معافی کیوں مانگوں اس سے یہ احسان کیا کم ہے کہ اس سے شادی کر رہا ہوں۔'' وہ اکھڑ پن سے اس کی غیر موجودگی میں اس پر احسان جتا رہا تھا۔

اور پھر شفق کے گھر بائیک لے کر چپکے سے آ گیا شفق اپنے کمرے میں تھی اس نے ہلکا سا ناک کیا اور اجازت لینے سے پہلے اندر آ گیا۔ شفق پر پہلے تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے مگر پھر شیریں اور رضا کی آمد کا سوچ کر وہ چپ رہی البتہ منہ کھڑکی کی طرف کر کے کھڑی ہو گی۔

''اے عزیز دشمن کیا حال ہے چپ سی ہو کہ مرتی ہو میرے فراق میں؟'' وہ شوخی سے بولتا اس کے سامنے آ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''تم میرے کمرے میں کیوں اور کیسے آئے؟'' اندر کہیں دھڑکنیں شوخ ہو رہی تھیں مگر وضع داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور کچھ بدلہ بھی تو لینا تھا۔

''کیوں اور کیسے اچھا سوال ہے آیا تو ٹانگوں سے ہوں اور کیوں تو ظاہر ہے تمہیں دیکھنے آیا ہوں اتنے دنوں سے دیکھا جو نہیں تھا اور یہ بھی دیکھنے آیا تھا کہ میرے ہجر میں تمہارا کیا حال ہے؟''

''بکومت۔'' وہ اس کی شوخ باتوں سے رخساروں پر چھلک آنے والی سرخی کو چھپاتی ہوئی بولی۔

''لڑکی ادب احترام سیکھو اب گو کہ تمہارے بس کا روگ نہیں مگر یاد رکھو مجھے باادب قسم کی لڑکیاں پسند ہیں سمجھیں۔'' وہ رعب ڈال رہا تھا۔

''دیکھو حیدر تم میرے گھر میں آئے ہو اس لیے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ اس لیے تم خود'' وہ ذرا سختی سے بولی تا کہ وہ چلا جائے اگر کوئی آ گیا تو کیا خیال کرے گا۔

''ارے بڑے دماغ ہو گئے ہیں ایک تو میں ماضی کی تمہاری تمام گستاخیاں فراموش کر کے آیا ہوں اور دوسرے وہ تو تمہارے بھائی نے بھی سفارش کر دی تھی کہ تم کر لینا شادی ورنہ اس کو کون پوچھے گا ورنہ میں کوئی اتنا اعلیٰ ظرف نہیں تھا کہ خود چلا آتا۔''

''کون سا بھائی؟'' شفق نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”اچھا بھول گئیں لکھوں اسے روفی اور کون۔“ وہ کاٹ کھانے کو دوڑا۔

”اوہ روفی۔ مگر میں یہ پسند نہیں کرتی کہ میں کسی کے کہنے پر تم پر مسلط کر دی جاؤں۔“ شفق کو بھی غصہ آ گیا اس کی بات پر۔

”تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے پسند نہیں کرتیں اس بات کو آڑ بنا رہی ہو صاف کہہ دو میں ابھی مما اور پپا کو منع کر دیتا ہوں۔“

جی ہاں! ہاں حقیقت یہ ہی ہے کہ میں آپ کو قطعی پسند نہیں کرتی اور آپ میں ایسی خوبی بھی کیا ہے کہ کوئی اچھی لڑکی آپ کو پسند کرے گی اور یہ آپ کو اطلاع کس نے دی کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں اور آپ اپنا پروپوزل لے کر چلے آئے مسٹر حیدر رضا اتنی خوش فہمی بھی اچھی نہیں ہوتی کہ خود کو وقت کی سلطنت کا حکمران سمجھا جائے کہ جب دل چاہا نفرت کر لی جب دل چاہا محبت کر لی...... نو...... نیور مسٹر حیدر بہت ہو گئی۔ جایئے اور اپنی بدتمیزیوں کی سزا بن کر لوٹ جایئے...... ضروری نہیں کہ وقت کی باندی ہمیشہ آپ کے حکم کی غلام رہے...... میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی سمجھے آپ۔“

شفق کی نظروں میں بچپن سے جوانی تک کے وہ سین گھوم گئے جن میں حیدر نے اس کی پیاری خالہ جانی کو اذیت پہنچائی تھی خود اس کی ہر وقت انسلٹ کی تھی اور آج وہ ڈرامائی ہیرو بن کر مہکتے گلشن کے پھولوں پر اپنا نام درج کرنے آ گیا ہے اور یہ بات شفق کو گوارہ نہیں تھی اس نے انتہائی دکھ و نفرت سے حیدر کو دیکھا جس کے وجیہہ چہرے پر دکھ زدہ تحیّر تھا کہ وہ جس لڑکی کو شروع سے چاہتا چلا آ رہا تھا اور مما سے نفرت کی سزا وہ اسے بھی دیتا تھا مگر یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ مما کو دکھ دے کر تو اسے بہت سکون ملتا تھا مگر جب ان کی وجہ سے شفق روتی تو اس کو اس کے آنسو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہوتے تب اس لمحے کے کرب میں چھپی وہ اس کے لیے اپنی محبت اور کسک کو خود سے چھپا نہیں سکتا تھا اور آج جب کہ تمام اختلاف دور ہو گئے تھے نفرتوں کی دھند چھٹ چکی تھی خوشیوں کی سنہری نکھری دھوپ میں سب کچھ تھے تو۔ تو شفق نے کس سفاکی سے اس سے خوشی چھین لی تھی وہ میری حیرت زدہ دکھ کا درد لیے اسے دیکھے گیا کتنی عزیز کتنے قریب تھی وہ اس کے جو اس وقت حقارت نفرت کی تپش لیے اتنی ہی دور اجنبی بنی کھڑی تھی ایک ٹیس سی حیدر کے دل میں اٹھی وہ آہستگی سے آگے بڑھا اور خفا خفا سی شفق کو دونوں شانوں سے جیسے ہی تھامے لگا جیسے شفق کو کرنٹ لگا ہو وہ اچھل کر پیچھے ہٹی۔

”ڈونٹ ٹچ می۔ آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ......!“ ...... وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی شدتِ غم و غصے سے شفق کا حسین چہرہ سلک اٹھا تھا...... حیدر تو بے بسی سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا ”محبت میں حق نہ چھینے جاتے ہیں شفق نہ حقوق کی بھیک مانگی جاتی ہے محبت کے اعزاز کا تو انسان خود بدخود غیر محسوس انداز میں حقدار بن جاتا ہے۔ دیکھو تمہارا غصہ خفگی بجا سہی تم مجھ

سے بدگمان سہی مگر پلیز تم ایسا نہ کرو دیکھو پہلے میں بدگمانی کی دھند میں تھا اور آب تم بدگمانی کی دھند میں کھڑی ہو۔ دیکھو شفق ابھی سے اس دھند سے باہر آ جاؤ کیونکہ اس راستے کی کوئی منزل نہیں ہوتی انسان بدگمانی کی خورد جھاڑیوں سے الجھ کر رہ جاتا ہے اسے کوئی منزل نہیں ملتی پلیز لوٹ آؤ۔ دیکھو خوشیوں کی سنہری سحر اپنے دامن میں انوکھی خوشیوں کے اُجالے لیے ہماری منتظر ہے آگے بڑھو اور ان کو اپنا لو شفق آؤ ہم ایک ساتھ خوشی کی سحر کو خوش آمدید کہیں آؤ۔ بدگمانی کے دھند میں خود کو نہ مٹاؤ آؤ۔“

وہ حیدر جو اس قدر اکھڑ خود سر تھا جس نے بہکاوے میں آ کر جو وقت نفرت میں برباد کیا تھا وہ اب اس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نفرت کے عذاب کو بھگت چکا تھا اک عجیب طرح کے کرب کے نشتر تھے جو ہر وقت سلگتے دل پر لگتے رہتے درد میں اضافہ کرتے رہتے اسی لیے اب وہ ان کی چھبن کو دوبارہ محسوس کرنا نہیں چاہتا تھا اس نے شفق کی نفرت کو اگنور کرتے ہوئے بڑی محبت سے اس کا نرم مگر سرد ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا تو شفق نے اسی انداز سے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔

”ہونہہ! محبت کیسی محبت کہاں کی محبت آپ جیسا خود پرست محبت کرنا یا اسے محسوس کرنا کیا جانے بہت اجنبی لگا ہے یہ لفظ آپ کے ہونٹوں پر۔ ہونہہ محبت۔ رہی بات بدگمانی کی دھند کی تو واضح کر دوں میں کسی قسم کی بدگمانی کا شکار نہیں نہ ہی اس کی دھند میں ہوں۔ الحمد اللہ میں آج بھی سچائی اور حقیقت کی روشنی میں کھڑی ہوں مجھے ہمیشہ کی طرح آج بھی سب کچھ شفاف اور واضح نظر آ رہا ہے!“ ...... وہ نفرت سے اسے دیکھتی باہر کی جانب جانے کے لئے مڑی تو حیدر غصے اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

”تم! اگر سچائی اور حقیقت کی روشنی میں کھڑی ہو تو میں تمہیں نظر کیوں نہیں آ رہا۔ نظر نہیں آ رہا کہ جان بوجھ کر میری حیثیت کو قبول کرنا نہیں چاہتیں اس سچائی کو تسلیم نہیں کرنا چاہتیں۔ میں ماضی کی دھند نہیں شفق حال کی سچائی ہوں اور جو حال کی سچائی سے نظریں چرائے اسے اہم اہل نظر نہیں کہتے۔“

اسے مناتے مناتے قائل کرتے کرتے وہ تھکنے سا لگا تھا جبکہ شفق کی نفرت رعونت برقرار تھی تسلیم و رضا کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔

”نہیں کہتے تو نہ کہیے آپ کے کہنے کی پروا کس کو ہے۔“

شفق انتہائی اجنبیت اور رکھائی سے بولی تو حیدر کی ہمتیں ٹوٹنے لگیں اس نے تو آج تک دل توڑنا ہی سیکھا تھا دل ٹوٹے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے اس درد آشنائی نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ شفق نے اتنا کچھ کہہ دیا تھا کہ اب مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی...... وہ شکستہ قدموں سے واپس لوٹا تو شفق اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی کل کا ہلاکو خان کسی کی عزت محبت

کو خاطر میں نہ لانے والا یہ شخص آج کتنا نڈھال تھا بے دم تھا دھواں دھواں چہرے کو اندر کے کرب کی دھند میں چھپاتا ہوا یہ حیدر شفق کے اندر سلگتی آگ کو ٹھنڈا کر گیا۔ اس نے تو باقاعدہ دُعائیں مانگیں تھیں کہ دوسروں کو دکھ دینے والا بھی کبھی دکھ آشنا ہو دوسروں کو تڑپانے والا بھی کبھی تڑپے آج وہ سیل وہ منظر اس کی نظروں کے فریم میں تھا تو اک عجیب طرح کا سکون اس کے اندر اتر رہا تھا۔

''آپ۔ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرنے آئے ہیں ناں حیدر صاحب اور اب اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کرنے آئے ہیں۔ کیا خوب ادا ہے آپ کی کہ آپ ہر بازی جیت لینا چاہتے ہیں لیکن یہ زندگی کا میدان ہے حیدر صاحب اور زندگی توازن کے اصولوں پر چلتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ اپنی انا کے لیے دوسروں کی انا کو ہرٹ کرتے رہیں کرتے رہیں اور جب اپنی انا کی تسکین ہو جائے تو دوسروں کی طرف دوستی کا رشتے کا ہاتھ بڑھا دیں۔ نہیں ایس انہیں ہوتا۔۔ میں وہی شفق ہوں حیدر صاحب جس کو آپ نے صرف اپنی مما کی بھانجی ہونے کی سزا دی کب اور کہاں آپ نے میری انا کو ہرٹ نہیں کیا۔ میرے اور روفی کے درمیان پاکیزہ جذبے کو میلی نظر سے دیکھا آپ نے میرے کردار پر شک کیا آپ نے اور اب۔''

شفق کو وہ تمام پرانی باتیں شدت سے رولا گئی اس کے آنسو حیدر کے دل پر گرتے رہے اس نے شدت سے چاہا کہ ان انمول آنسوؤں کو اپنی پلکوں پر سجا لے مگر وہ اپنے تمام حقوق اپنی کم ظرفی سے گنوا چکا تھا اس کے پاس تو اتنا حق بھی نہیں رہا تھا کہ اس سے معافی ہی مانگ لیتا۔

''ٹھیک ہے شفق میں نے تمہیں غلط سمجھا مگر روفی کے خط نے میری ساری غلط فہمی دور کر دی۔'' اس نے ٹوٹے لہجے میں اس کی عدالت میں اپنی وکالت کی مگر کمزور دلیل شفق کو تپا گئی۔

''جی یہیں سے۔ یہیں سے تو بے اعتباری کا سفر شروع ہوتا ہے آپ نے میری اور روفی کی سچائی کو نہ سمجھا نہ مانا اب جبکہ روفی نے میری اور اپنی سچائی کو لفظوں پیراھن دے دیے تو آپ کو یقین آگیا کہ ہم بے قصور ہیں ہمارے درمیان پاکیزہ جذبہ ہے۔ بہت کھوکھلے ہوتے ہیں وہ لوگ جو لفظوں پر اعتبار کرتے ہیں اس لیے کہ لفظ کہیں کہیں جھوٹ بھی بول جایا کرتے ہیں۔ اہل شعور لوگ لفظوں کے پیچھے نہیں بھاگتے وہ سچائی کو محسوس کرتے ہیں' مانتے ہیں لیکن آپ جیسے خود پرست لوگ جذبوں کی لطافتوں کو کیا جانیں آپ جیسے کھوکھلے لوگ دھند میں سفر پر نکلتے ہیں اور گہری دھند کے مسافر اکثر حادثے کا شکار ہو جایا کرتے ہیں اور آپ بھی۔''

شفق نے پلٹ کر دیکھا وہ جانے کب جا چکا تھا لیکن ہلتے پردے کی لہریں بتا رہی تھیں کہ

جانے والا ابھی' ابھی نکلا ہے اور وہ جو ایک عرصے سے اس سے خفا تھی اور چاہتی تھی کہ اس کے میزائل کے جواب میں اس پر بم گرا دے وہ جس سے اسے بے شمار شکایات تھیں مگر یہ شکایات بے زبان رہیں خالہ جانی کی وجہ سے وہ خود پر کنٹرول کرتی اپنے احساسات پر ضبط کے پہل باندلیتی اسے کھری کھری سنانے کی حسرت لیے اپنے گھر آ گئی تھی مگر اک کسک تھی کہ اس نے اسے کچھ کہا نہیں لیکن پھر یہ کیا تھا آج اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی جواباً اسے بے زبان اور نادم دیکھنا چاہتی تھی اور آج جب برسوں سے لگی دل کی آگ بجھ گئی تھی برسوں کی جنگ آج ختم ہو گئی تھی تو پھر دل بجھا بجھا سا کیوں تھا یہ کون سی انجانی خلش نے جنم لے لیا تھا یہ کیسی بے قراری کا دھواں تھا جو آنکھوں میں چبھنے لگا تھا یہ کیا کھو دینے کی ٹیس دل میں ابھر رہی تھی وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی گیٹ سے نکلتے حیدر کو دیکھتی رہی اس کے قدموں کی شکستگی اس کے اندر اترتی چلی گئی یہ وہ شخص ہے جو اس کی پلکوں پر اترنے والا پہلا خواب تھا اس کی دھڑکنوں میں پیار کا پہلا احساس تھا یہ شخص اس کی زندگی کا پہلا شخص تھا وہ جس کی ایک نگاہ التفات کے لیے اس نے بارہا دُعائیں مانگی تھیں وہ جس کو اس نے بڑی تمناؤں سے چاہا تھا وہ جس کو اس نے خود سے بھی چھپ کے دیکھا تھا سوچا تھا آج۔ آج وہ شخص وہ ستم گرم اس کا ہونے کو آیا تھا اس کا بننے اور' اور اسے اپنانے آیا تھا اور اس نے محض اپنی انا کی تسکین کے لیے اسے خالی دامن لوٹا دیا اپنی ایک ایک کسک کا بدلہ لے لیا تھا اس نے اس کی زیادتیوں کو شمار تو نہیں کیا تھا مگر اس سے حساب بھی بے شمار لے لیا تھا۔ اس کی ان حرکتوں کی ایک وجہ تھی مگر اس نے تو بے وجہ ہی اسے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ جو اس کا آئیڈیل تھا وہ اکثر سوچا کرتی تھی کاش یہ شخص کبھی اس کا ہو سکے اور آج جب وہ اس کا ہونے کو آیا تھا تو اس نے اسے خالی دامن لوٹا کر' نامراد لوٹا کر اس کی ہر زیادتی کا بدلہ لے لیا تھا تو پھر اپنی فتح کا جشن منانے کی بجائے دل کے آنگن میں سوگ کی فضا کیوں تھی۔ دل خوش کیوں نہیں ایک بے نام سی بے رخی کیوں ہو رہی تھی۔ کیوں دل و دماغ میں جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ وہ نجانے کب تک اس جنگ کا منظر دیکھتی کب تک اسے اپنے دل اور گھر سے نکلتے ہوئے دیکھتی کہ آنکھ میں پھیلتے کاجل کی دھند میں اس کے جانے کا منظر دھندلا گیا وہ بستر پر گر کر شدتوں سے رو دی یہ کیسی جیت تھی جو خوشی دینے کی بجائے دکھ دے گئی تھی کبھی کبھی انا ہی محبت سے جیت جاتی ہے لیکن یہ جیت کتنی بے رنگ ہوتی ہے' کتنی بے قراریاں سمیٹ لاتی ہے یہ کوئی شفق سے پوچھتا۔

♥ ♥ ♥

شفق کے رویے اور انکار نے حیدر کو توڑ کر رکھ دیا تھا وہ جو بڑے ارمانوں سے اسے پرپوز کرنے گیا تھا وہ جو آج شفق کے خوبصورت چہرے پر اپنے نام کی حیا کی سرخی دیکھنے گیا تھا خوشیوں سے دامن بھرنے گیا تھا خالی دامن کے سناٹے لیے آگیا تھا۔

''شفق یہ تم نے کیا کیا معاف کر دیتی تو اچھا تھا مگر تم نے بھی ایک ایک بات کا ایسا انتقام لیا ہے کہ۔ کہ نہیں شفق تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میری زندگی میں تو تم ہی تم تھیں شفق مانا کہ مانا کہ ماضی میں میرا کردار اچھا نہیں رہا لیکن کیا ضروری تھا کہ تم۔ نہیں شفق میں جانتا ہوں تم۔ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں روفی نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم مجھے۔ کتنا چاہتی ہو پھر یہ۔ شفق تم بن یہ زندگی کیسے گزر سکتی ہے میں نے تو ہوش سنبھالتے ہی نفرتوں کو دیکھا محسوس کیا بچہ تو سادہ کاغذ ہوتا ہے جس پر بڑے جو تحریر درج کر دیتے ہیں وہ اس کو اپنی زندگی جان لیتا۔ پھپھو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا پھپھو آپ نے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لی ہے۔ پھپھو یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔''

حیدر آج زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہار کر آیا تھا اس سے ضبط نہیں ہوا تو تکیے میں منہ چھپا کر جانے کب تک اپنی محبت کی قبر پر ماتم کناں رہتا کہ دروازے پر دستک نے اسے جلدی سے چہرہ صاف کرنے پر مجبور کر دیا وہ تیزی سے واش روم میں گیا ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے دستک دینے والا مسلسل ناک کر رہا تھا وہ باہر نکلا تو لیہ منہ پر ڈالے دروازے تک آگیا۔

''واش روم میں تھا یار۔ تم۔''۔ وہ بغیر دیکھے بولے گیا تو لیہ منہ پر سے ہٹایا تو سامنے اپنے دوست ہم راز' ہمدرد یاسر کو دیکھ کر دل کے سارے زخم اس کے ہمدرد شانے میں جذب ہونے لگے ایسے جیسے اسے یاسر کا ہمدرد شانہ ہی چاہیے تھا۔

''معاف نہیں کیا اس نے مجھے یاسر چھین لیا ہے اس نے خود کو مجھ سے۔ کہا تھا اس نے کہ

وہ مجھے ایسی کڑی سزا دے گی کہ میں نہ جی سکوں گا اور نہ مر سکوں گا اور خود کو مجھ سے چھین کر اس نے مجھے واقعی ایسی ہی سزا دے دی ہے اس کے بغیر جینا کسی سزا سے کم ہے کیا۔''

حیدر کے دل کا درد اس کے شکستہ لہجے میں ڈھلا تو یاسر تڑپ اٹھا اس نے خود شفق کو اپنی کسی دوست سے باتیں کرتے سنا تھا کہ وہ حیدر کو بہت چاہتی ہے اور اس کے بغیر جینے کا تصور بھی اس کے لئے محال ہے تو آج جب حیدر خود اس کا طلب گار بن کر اس کے در پر گیا تھا اس نے عمر بھر قید کی سزا دینے کی بجائے عمر بھر کی جدائی دامن میں ڈال دی تھی تو وہ بکھر بکھر گیا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا حیدر میں شفق کو جانتا ہوں اس نے یقیناً مذاق کیا ہو گا تم نے جو اسے اتنا ستایا تھا تو اس نے بھی اب تمہیں ستانے کا پروگرام بنایا ہو گا ایسا کچھ نہیں ہے حیدر وہ تمہیں بہت چاہتی ہے پسند کرتی ہے ڈونٹ وری میں اسے سمجھاؤں گا کہ اپنے مجنوں کا یوں امتحان نہ لے۔ میں آتا ہوں اس سے بات۔!

یاسر تو کم از کم یہ ہی سمجھا تھا کہ شفق اسے تنگ کر رہی ہے مگر وہ نہ تو شفق کے کرب کا اندازہ لگا سکا تھا جو اس پر حیدر کی وجہ سے گزرا تھا اور نہ ہی ان تاثرات کو دیکھ سکا تھا جن کے آئینے میں حیدر کو اپنی اوقات بڑی واضح نظر آگئی تھی۔

''ہرگز نہیں تم۔ تم اس سے کوئی بات نہیں کرو گے یاسر میں اس کے فیصلے کے پل صراط سے گزر چکا ہوں۔''

یاسر جو شفق کو فون کرنے جا رہا تھا حیدر نے تیزی سے جا کر اسے پکڑ لیا۔ تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کم آن حیدر بات کرنے میں ہرج کیا ہے ہو سکتا ہے تم اسے نہ سمجھ رہے ہو تم دونوں کا تو پرابلم بھی یہ رہا ہے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دل میں دونوں ایک دوسرے کے لیے مرتے ہو اوپر سے۔ لیکن اب میں تم دونوں کو ایسا فیصلہ نہیں کرنے دوں گا کہ دونوں دریا کے کنارے بن کر رہ جاؤ ایک دوسرے کو حسرت سے دیکھتے ہو مگر مل نہ سکو میں شفق سے ضرور بات کروں گا۔ وہ میری بات نہیں ٹالے گی۔''

یاسر نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ان دونوں کی ایک نہیں سنے گا دونوں کو آمنے سامنے بیٹھا کر بات کرے گا۔

''قطعی نہیں اب میں اتنا بھی کمزور نہیں کہ اس کے بغیر جی نہ سکوں تمہارا کیا خیال ہے اب تم جا کر اس سے میرے لیے محبت کی ساتھ کی توجہ کی بھیک مانگو گے۔ ایکسیکوزمی محبت اعزاز ہے خیرات نہیں۔ اور میں خیرات میں ملی ہوئی محبت اور خوشیوں کے ساتھ نہیں جی سکتا۔ تم نے اس کا انداز اس کے الفاظ نہیں سنے اس کی نفرت کی دھند میں تم اترتے نہیں ناں اس لیے ایسی بات کہہ رہے ہو تم۔''

''تمہاری! یار اور میری سمجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے حیدر تم کو اس کی مسکراہٹ بہت پسند ہے بقول تمہارے یہ دوسری مونالیزا ہے مسکراہٹ کے اعتبار سے...... مگر تم نے کبھی اس کی نمائشی مسکراہٹ جو وہ اپنی خالہ کی عزت کا بھرم رکھنے اور اپنی انا کا بھرم رکھنے کے لئے سجائے رکھتی تھی اس مسکراہٹ کی اوٹ میں چھپی بے بسی' سسکیاں نہیں سنیں اس کی گہری آنکھوں کے بھیگے کناروں کی نمی نہیں دیکھی جو بھری محفل میں بمشکل ضبط کا بھرم رکھ پاتی تھی جب تم اس کی ان کیفیات کو نہیں سمجھ سکے تو اب تم کیسے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ اٹل اور حتمی ہے۔'' یاسر کو نجانے کیوں یقین تھا کہ شفق نے اسے تنگ کرنے کے لیے اسے یہ سب کہا ہے جبکہ حیدر شفق کے چٹانوں جیسے سخت لہجے کی ساری سختیاں اپنے حزیں دل میں سمیٹ لایا تھا۔

''کچھ بھی سہی میں اس سے ضرور بات کروں گا یہ کیا بات ہوئی۔''

یاسر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور میز پر سے گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ دروازے کی طرف ہی تھا کہ حیدر تیزی سے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اور چابی چھین لی۔

تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم رو گڑگڑا کر اس سے میری خوشیوں کی بھیک مانگوں گے اور میں بڑی خوشی سے سب قبول کرلوں گا نو۔ نیور مانا کہ میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے مگر اب جبکہ میں نے دل سے معذرت کرلی ہے تو۔ ہونہہ مروں گا نہیں اس کے بغیر۔''

اور پھر حیدر نے یاسر کو شفق سے بات کرنے سے منع کر دیا تو یاسر نے ساری بات شیریں کو بتا دیں وہ جو ہر بات سے بے خبر یہ سمجھے ہوئے تھیں کہ اب سارے حالات ٹھیک ہو گئے ہیں حیدر اور شفق کے اختلافات بھی ختم ہو گئے ہیں تو وہ اب باقاعدہ شفق کا پروپوزل لے کر جائیں گے مگر یاسر کی بات نے تو انہیں پھر بہت پیچھے پھینک دیا تھا۔

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں ہوسکتا اب تو اختلاف کی کوئی بات رہی ہی نہیں دونوں سر پھیرے تو ہیں ہی خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہوں گے ایک دوسرے کو۔'' شہریں کو بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

''نہیں آنٹی یہ مذاق نہیں' میں بھی یہ ہی سمجھا تھا مگر دونوں بری طرح ایک دوسرے سے خائف ہیں حیدر کا کہنا ہے کہ وہ خود گیا تھا اسے منانے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگی مگر شفق کسی طور پر تیار نہیں ہوئی۔ اور حیدر کو تو آپ جانتی ہیں کتنا انا پرست ہے اب تو وہ بھی شفق کا نام لینا نہیں چاہتا اور۔'' یاسر نے شیریں کو ساری ڈیٹل دی تو وہ پریشان تو ہوئی ہی تھی ان کو غصہ ہی آ گیا تھا انہوں نے زندگی کے بہت کٹھن راستوں کی سختیاں برداشت کی تھیں آج جب اس پر خدا کے فضل سے وقت مہربان ہوا تھا تو ایک نئے ایشو سے وہ گھبرا گئی۔

''شفق نے' ایسا ہے مجھے یقین نہیں آرہا وہ۔ وہ تو حیدر کو بہت پسند کرتی ہے۔ رکو میں

حیدر سے بات کرتی ہو کہ کیا بات ہوئی ہے اس کی اور شفق کی۔''

''نہں آنٹی یہ غضب مت کیجئے گا حیدر آج پرانی جون میں آیا ہوا ہے آپ تو ہرگز بھی اس سے بات نہ کیجئے گا جب وہ کہہ رہا ہے تو ایسا ہی ہوگا آپ کو معلوم تو ہے کہ وہ کتنا۔''

یاسر نے شیریں کو حیدر کے پاس جانے سے روک دیا۔

''بیٹا میں کب کہہ رہی ہوں کہ حیدر غلط بات کہہ رہا ہے مگر اس سے تفصیل پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''دیکھئے آنٹی معاملہ خاصا گھمبیر ہے آپ حیدر سے بات کرنے کی بجائے شفق سے بات کیجئے۔''

''ہاں تمہاری بات بھی درست۔۔۔ مجھے شفق ہی سے بات کرنی چاہیے چلو ابھی چلتے ہیں آپا کی طرف۔''

شیریں تو بری طرح گھبرا گئی تھیں وہ تو شادی کے خواب دیکھ رہی تھی دونوں کی' کہ یہ کیا ہو گیا۔

♥♥♥

”کیا۔ کیا آپا یہ کیسے ہوسکتا ہے شفق کو میں اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں یہ جانتے ہوئے بھی آپ نے شفق کا رشتہ ابرار سے طے کر دیا یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ جانتی تو ہیں کہ اب تو حالات ہی بدل گئے حیدر تو میرا سگی ماں سے زیادہ احترام کرتا ہے۔“

شیریں آتے ہی اپنی بڑی بہن سے الجھ پڑیں جنہوں نے شفق کا رشتہ اس کی رضا مندی سے کینیڈا میں مقیم اپنے ماموں زاد ابرار سے طے کر دیا تھا اور اس خبر سے شیریں کو تاؤ آ گیا تھا۔

”اے بھئی مجھ سے لڑنے سے کیا فائدہ جاؤ اپنی چہیتی سے پوچھو اسی نے کہا تھا کہ اس کا رشتہ وہاں کر دیا جائے میں تو خود حیران ہوں وہ تو ہمیشہ ہی ابرار کو ناپسند کرتی تھی پھر اس کے ساتھ شادی کا اقرار خاصا پراسرار سا رویہ ہے شفق کا۔“

”دماغ خراب ہے آپا شفق کا اپنی جھوٹی انا کی خاطر وہ ایسا کر رہی ہے میں مانتی ہوں ماضی میں حیدر کا رویہ جیسا بھی تھا اب اس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی ہے حالات بدل گئے ہیں وہ بدل گیا ہے تو اب یہ روٹھ بیٹھی ہے بدتمیز۔ میں جانتی ہوں وہ حیدر کو ہی چاہتی ہے پھر یہ سب وہ کیوں کر رہی ہے۔ میں ابھی پوچھتی ہوں ناں اس سے۔“

شیریں بہن سے لڑنے کے بعد شفق کے کمرے میں آ گئیں وہ بیڈ پر نیم کھڑکی سے باہر نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں خالی خالی نگاہوں سے نجانے کیا تلاش کر رہی تھی دروازہ کھلنے اور بند ہونے پر اس نے شیریں کو دیکھا تو ایک دم کمبل ہٹا کر احتراماً کھڑی ہو گئی نظریں جھکی ہوئی تھی شیریں کے چہرے کے تیور بھی تو خاصے کڑوے تھے۔

”میں نے جو کچھ سنا ہے اس میں کتنی حقیقت ہے۔

شیریں اس سے بہت خفا تھی شفق کو انہوں نے بہت پیار دیا تھا بڑے پیار سے مخالفتوں کی

آندھیوں میں ڈولتے ہوئے پالا تھا ان کو جواب دیتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا ہاتھ سن ہو رہے تھے۔

”سو فیصد۔“ ......اس نے مری ہوئی آواز میں کہا تو شیریں تلملا گئیں انہوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”کیوں۔ کیوں آخر تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تم نے ابرار جیسے لڑکے کو جس کو تم نے کبھی پسند نہیں کیا آج حیدر کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ہے۔“ کیوں کہاں ابرار جیسا مادہ پرست، خود پرست انسان کہاں حیدر جیسا۔ سلجھا ہوا قابل نوجوان!“۔

شیریں کی بات پر ایک ہلکی سی طنزیہ سی مسکراہٹ شفق کے لبوں کو چھو کر غائب ہو گئی اور دل میں ٹیس بن کر اتر گئی۔

یہ۔ یہ آپ کہہ رہی ہیں خالہ جانی آپ اس شخص کی حمایت کر رہی ہیں جس نے ماضی میں ایک پل بھی آپ کو سکھ کا سانس نہیں لینے دیا آپ اس حیدر کی بات کر رہی ہیں۔

”ہاں میں اس حیدر کی بات کر رہی ہوں جس کو اب اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی ہے وہ برائی سے پاک صاف ہو کر نکلا ہے اس نے سب سے معافی مانگ لی ہے اور مجھ سے تو وہ سگی اولاد سے بڑھ کر پیار کرتا ہے اس نے دل سے گھٹنوں کو چھو کر مجھ سے معافی مانگی ہے اور سب سے بڑی بات تو کہ گناہ کا، غلطی کا احساس جب اعتراف کے صاف شفاف پاک چشمے سے ڈھل کر نکلتا ہو نو اس کے چہرے پر گناہ کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور پھر معافی کے لیے اس کے پھیلے دامن کو دھتکارنے والے گنار گار ہوتے ہیں بیٹا حیدر دل سے نادم ہے شرمندہ ہے بار ہا اپنے گذشتہ رویوں کی معافی مانگ چکا ہے اور میں نے بھی اسے دل سے معاف کر دیا ہے......اور......“ اس کی کوتاہیوں کو دل سے کھرچ بھی پھینکا ہے۔ تم بھی اسے دل سے معاف کر دو اور اس کی زیادتیوں کو بھول جاؤ۔ دیکھو شفق جان وہ تمہیں بڑی شدت سے چاہتا ہے تم نہ ملیں تو وہ ٹوٹ جائے گا یوں بھی اس کے دامن میں خوشیوں کی کرنیں کم ہی ہیں پلیز۔“

شیریں ہر ممکن کوشش کر کے اسے منانے کی کوشش کر رہی تھیں کیونکہ شفق ان کو بہت عزیز تھی اور حیدر بھی، وہ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر شفق نجانے کیوں پتھر سی ہو گئی تھی اس کے جذبوں پر برف جم گئی تھی کہ کسی کی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔

”آپ بہت بڑے دل کی ہیں خالہ جانی بہت اعلیٰ ظرف ہے آپ کا مگر میں۔ میں شاید اتنے بلند ظرف کی مالک نہیں، میں اسے معاف تو کر سکتی ہوں مگر اس کا گذشتہ رویہ بھول نہیں سکتی جبکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ معافی کے ساتھ بھولنا بھی اتنا ہی ضروری ہے کیونکہ جب تک بھولیں گے نہیں۔ بس خالہ جانی میں۔ میں اس کی زیادتیاں بھول نہیں سکتی کیسے بھول جاؤں اپنی اور آپ کی انسلٹ جو وہ اپنے سارے خاندان کے سامنے کر دیا کرتا تھا نہیں میں۔ میں۔“

وہ سکنے لگی پھر شیریں کتنی ہی دیر اسے سمجھاتی رہی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''او کے۔جیسی تمہاری مرضی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا خون اتنا کم ظرف بھی ہو سکتا ہے اور میری تربیت اتنی خراب بھی ہو سکتی ہے کہ تمہاری سوچ تک نہیں بدل سکتی۔لیکن میری بات یاد رکھنا تم آج جس حیدر کو ٹھکرا رہی ہو کل وہی حیدر تمہارا پچھتاوا بن جائے گا کیونکہ میں تمہیں بھی جانتی ہوں اور ابرار کو بھی۔بہر حال یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے اور جب اولاد اپنے فیصلے خود کرنے لگتی تو۔وہ بزرگوں کے فیصلوں۔اینی وے خدا حافظ۔''

شیریں اسے سمجھانے کے بعد ناکام سی لوٹ گئی تھیں شفق بستر پر ڈھیر ہو گئی سچ ہی تو کہا تھا انہوں نے کہ وہ بھلا ابرار کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔اس کے آئیڈیل کے فریم میں تو حیدر ہی فٹ آیا تھا وہ اسے جانتا تھا سمجھتا تھا ہزار مخالفت کے باوجود وہ اسے سمجھتا تھا پھر۔پھر وہ زندگی کے ساحل سے لہروں کی طرح دور ہی دور ہوتا چلا گیا ایسا کیوں ہوتا ہے کبھی جو ہماری دست طلب میں ہوتا ہے جب وہ ملنے والا ہوتا ہے تو ہم اسے خود اپنے ہاتھوں گنوا دیتے ہیں محض انا کی خاطر شفق کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا جو حیدر کو معاف تو کر سکتی تھی مگر اس کی زیادتیوں بھلا نہیں سکتی تھیں اسی لیے اس نے خود کو اس سے چھین کر اسے کڑی سزا دی تھی مگر کون جانے اس نے حیدر کو سزا دی تھی یا خود کو۔اس کی منگنی بڑی دھوم سے ہوئی تھی ابرار نے اپنی حیثیت اور فطرت کے مطابق خوب ہنگامہ کیا تھا وہ شفق کو پسند کرتا تھا اور جب وہ مل رہی تھی تو جشن بھی نہ مناتا۔

''ارے بھئی یہ ہماری منگنی ہے' وہ بھی شفق کے ساتھ' مذاق تو نہیں ہمارا بس چلتا تو!''

سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ خاصا جچ رہا تھا مگر اس کی باتیں شفق کو ابھی سے پچھتاوے کے راستے پر ڈال رہی تھیں شیریں اس سے خفا تھیں مگر منگنی میں شرکت بھی ضروری تھی اس کی منگنی پر حیدر کے ضبط کے بند ٹوٹ کر بہہ گئے اور یاسر کا شانہ تر کرتے چلے گئے وہ خود بھی بہت دکھی ہو رہا تھا۔

''کم آن حیدر کسی ایک کے زندگی سے چلے جانے سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔''

''اس ایک کے چلے جانے سے زندگی باقی بھی تو نہیں رہتی یاسر' اس ایک کے چلے جانے سے زندگی وہ کھنڈر بن جاتی ہے۔جہاں سناٹے گونجتے ہیں اپنی آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔یار یاسر اسے مجھ سے اسے اتنی ہی نفرت تھی یا مجھے معاف کرنا نہیں چاہتی تھی یار معافی کے بعد تو انسان بالکل۔یاد کیسے۔کیسے زندگی گزرے گی اس کے بغیر' کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا۔''

اس کے دل کا درد لفظوں میں ڈھل رہا تھا یاسر اسے سمجھاتا رہا۔

''اس نے اس لئے ایسا کیا ہے دوست کہ وہ ناسمجھ ہے سود و زیاں کا مطلب نہیں سمجھتی

اور جب اسے یہ بات سمجھ میں آئے گی تو وہ بہت اکیلی بہت تنہا ہو گئی تب پچھتاوے کی گرد کے سوا اس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہو گا ابھی تمہارا زخم تازہ ہے اور تازہ زخم سے ٹیسیں بھی بہت جان لیوا نکلتی ہیں وقت کا مرہم جب اس زخم کو بھر دیتا ہے تو درد کا احساس باقی ہوتا ہے نشان مٹ جاتے ہیں۔''

''نہیں یاسر دل کے گہرے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔کبھی نہیں بھرتے۔''......ابھی تو دل سے اٹھنے والی ٹیس یہ بھی کہہ رہی تھی کہ درد کا یہ جہاں آباد بھی رہے گا۔

ابرابر بہت مادہ سوچ کا مالک انسان تھا کاروباری آدمی تھا زندگی کو بھی کاروبار کی نظر سے دیکھتا تھا محبت جیسے جذبہ کو مانتا ضرور تھا مگر اسے بھی وہ فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا اور شفق بھی پسند سے زیادہ اس کا کاروباری فائدہ تھا شفق مِل اونر کی بیٹی تھی اس لیے تو وہ اس کے پیچھے پڑا تھا اور شفق کو ایسے سطحی انسان کب گوارا ہوتے تھے پھر یہ حیدر سے انتقام تھا یا خود کو سزا تھی کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود ابرار کی ہونے جارہی تھی۔ ابرار بہت خوش تھا منگنی کے بعد وہ زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتا اس کی ناپسندیدگی کے باوجود۔ اسے شادی کی بھی بہت جلدی تھی اس روز پارک میں اس کے ساتھ واک کرتے ہوئے وہ مسلسل اسے شادی کے لیے کہہ رہا تھا وہ چڑ گئی۔

"ذرا آہستہ چلو ابرار تم بہت تیز چلتے ہو ساتھ چلنا چاہتے ہو تو ہم قدم ہو کر چلو۔"

اس کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے وہ ہانپنے لگی تھی وہ گھاس پر بیٹھ گئی تو وہ بھی اس کے قریب بیٹھ گیا ہاں میں بھی تو یہ ہی تم سے کہتا ہوں ساتھ چلنے کے لیے ہم قدم ہونا ضروری ہے دیکھو وقت بھی ان کا ساتھ دیتا ہے جو اس کے ساتھ چلتے ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں وقت ان کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کچلے ہوئے لوگ دوبارہ نہیں اٹھ سکتے اس لیے اب تمہیں بھی کچھ ہوشیار ہونا پڑے گا۔"

اور پھر باتوں باتوں میں وہ اصل مقصد پر آگیا وہ شادی سے پہلے شفق کی جائیداد کا حصہ دار بننا چاہتا تھا اس کے مطالبے پر شفق سلگ اٹھی اس نے صرف حیدر کی چڑ میں قبول کیا تھا ورنہ وہ اس کی خوشی یا مجبوری نہیں تھا کہ وہ سب کچھ برداشت کرتی اس نے صاف انکار کر دیا کہ ساری جائیداد اس کی بھائیوں کی ہے وہ ان سے کوئی مطالبہ نہیں کرے گی ابرار بھنا گیا تھا اس کا اٹل فیصلہ سن کر جس لالچ میں اس نے حامی بھری تھی وہ بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غصے

میں گاڑی ڈرائیو کرتا رہا اس نے تو نجانے کیا کچھ سوچ رکھا تھا اپنے کاروباری حریفوں کو نجانے کیا تڑیاں لگا رکھی تھیں کیا شرطیں باندھ رکھی تھیں جواب پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھی اسے دوستوں کے تمسخرانہ قہقہے سنائی دینے لگے اس کی سوچیں نجانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں خالی نظریں دوڑ رہی تھیں دھیان کہیں اور تھا نتیجتاً ایک زوردار دھماکہ ہوا گاڑی کسی بڑی گاڑی سے ٹکرا چکی تھی خود تو اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں مگر شفق بری طرح زخمی ہوئی تھی خاص طور پر اس کی بائیں ٹانگ میں بہت خطرناک فریکچر ہو گیا تھا اور ڈاکٹرز کے مطابق وہ کچھ عرصہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ کچھ عرصے کے لیے ہی سہی وہ معذور ہو گئی تھی حیدر اس کی حالت پر شدت سے رویا تھا مگر اس کے سامنے نہیں گیا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ ہر آہٹ پر شفق اسی آس پر دیکھتی کہ شاید وہ ستم گر ہو مگر کوئی آہٹ بھی اس کے آنے کی نوید لے کر نہ آتی تو وہ دل میں ٹیسیں دبا کر رہ جاتی انسان کی جسمانی معذوری صرف اس کی ذات کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے مگر سوچ کی طرف کی معذوری ایک دل ایک گھر ایک معاشرے کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے ابرار بھی ایسا ہی بیمار اور معذور سوچ کا شخص ثابت ہوا تھا شفق جائیداد میں حصہ لینے سے پہلے ہی انکار کر چکی تھی اور اب تو وہ کچھ عرصے کے لیے معذور ہو گئی تھی سگا ماموں زاد ہونے کے باوجود اس نے منگنی توڑ دی تھی چونکہ گھر کا لڑکا اور لڑکی تھے آپس میں بہن بھائی کے اختلافات ہو گئے بہت حالات خراب ہو گئے تھے ہر کوئی آ۔ آ کے شفق سے ہمدردی کر رہا تھا مگر سوائے شیریں کے وہ کسی کے سامنے یہ اعتراف نہ کر سکی کہ وہ غلط تھی اس نے غلط فیصلہ کیا تھا کوئی بڑا بول بولا تھا جس کی سزا اسے ملی تھی۔

"آئی ایم سوری خالہ جانی ویری سوری۔" وہ شیریں سے لپٹ کر بری طرح رو رہی تھی۔

"اچھا اب اس قدر ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے خود ہی تمہیں آزاد کر دیا ورنہ اس کم ظرف کے ساتھ زندگی گزارنا پڑتی۔"

"اللہ تعالیٰ نہ کرے خالہ جانی میں آج اعتراف کرتی ہوں کہ میں غلط تھی اور میں بہت پچھتائی ہوں اس فیصلے پر اور اللہ تعالیٰ سے بے شمار دعائیں کی تھیں کہ یہ منگنی ختم ہو جائے مگر انسلٹ کی وجہ سے میں نبھا رہی تھی خدا کا شکر ہے اس حادثے کے ذریعے میری جان چھڑا دی۔"

جب سے منگنی ختم ہوئی تھی وہ بہت خوش اور فریش تھی اب جو نام وہ سننا چاہتی تھی وہ حیدر کا تھا مگر حیرت تھی کہ شیریں تک نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ حیدر بھی مرد ہے اسے بھی ایک چلتی پھرتی مکمل عورت چاہیے اس وقت وہ اپنی عارضی چھڑی کے سہارے کھڑی تھی کہ ٹھوکر سے چھڑی کھسک گئی قریب تھا کہ وہ کسی طرح جھک کر چھڑی اٹھاتی کسی نے چھڑی کی بجائے اپنا ہاتھ پیش کر دیا تو خوشی اور حیرت سے اس کی آنکھیں روشن ہو

گئیں ہاتھ والا حیدر تھا۔ یک بارگی دل خوشی سے دھڑ کا پھر ندامت سے بجھ گیا۔

''آپ۔ آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔'' چہرے پر بے بسی آواز میں ندامت حیدر نے صاف محسوس کر لی۔ ''تمہیں دیکھ کر تمہاری حالت پر قہقہے لگانے آیا ہوں۔ ہا۔ ہا۔ ہا'' حیدر شوخی سے ہنسنے لگا وہ شرمندہ ہوگئی۔

''دیکھو شفق سفر چھوٹا ہو یا بڑا ہمسفر ہو تو بہت خوشگوار گزرتا ہے۔ زندگی کے سفر میں میری ہمسفر بنوں گی۔ ہاں۔'' ...... حیدر نے ہاتھ پھیلایا تو وہ شدت سے رو دی۔

''حیدر۔ میں ۔ میں اب آپ کے قابل نہیں میں نامکمل ہوں معذور ہوں۔'' ...... وہ ندامت سے سسکتی رہی۔

''مکمل تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے شفق ہم سب ادھورے اور نامکمل ہیں تمہاری ٹانگ معذور ہے ناں نہ میری سوچ معذور ہے اور نہ میری محبت معذور ہے مجھے نہ تم سے کل شکوہ تھا اور نہ اب ہے ساری باتیں بھول کر میری محبت کی پناہ میں آجاؤ۔ قسم سے بہت محبت بہت احترام ہے اس دیارِ دل میں تمہارا اب بولو بنوں گی ناں میری ہمسفر۔''

''جی۔'' ......

وہ اس کی گہری نظروں سے شرما کر بولی تو وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

شبِ غم تاریک سہی طویل سہی لیکن
صبحِ امید طلوع ہوتی ہے شمس و قمر کی مانند